طارنوش
قت پر حیران و پریشان رہنے والا "طارنوش"
ایک حفاظتی خوشبو حصار میں لئے رہتی تھی۔
1
عیم نوید
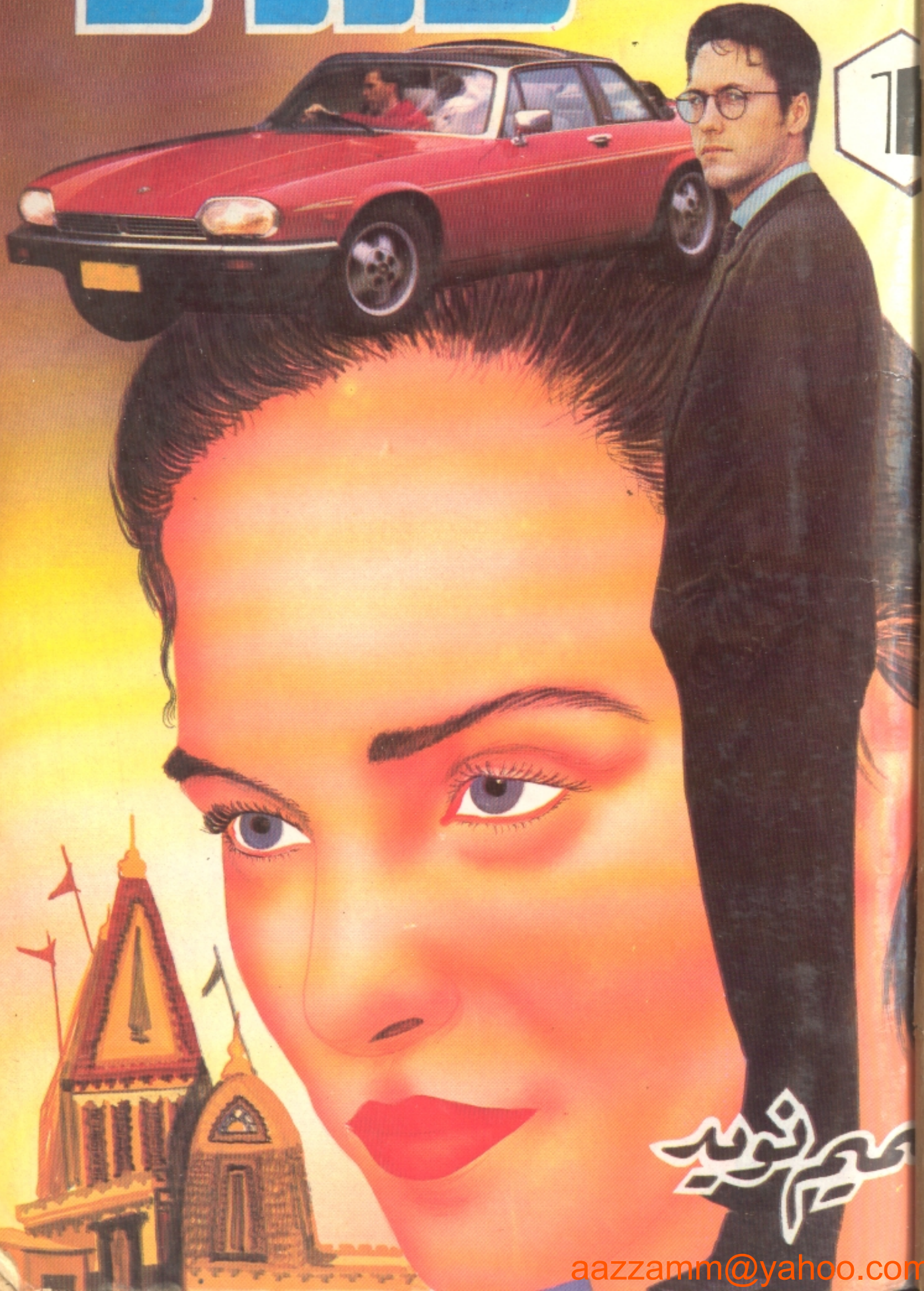
ایک پراسرار وجود کی تہلکہ خیز سرگزشت
ایک بے مثال خودنوشت

گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری
11- عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور
فون:7248599-7229762
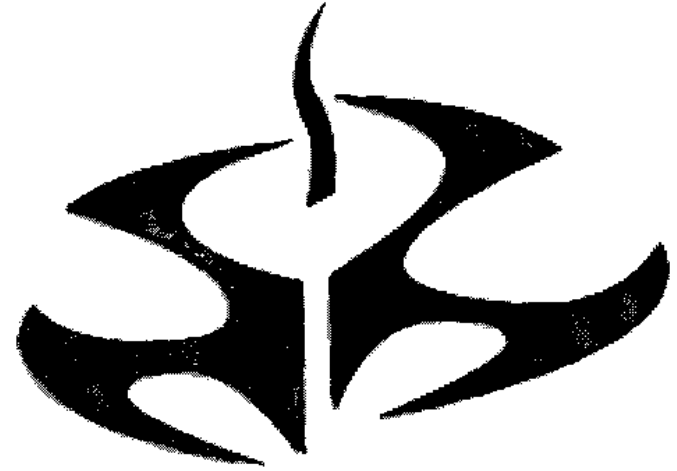
Azam & Ali

aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

11۔ عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور فون: 7248599-7229762

پیش لفظ

ہم نے اب تک متعدد پراسرار سلسلہ وار ناول لکھے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی اور اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہے کہ پڑھنے والوں نے ہمیں پسند کیا اور پذیرائی ملی۔

اس ضمن میں لکھے جانے والے دیگر ناولوں سے یہ ناول ذرا مختصر ہے۔

ہم اپنے وطن عزیز کی پچاسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ اس نسبت سے یہ ناول خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ناول کا پس منظر تحریک آزادی ہے۔ انگریزوں نے ہمیں اپنا غلام بنائے رکھنے کے لئے کیا کیا سازشیں کیں اور آزادی کے متوالوں نے ان کا توڑ کس طرح کیا' جگہ جگہ اس ناول میں آپ کو اس کے تاریخی شواہد ملیں گے۔ کہانی کی بنت میں خاص طور پر یہ کوشش کی گئی ہے کہ دلچسپی کا عنصر کہیں کم نہ ہو' پراسرار ہونے کے باوجود بھی تحریر بے مقصد نہ رہے۔

کتابی صورت میں یہ ناول پہلی بار اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یکجا طور پر اس کا مطالعہ آپ کے ذوق اور معیار پر پورا اترے گا۔

اس مختصر مگر بھرپور ناول کے بارے میں مزید کچھ لکھ کر ہم آپ کے تجسس کو کم کرنا نہیں چاہتے۔ اگر ہماری یہ کاوش آپ کو سکون اور معیاری تفریح فراہم کر سکے تو اسے ہم اپنی کامیابی تصور کریں گے۔

طالب دعا

شمیم نوید
کراچی

اس وقت میری عمر مشکل سے بارہ سال ہو گی جب پہلی بار مجھے وہ پُراسرار سرگوشی سنائی دی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اتوار کا دن تھا۔ میں ممی اور ڈیڈی کے ساتھ گرجا جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ممی نے مجھ سے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کرنے کے لیے کہا تھا۔ کپڑے بدل کر میں دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے کسی نادیدہ وجود نے میرا راستہ روک لیا ہو۔ میں آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹک کر رک گیا اور مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ اسی لمحے ایک نسوانی سرگوشی میرے کانوں میں گونجی "تمہیں گرجا نہیں جانا!۔ تم گرجا نہیں جاؤ گے!" سرگوشی میں حکم تھا۔

میں اسی تحکمیہ سرگوشی کے زیر اثر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا، مگر یہ میرا اختیاری فعل نہیں تھا۔ میں بڑبڑا رہا تھا۔ "میں گرجا نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔"

سرگوشی کا سحر ٹوٹا تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے سارے وجود میں دوڑ گئی۔ سرگوشی کرنے والی آواز کا سایہ جیسے ابھی تک میرے اوپر محیط تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ میں کمرے میں اکیلا تھا اور میرا جسم نمایاں طور پر کانپ رہا تھا۔

"بیٹا! گرجا جانے کو دیر ہو رہی ہے۔" ممی کی آواز میں نے سنی اور میرا خوف کم ہونے لگا۔ وہ مجھ سے جلدی آنے کا کہہ رہی تھیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کس طرح خود کو سنبھالا اور کانپتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ کمرے سے باہر آنے تک میرا خوف خاصا کم ہو چکا تھا۔

"ارے! تمہارا چہرہ کیوں پیلا پڑ رہا ہے؟" مجھ پر نظر پڑتے ہی ممی حیرت سے بولیں۔ "کیا ہوا تمہیں؟"

"کک۔ کچھ۔ نہیں۔ کچھ نہیں ممی!" میں مشکل سے کہہ سکا۔

"لگتا ہے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" ڈیڈی میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔

"مگر یہ پچھلے اتوار کو بھی ہمارے ساتھ گرجا نہیں گیا تھا۔ اب یہ بڑا ہو گیا ہے اور اسے۔"

"نہیں!" ڈیڈی نے ممی کی بات کاٹ دی۔

ڈیڈی شاید کچھ اور بھی کہنے والے تھے کہ میں ہمت کر کے بول اٹھا۔ "آپ چلی جائیں ممی!۔ میں گھر۔ گھر ہی میں رہوں گا۔"

گھر میں رہنے کا مطلب گرجا جانے سے انکار ہی تھا۔ اپنے انکار پر میں نے ڈیڈی کے چہرے کا رنگ جاتے کہیں

تے ہوئے دیکھا۔ ان کے چہرے پر غصے کے بجائے شرمندگی ے سے آثار تھے۔ انہوں نے مجھ پر ایک نظر ڈالی' پھر اپنے لے میں پڑی ہوئی سونے کی چھوٹی سی صلیب پر ہاتھ پھیرا اور ی کو مخاطب کیا۔ "اسے گرجا چلنے پر مجبور نہ کرو۔ یہ بات یک نہیں ہے۔"

"کیوں ٹھیک نہیں ہے؟" ممی تیز آواز میں بولیں۔

"اس وقت یہ بحث نہ کرو' ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" ڈی ناگواری سے کہنے لگے۔ "کیوں ٹھیک نہیں؟ تمہارے ں سوال کا جواب میں دے دوں گا مگر اس وقت نہیں۔ آؤ و!" انہوں نے یہ کہتے ہوئے ممی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ممی نے آواز دے کر ملازم کو بلایا اور میرا خیال رکھنے کے لیے اس سے کہہ کر ڈیڈی کے ساتھ چلی گئیں۔

اس روز کے بعد معلوم نہیں ڈیڈی نے ممی کو کیا سمجھایا کہ انہوں نے پھر کبھی مجھ سے گرجا چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے بائبل پڑھنے کی تاکید کرنا بھی چھوڑ دی۔ میرے لیے ان کے رویے میں یہ تبدیلی خاصی حیران کن تھی۔ بہرحال مجھے ایک بوجھ سے نجات مل گئی تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ مجھے ممی اور ڈیڈی کے ساتھ گرجا جانا بوجھ سا محسوس ہوتا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ اس وقت میں نہیں سمجھ سکا۔ اس وقت کیا' برسوں یہ راز میرے لیے راز ہی رہا۔

اب تک مجھے گھر پر ہی تعلیم دی جاتی رہی تھی۔ میرے ٹیوٹرز میری طرف سے بہت مطمئن تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے براہ راست چھٹی کلاس میں داخلہ مل سکتا ہے۔ میری تعلیمی اہلیت کے بارے میں میرے ٹیوٹرز کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ مجھے چھٹی کلاس میں داخلہ مل گیا۔ ڈیڈی نے مجھے ایک مشنری اسکول میں داخل کرایا تھا۔ جلد ہی میرا شمار اسکول کے ذہین طلبہ میں ہونے لگا۔ کتابیں تو مجھے پہلے بھی عزیز تھیں اور اب بھی میں محنت سے پڑھ رہا تھا' مگر اسکول کا ماحول قطعی پسند نہیں تھا۔ دوسری بات جو میرے لیے الجھن کا سبب تھی' میرا نام تھا۔ اسکول میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے سے پہلے مجھے یہ صورت حال پیش نہیں آئی تھی۔ جو پہلی مرتبہ میرا نام سنتا' اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر ابھرتا۔ اسکول میں داخل ہونے کے بعد پہلے ہی دن میرے کلاس ٹیچر نے بھی دو مرتبہ میرا نام پوچھا تھا۔ جیسے انہوں نے جو کچھ سنا ہے' اس کی تصدیق چاہتے ہوں۔ اب خود مجھے بھی اپنا نام اجنبی سا [illegible]

کسی کا نام بھی مجھ سے ملتا جلتا نہیں تھا۔ اس الجھن سے تنگ آکر میں نے ایک دن ممی سے پوچھ ہی لیا۔ "میرا یہ نام آپ

نے رکھا تھا یا ڈیڈی نے؟ کس نے رکھا تھا میرا نام؟"

یہ کوئی ایسا سوال نہیں تھا کہ ممی ایک دم چونک اٹھتیں مگر ہوا یہی تھا۔ "تم۔ تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟" انہوں نے بھی سے سوال کر دیا۔

"اس لیے پوچھ رہا ہوں ممی کہ میرا نام سن کر لوگ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں' مجھ سے اس کا مطلب بھی پوچھتے ہیں' میں کیا جواب دوں۔ بتائیں؟۔ کیا مطلب ہے اس نام کا؟۔ اور ایسا نام کیوں رکھا ہے آپ نے؟"

"میں نے نہیں رکھا یہ نام اور نہ مجھے اس کا مطلب معلوم ہے۔" ممی کے چہرے سے خلاف توقع گھبراہٹ سی ظاہر ہونے لگی۔ اسی وقت ڈیڈی آگئے اور انہوں نے مجھے پیار کیا۔ ڈیڈی کی آمد سے ممی کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ انہوں نے اپنی بلا ڈیڈی کے سر ڈال دی اور بولیں۔ "یہ کچھ پوچھ رہا ہے۔"

"کیا بات ہے بیٹے؟ کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر محبت سے کہا۔

پھر جب میں نے اپنا سوال دہرایا تو ان کی کیفیت بھی ممی سے مختلف نہیں تھی۔ وہ بھی چونک اٹھے تھے۔

چند لمحے ڈیڈی خاموش رہے' پھر کہنے لگے۔ "لوگوں کی باتوں کا اثر نہ لیا کرو بیٹے! لوگ تو ہر بات میں کیڑے نکالنے کے عادی ہوتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ تمہارا نام منفرد ہے اور یہ نام۔ میرے ایک پادری دوست نے رکھا تھا۔ اس کا مطلب کیا ہے؟۔ میں نہیں پوچھ سکا۔ ویسے کوئی اچھا ہی مطلب ہوگا۔ تم۔ تم ایسی فضول باتوں میں مغز نہ کھپایا کرو۔ ٹھیک ہے نا بیٹے!" انہوں نے پیار سے میرا رخسار تھپتھپایا۔

"جی بہتر ہے ڈیڈی!" کہنے کو تو یہ بات کہہ دی تھی مگر ڈیڈی کی بات سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ جانے کیوں مجھے ڈیڈی کی بات کا یقین نہیں آیا تھا کہ واقعی میرا عجیب و غریب [illegible] ان کے کسی پادری دوست نے رکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا

کہ مجھے ڈیڈی پر جھوٹ بولنے کا شبہ ہوا تھا۔

رفتہ رفتہ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جو ممی اور ڈیڈی مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ یہ احساس اس وقت اور شدید ہوگیا جب ڈیڈی کا ایک دوست کلکتے سے دہلی آیا۔ وہ ہمارے ہی گھر ٹھہرا تھا۔ اس کی نظر جب پہلی بار مجھ پر پڑی تو حیرت سے بولا "ارے یہ اتنا بڑا ہو گیا!"

"ہاں۔" ڈیڈی مسکرا کر بولے۔ "پہلے جب تم نے اسے دیکھا تھا تو یہ صرف دو سال کا تھا۔"

ڈیڈی اور ان کا وہ پرانا دوست شام کی چائے پی رہے تھے۔ میں جب کچھ دیر بعد اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا تو ڈیڈی کے دوست نے دھیمی آواز میں ڈیڈی سے کہا۔ "تیسوزا! کم سے کم اس کا نام تو بدل دیا ہوتا!"

"آہستہ بولو!" ڈیڈی کی سرگوشی ابھری۔ "کہیں وہ نہ سن لے! وہ بہت حساس لڑکا ہے اور نام کے معاملے میں تو بہت ہی زیادہ حساس ہے۔"

میرا جی چاہا کہ ان دونوں کی باتیں چھپ کر سنوں' مگر وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی مجبوراً مجھے اپنے کمرے میں جانا پڑا جہاں ان دونوں کی آوازیں پہنچنا ممکن نہیں تھیں۔

ڈیڈی کا وہ دوست ایک ہفتے ہمارے یہاں رہا۔ اس دوران میں ایک اور ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ وہ ممی سے باتیں کر رہا تھا اور میں ذرا فاصلے پر تھا۔ مجھے قریب آتے دیکھ کر وہ ایک دم خاموش ہو گیا تھا' مگر میں نے اس کا جملہ سن ہی لیا تھا۔ اس نے ممی سے کہا تھا "تم لوگ کیسے عیسائی ہو کہ اسے اپنے ساتھ گرجا بھی نہیں لے جاتے! اس طرح تو ایک دن یہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

جواباً ممی بولی تھیں۔ "تم جانتے ہو کہ ہم بے۔ ہم۔ ہمارے لیے وہی سب کچھ ہے اور۔ اور ہم اسے خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہر حال میں خوش!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے ممی کی آواز قدرے بھرا گئی تھی۔

وہ مزید کچھ کہنے والا تھا مگر اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور اس کا منہ کچھ کہنے کے لیے کھل کر پھر بند ہو گیا۔ میں دوپہر کا کھانا کھانے ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھا۔ پھر ممی اور وہ شخص بھی وہیں آگیا۔ ملازمہ میز پر کھانا لگانے لگی۔ ڈیڈی اس وقت گھر پر نہیں تھے۔

ایک ہفتے ہمارے گھر رہ کر وہ شخص چلا گیا' مگر ذہنی طور پر مجھے پریشان کر گیا۔ آخر اسے اس بات سے کیا دلچسپی تھی کہ میں گرجا کیوں نہیں جاتا یا ڈیڈی نے میرا نام کیوں نہیں بدلا؟ نام بدلنے سے اس کا کیا مطلب تھا؟ یہ اور ایسے بہت سے سوال میرے ذہن میں گردش کرتے رہتے اور میں بے چین ہو جاتا۔ میں کس سے ان سوالوں کے جواب پوچھتا!

میٹرک تک پہنچتے پہنچتے میں نے اپنے اندر ایک واضح تبدیلی محسوس کی۔ ہرچند کہ میں ایک مشنری اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور اسکول میں یہ میرا آخری سال تھا' مگر اسکول کے مذہبی ماحول اور مذہبی تعلیم نے مجھ پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت تحریک اپنے عروج پر تھی۔ حکمراں عیسائی تھے اور میری پرورش بھی ایک عیسائی گھرانے ہی میں ہوئی تھی لیکن میرا جھکاؤ ان کی طرف نہیں تھا' میری ہمدردیاں عیسائیوں کے ساتھ نہیں تھیں۔ بہ ظاہر مجھے اس کا ایک ہی سبب نظر آتا تھا۔ میں نے گزشتہ ایک سال کے دوران میں کئی سیاسی جلسوں میں شرکت کی تھی اور یہ جلسے حکمراں طبقے کے خلاف تھے۔

میں سیاسی جلسوں میں شرکت کرتا ہوں' یہ بات ڈیڈی سے چھپی نہ رہ سکی۔ میں آخر کب تک رات کو دیر سے گھر آنے کے لیے بہانے بناتا! میں اس روز ایک ایسے جلسے میں شرکت کر کے آرہا تھا جس میں مولانا محمد علی جوہر نے بڑی پُرجوش تقریر کی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو دلائل دیے تھے اور جو حقائق بیان کیے تھے' ان کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔

ڈیڈی اس وقت تک میرے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ میں ان کے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے بچ کر گزر رہا تھا کہ انہوں نے مجھے آواز دے کر بلا لیا۔ میں اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ان کے کمرے میں چلا گیا۔

"جی ڈیڈی!" میں بولا اور نظریں جھکا لیں۔ میری حالت اس وقت کسی ایسے چور کی سی تھی جو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔

"کہاں سے آرہے ہو اس وقت؟" ان کی آواز میں خلاف توقع قدرے سختی تھی۔

"ولیم کے گھر۔"

"جھوٹ مت بولو!" انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ "وہ تو خود یہاں آیا تھا۔ آج تم اسکول بھی نہیں گئے!"

ولیم میرا کلاس فیلو تھا۔ کبھی کبھار ہم دونوں مل کر اسٹڈی کر لیتے تھے۔ کبھی وہ میرے گھر آجاتا اور کبھی میں اس کے گھر چلا جاتا۔ ڈیڈی بھی اسے جانتے تھے۔ میں نے اسی لیے اس کے گھر سے آنے کا بہانہ کیا۔ اسی غرض سے میں کتابیں بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا کہ میرا جھوٹ نہ کھلے

مجھے کیا خبر تھی کہ وہ کمبخت آج خود میرے گھر آ کر بھانڈا پھوڑ دے گا۔ یہ اطلاع بھی اسی سے ڈیڈی کو مل سکتی تھی کہ آج میں اسکول ہی نہیں پہنچا۔ دراصل دن کے وقت آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک جلسہ تھا۔ اسکول جانے کے بجائے میں اس جلسے میں چلا گیا تھا۔

"بولو خاموش کیوں ہو؟ جواب دو میری بات کا۔ کہاں سے آ رہے ہو؟ اور آج اسکول کیوں نہیں گئے؟" ڈیڈی نے مجھ پر سوالات کی بوچھار کر دی۔

"ان سے پوچھ لو' بتا دے گا۔ اس میں اتنے ناراض ہونے کی کیا بات ہے!" ممی بول اٹھیں اور انہوں نے مجھے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"تم اس کی حمایت مت لو! نرمی ہی نے تو اسے بگاڑ دیا ہے۔ تمہیں کچھ نہیں معلوم کہ یہ کیا کرتا پھر رہا ہے! اگر بتا دوں تو حیران رہ جاؤ گی۔ یہ ۔۔۔ یہ تمہارا لاڈلا حکومت کے خلاف ہونے والے سیاسی جلسوں میں شریک ہوتا ہے۔"

"نہیں!" ممی بے یقینی سے بولیں۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ کسی نے غلط اطلاع دی ہو گی۔"

"مجھے غلط اطلاع ملی ہو گی! تم تو یہ نہ کہو' تمہیں تو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا تعلق حکومت کے کس محکمے سے ہے۔ مجھے تو غلط خبر مل ہی نہیں سکتی۔"

ڈیڈی کی یہ بات سن کر میں چونک اٹھا۔ مجھے صرف اتنا علم تھا کہ ڈیڈی ایک بڑے سرکاری افسر ہیں' لیکن ان کی ذمے داریاں کیا ہیں اور وہ کس محکمے سے وابستہ ہیں' میں نے یہ کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ پھر ڈیڈی نے مزید جو کچھ کہا' اس سے میں بڑی حد تک یہ بات سمجھ گیا کہ حکومت کے کس محکمے سے ان کا تعلق ہو سکتا ہے! یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی کہ آج میرا کلاس فیلو ولیم اگر میرے گھر نہ بھی آتا تو بھی ڈیڈی کو میری آج کی مصروفیت کا علم ہو جاتا۔

"تمہارے لاڈلے پر مجھے بہت دن سے شک تھا۔" ڈیڈی نے کہا۔ "میں نے اس کی کتابوں کے درمیان جس روز حکومت دشمن اخبار "ہمدرد" دیکھا تھا اسی دن میرا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ یہ اخبار حکومت کے ایک باغی لیڈر کا ہے اور اس لیڈر پر بہت جلد بغاوت کا مقدمہ۔۔۔" ڈیڈی کچھ کہتے کہتے رک گئے اور میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ ڈیڈی جس باغی لیڈر کا ذکر کرتے کرتے رک گئے تھے' یہ وہی لیڈر تھا جس کی پُراثر اور سحر انگیز شخصیت نے مجھے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ آج رات میں اسی لیڈر کی تو تقریر سن کر آ رہا تھا۔ ہمدرد اخبار اسی لیڈر محمد علی جوہر کا تھا جس کی ایک ایک بات میرے دل پر نقش ہو گئی تھی۔ ذرا توقف کے بعد ڈیڈی پھر بولنے لگے۔ ممی تصویر حیرت بنی ہوئی ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ ڈیڈی کہہ رہے تھے۔ "اس کے لچھن دیکھ کر میں نے اپنے محکمے کے لوگوں سے اس کی نگرانی شروع کرا دی۔ ان کی تفصیلی رپورٹ مجھے آج ہی ملی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو نوجوان آیا تھا' اس کا تعلق بھی میرے محکمے سے ہے۔ اس کی رپورٹ کے مطابق اس وقت بھی یہ اسی باغی لیڈر کے جلسے میں سے شرکت کر کے آ رہا ہے۔"

ممی کے لیے یقیناً یہ انکشافات قطعی غیر متوقع تھے۔ ان کے چہرے سے حیرانی اور ملال دونوں ہی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اب جب کہ کوئی بات راز نہیں رہی تھی' میرا خاموش رہنا بھی بے سود تھا۔ میں نے سوچا کہ ڈیڈی چاہے جو کچھ سوچیں اور جو چاہے کہیں' میں اپنے دل کی بات ضرور کہوں گا۔

"ڈیڈی!" میں آہستہ سے بولا۔ "آپ جس شخص کو باغی کہہ رہے ہیں' وہ باغی نہیں ہے بلکہ ہندوستانی قوم کا نجات دہندہ ہے۔ کبھی آپ ۔۔۔ آپ بھی اس کی تقریر سنیں گے تو اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔ وہ دلائل اور ثبوت کے ساتھ بات کرتا ہے۔ وہ ۔۔۔ وہ سچا ہے ڈیڈی! ہم ۔۔۔ ہم بھی تو ہندوستانی ہیں! وہ ہمارے ہی لیے تو جدوجہد کر رہا ہے۔ یہ ملک ہمارا ہے انگریزوں کا نہیں اور ۔۔۔ اور اگر ہم انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ۔۔۔ تو یہ ہمارا حق ہے!" میں نے رک رک کر اور بڑی ہمت کر کے وہ باتیں کر دیں' جو میرے دل میں تھیں۔

اس دوران میں ڈیڈی مجھے یوں دیکھتے رہے جیسے میں ان کے لیے بالکل اجنبی ہوں۔ وہ نہیں ہوں' جس کی انہوں نے پرورش کی ہے۔ ان کے چہرے سے انتہائی دکھ کا اظہار ہونے لگا۔ پھر جب وہ بولے تو ان کی آواز بھاری اور بھرائی ہوئی سی تھی۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ۔۔۔ کہ تم اس حد تک آگے بڑھ چکے ہو' تم ۔۔۔ اتنے بگڑ چکے ہو! ۔۔۔ تم میری زندگی بھر کی کمائی ہو۔ میں ۔۔۔ میں تمہیں ضائع نہیں ہونے دوں گا! تمہیں نہیں معلوم میرے بچے! تم ۔۔۔ تم نہیں جانتے کہ تم جن لوگوں کے پیچھے جا رہے ہو' وہ ۔۔۔ وہ تمہیں موت کی اندھیری وادیوں کی طرف لے جائیں گے۔"

میرا خیال تھا کہ ڈیڈی میری باتیں سن کر انتہائی برہم ہو جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ ان کے جذباتی اور دکھی لہجے نے میرے دل پر بڑا اثر کیا تھا۔ میں انہیں دلگرفتہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس حد تک وہ یقیناً درست کہہ رہے تھے کہ میں جس راستے پر چل نکلا تھا وہ دار و رسن کو جاتا تھا۔ فرق صرف اتنا نظر کا تھا۔ میرے نزدیک وہ قربانی تھی اور ڈیڈی کے خیال میں موت کی اندھیری وادیاں!

ڈیڈی کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے چہرے سے انہوں نے شاید یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اندر سے پگھل رہا ہوں۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور میں خود کو مجرم تصور کر رہا تھا۔ نادانستگی میں ہی سہی' میں نے ان کا دل دکھایا تھا۔ اس احساس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

اسی وقت ڈیڈی کی آواز پھر ابھری۔ "آؤ! ۔۔۔ آؤ میرے بچے! میرے سینے سے لگ جاؤ! ۔۔۔ تم نے اب تک لاعلمی میں جو کچھ کیا' اسے میں نے معاف کیا۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ ان راہوں پر چلنے سے گریز کرو گے۔ یہ راہیں ہمیں جدا کر دیں گی۔ اور سنو! تم نے جو کچھ کہا' ایک ہندوستانی کی حیثیت سے میں بھی اس سے متفق ہوں مگر ۔۔۔ مگر میرے اندر اتنا حوصلہ نہیں کہ ۔۔۔ کہ ایک یقینی موت کو قبول کر لوں اور ۔۔۔ اور اس طرح تمہارے مستقبل کو بھی تاریک کر دوں۔ میں ۔۔۔ اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ میرے پیروں میں مجبوریوں کی زنجیر پڑی ہے۔"

ڈیڈی کے آخری الفاظ ختم ہونے تک میں ممی کے پاس سے اٹھا اور ڈیڈی کے سینے سے لگ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور ڈیڈی کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو بھی میرے شانے بھگو رہے تھے۔ ممی بھی رونے لگیں۔

آنسوؤں میں دلوں کا سارا غبار بہہ گیا۔ اس روز مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ ممی اور ڈیڈی سے میں کتنی محبت کرتا ہوں۔ انہوں نے میرے پیروں میں اپنی محبت کی زنجیر ڈال دی تھی اور یہ زنجیر میرے لیے سرمایۂ حیات تھی۔ میں نے انہی جذبات کے زیر اثر ڈیڈی اور ممی سے وعدہ کر لیا کہ اب حکومت کے خلاف منعقد ہونے والے کسی جلسے میں شرکت نہیں کروں گا۔ ڈیڈی نے یہ اعتراف کر کے کہ وہ بھی میرے خیالات سے متفق ہیں' میرے جذبۂ بغاوت کو میٹھی نیند سلا دیا تھا۔

یہ اسی رات کا واقعہ ہے کہ طویل عرصے کے بعد ایک بار پھر مجھے وہی پُراسرار سرگوشی سنائی دی۔ وہی نسوانی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی جو برسوں پہلے میں نے سنی تھی اور ڈر گیا تھا۔ سرگوشیوں میں مجھ سے کہا جا رہا تھا۔ "تم نسلاً عیسائی نہیں ہو۔ تمہیں اسی لیے برسوں پہلے گرجا نہ جانے کی تاکید کی گئی تھی۔ تم کون ہو؟ رفتہ رفتہ تمہیں اس سوال کا جواب خود بہ خود ملتا جائے گا۔ ابھی سب کچھ جان لینے کا وقت نہیں آیا۔ تم اسے برداشت نہیں کر پاؤ گے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم پر خود تمہارے وجود کے اسرار کھلتے جائیں گے۔"

جس وقت مجھے یہ سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں' ایک لطیف سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی خوشبو میں نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ممکن ہے کہ جب بارہ سال کی عمر میں پہلی بار مجھے یہ پُراسرار سرگوشی سنائی دی تھی' اس وقت بھی یہ مخصوص خوشبو میرے کمرے میں پھیلی ہو اور میں اسے خوف کے سبب محسوس نہ کر سکا ہوں۔ میں اس خوشبو کی کوئی وضاحت نہیں کر سکتا' ہاں یہ ضرور علم ہے کہ اس نے میرے احساس پر ایک خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ سرگوشیاں ختم ہوتے ہی وہ خوشبو معدوم ہو گئی تھی۔ اس بار بھی خود سے مجھے خوف تو اب بھی آیا تھا مگر اتنا نہیں جتنا پہلی بار محسوس ہوا تھا۔ شاید اس کا سبب عمر کا فرق تھا اور غالباً وہ خیالات بھی تھے جو سرگوشیاں سننے کے بعد خود بہ خود میرے ذہن میں پیدا ہونے لگے تھے۔ ان خیالات کا مرکز وہ ایک سوال تھا جو بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اگر میں نسلاً عیسائی نہیں ہوں تو پھر کون ہوں؟ میرے لیے یہ بڑی عجیب اور ناقابل یقین سی بات تھی۔ ڈیڈی عیسائی تھے' ممی عیسائی تھیں' پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں نسلاً عیسائی نہیں تھا؟ تمام رات میں سوالوں کے گرداب میں ڈوبتا ابھرتا رہا اور پھر جب میرا ذہن سوچتے سوچتے تھک گیا تو میری آنکھ لگ گئی۔ شاید اس وقت صبح ہونے والی تھی۔

دوسرے دن میں اسکول نہیں جا سکا۔ ملازمہ نے مجھے وقت پر جگایا بھی مگر میں یہ کہہ کر دوبارہ سو گیا کہ میں آج اسکول نہیں جاؤں گا۔ ممی سے کہہ دو' میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور میں سونا چاہتا ہوں۔

دوپہر کے قریب میں سو کر اٹھا تو ممی میری طرف سے فکر مند تھیں۔ میں نے یہ کہہ کر انہیں تسلی دی کہ کوئی خاص بات نہیں' بس رات کو ذرا نیند نہیں آئی۔ دن بھر میرے ذہن میں وہی سوال گردش کرتے رہے جنہوں نے مجھے گزشتہ رات سونے نہیں دیا تھا۔ میں اس روز گھر سے نہیں نکلا۔

نسلاً عیسائی نہ ہونے کا صرف اور صرف ایک ہی مطلب تھا جسے شعوری طور پر قبول کرنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ میرے تمام تر اضطراب کی وجہ یہی تھی۔ جس سے میں مجبور ہو رہا تھا' وہ میرے لیے سوہان روح تھا' کئی ہفتے میں ذہنی دباؤ کا شکار ہو گیا۔ چند روز میں نے یہ ذہنی دباؤ برداشت کیا اس لیے کہ میرے خیالات' احتمالات ہونے والے تھے۔ میں نے اپنی توجہ پڑھائی کی طرف مبذول کر دی اور خود کو یہ
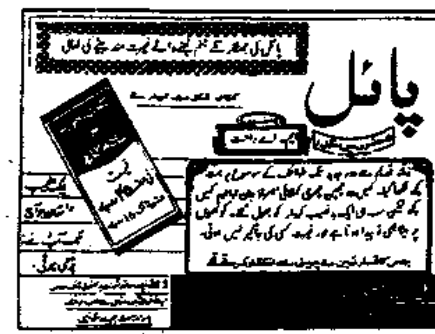
دھوکا دینے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ پُراسرار سرگوشیاں محض وہم تھیں۔ اسی دوران میں میرے احساس پر ایک اور ضرب پڑی۔ خلافت کی تحریک کے علی برادران مولانا شوکت علی' مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ساتھیوں کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر بغاوت کا مقدمہ چلائے جانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ ڈیڈی نے روا روی میں کافی دن پہلے یہ پیش گوئی کر دی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ حکومت کے اس اقدام سے واقف تھے۔ مجھے بھی قبل از وقت آئندہ پیش آنے والے اس المیے کا علم ہو گیا تھا اور میں کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ میں کم از کم یہ تو کر ہی سکتا تھا کہ کسی بھی طرح مولانا محمد علی جوہر تک یہ اطلاع پہنچا دیتا۔ انہیں پہلے سے ہوشیار کر دیتا کہ حکومت ان کے خلاف کیا قدم اٹھانے والی ہے۔ ممکن ہے اس طرح وہ گرفتاری سے بچ جاتے۔ میری یہ سوچ میٹرک کے ایک طالب علم کی سوچ تھی۔ اس وقت میرا ذہن اتنا بالغ نہیں تھا کہ سوچتا' مولانا جوہر یہ اطلاع ملنے کے باوجود بھی گرفتار ہونا پسند کرتے۔

ان دنوں ڈیڈی کی سرکاری ذمے داریاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں اور وہ دیر سے گھر آنے لگے تھے۔ انہیں میری طرف سے اطمینان تھا کہ میں اپنے امتحانات کی تیاری میں مصروف ہوں۔ میرے اندر کیا پیکار جاری ہے' وہ اس سے قطعی بے خبر تھے۔ ایک عیسائی ہونے کے ناتے' مجھے خلافت تحریک سے کیوں لگاؤ ہے؟ مسلمان رہنماؤں سے کیوں محبت ہے؟ ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل سے میرا کیا تعلق ہے؟ علی برادران کی گرفتاری پر مجھے اتنا رنج کیوں ہے؟ ان سوالوں نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔

اپنی گرفتاری سے خاصا پہلے مولانا جوہر' جامعہ ملیہ دہلی کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اسی درس گاہ میں اپنی بقیہ تعلیم حاصل کروں گا۔ جیسے تیسے ذہنی دباؤ کے باوجود میں نے میٹرک کا امتحان دیا اور حسب معمول امتیازی نمبروں سے پاس ہوا۔

ڈیڈی مجھے بقیہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن بھیجنا چاہتے تھے مگر میں نے انکار کر دیا۔ میں تو پہلے ہی سے ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ جب میں نے ڈیڈی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ چونک اٹھے۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ بے یقینی کے سے لہجے میں بولے۔ "تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب کبھی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لو گے!"

نرمی سے بولا۔

"براہ راست اگر نہیں تو بالواسطہ یہی مطلب ہے۔ وہ مخصوص نظریات رکھنے والے لوگوں کی درس گاہ ہے۔ ان نظریات کا اثر تم پر بھی پڑے گا جو میں نہیں چاہتا۔ تم ایک عیسائی ہو اور تم نے ایک مشنری اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔ تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ۔۔۔"

معلوم نہیں مجھے سمجھانے کے لیے ڈیڈی اور کیا کیا کہتے رہے۔ میں تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے تو ایک مانوس خوشبو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی اور سرگوشی کر رہی تھی "اس سے انکار کر دو کہ تم عیسائی ہو!۔ کہہ دو کہ تم عیسائی نہیں ہو!" لہجہ حسب معمول تاکیدی ہی تھا۔

میں بڑبڑانے لگا۔ "میں عیسائی نہیں ہوں۔" اور پھر میری آواز بلند ہوتی گئی۔ میں جیسے اپنے حواس میں نہیں تھا۔

"کیا ہوا تمہیں؟۔ کیا ہو گیا تمہیں میرے بچے؟۔ یہ تمہارے چہرے کا رنگ کیسے بدل گیا؟۔ تمہارا چہرہ سرخ۔۔۔ سرخ ہو رہا ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ ڈیڈی نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا ہے اور اب وہ ممی کو آوازیں دے رہے ہیں "ایلن!۔ ایلن! جلدی آؤ!۔ دیکھو اسے کیا ہو گیا ہے؟"

مجھے نہیں معلوم' اس دوران میں میرے چہرے میں کیسا تغیر رونما ہوا کہ ڈیڈی اتنے گھبرا گئے۔ کچھ دیر مجھ پر وہی کیفیت طاری رہی اور میں ایک ہی جملہ بار بار بلند آواز میں دہراتا رہا' پھر وہ خوشبو رخصت ہو گئی۔

"اسے۔۔۔ اسے اندر کمرے میں لے چلو!" میں نے ممی کی خوف زدہ آواز سنی۔

ڈیڈی مجھے سہارا دے کر آگے بڑھانے لگے تو میں بول اٹھا "میں خود چل سکتا ہوں ڈیڈی!" اب میری حالت اعتدال پر آ چکی تھی۔

ڈیڈی کے چیخنے چلانے کی وجہ سے گھر کے ملازمین بھی ...ں جمع ہو گئے تھے۔ ڈیڈی نے انہیں تاکید کی۔ "ابھی تم ...وں نے جو کچھ سنا ہے' اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا! جاؤ!۔ تم ...ں جاؤ!۔ اگر تم میں سے کسی کی ضرورت پیش آئی تو میں بلا ...ں گا۔"

ملازمین چلے گئے۔ ممی اور ڈیڈی کے ساتھ میں اس ...رے میں آ گیا جو ان دونوں کا مشترکہ بیڈ روم تھا۔ ڈیڈی ...نے مجھے اپنی مسہری پر لٹا دیا حالانکہ میں کسی قسم کی نقاہت یا ...زوری محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں صرف ڈیڈی کا دل رکھنے ...کے لیے مسہری پر نیم دراز ہو گیا۔ پھر ممی اور ڈیڈی بھی میرے ...یب ہی بیٹھ گئے تھے۔ اب تک ان دونوں کے چہروں سے ...ر مندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ممی کے چہرے پر تو خوف کے ...ثار بھی تھے۔

"تمہیں کیا ہو گیا تھا میرے بچے؟" ڈیڈی نے محبت و ...فقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تم کیا کہہ ...رہے تھے؟"

میں ذرا جھجکا اور وہی جملہ ایک بار پھر دہرا دیا جو اس ...اسرار سرگوشی کے زیر اثر بار بار کہتا رہا تھا۔

"یہ تمہیں کس نے بتایا کہ تم عیسائی نہیں ہو؟" ڈیڈی ...نے نرمی سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر تم یہ۔۔۔ یہ بات کیسے کہہ رہے ہو؟۔ کوئی وجہ تو ہو ...اس کی!"

"وجہ بھی میں نہیں جانتا' مگر اتنا جانتا ہوں کہ کوئی ...اسرار طاقت تھی جو بار بار یہی بات مجھ سے کہلوا رہی ...تھی۔" میں نے ڈیڈی کو سچ سچ بتا دیا۔

"پُراسرار طاقت!" ڈیڈی حیرت سے بولے۔

"جی۔۔۔ جی ہاں۔" میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

پھر میں نے ممی اور ڈیڈی سے کچھ نہیں چھپایا۔ انہیں ...اس پُراسرار سرگوشی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ ...دونوں حیران حیران سے میری باتیں سنتے رہے۔ اس عرصے ...میں ان دونوں نے کئی بار اشاروں سے صلیب کے نشان ...بنائے۔ وہ دونوں مجھ سے کتنی محبت کرتے تھے' اس کا مجھے ...بخوبی اندازہ تھا۔ ان کے سوا دنیا میں میرا اور تھا بھی کون! پھر ...بھلا میں ان سے کس طرح یہ باتیں چھپا لیتا۔

"یہ۔۔۔ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ جب۔۔۔ جب تم نے مجھے ...آواز دے کر بلایا تھا تو۔۔۔ تو وہ خوشبو میں نے بھی محسوس کی ...تھی۔" ممی مرتعش سی آواز میں بولیں۔

"ہاں مجھے بھی خوشبو محسوس ہوئی تھی مگر۔" ڈیڈی کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئے۔

اسی وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ایک مدت سے جو بات خواہش کے باوجود میں نہیں کہہ سکا تھا' اس وقت وہ بات کہہ سکتا ہوں۔ پھر میں نے اپنے اندر ہمت پیدا کر کے وہ بات کہہ ہی دی۔

میری بات سن کر وہ دونوں ہی چونک اٹھے۔ ذرا دیر بعد ڈیڈی بولے۔ "تمہیں یہ اندازہ کیسے ہوا کہ ہم دونوں تم سے کچھ چھپا رہے ہیں؟ کیا یہ بات بھی تمہیں کسی نادیدہ وجود نے بتائی ہے؟۔ اس سلسلے میں بھی تم نے وہی پُراسرار سرگوشی سنی ہے؟"

"نہیں۔ یہ بات میں نے خود ہی محسوس کی ہے۔" پھر میں نے ڈیڈی کے اس دوست کا تذکرہ کیا جو کلکتے سے آ کر ہمارے یہاں ٹھہرا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔" ممی نے ڈیڈی کو مخاطب کیا "کہیں ایسا۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ وہ پُراسرار نادیدہ وجود ہمیں کوئی نقصان پہنچا دے۔ مجھے۔۔۔ مجھے تو خوف محسوس ہو رہا ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے ممی کی آواز کانپ رہی تھی۔ "کہیں یہ اسی۔۔۔ اسی کی بھٹکتی ہوئی روح نہ ہو جس نے مرنے سے پہلے ہم سے عہد لیا تھا۔ وہ۔۔۔ وہ عہد جس پر ہم۔۔۔ ہم دونوں ہی نے اب تک عمل نہیں کیا۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن ابھی۔۔۔ ابھی وہ عہد پورا کرنے کا وقت ہی کہاں آیا ہے۔" ڈیڈی رک رک کر سمجھانے والے انداز میں بولے "ابھی تو یہ بچہ ہے تم۔۔۔ تم تو ناحق خوفزدہ ہو رہی ہو۔ اگر یہ اسی کی بھٹکتی ہوئی روح ہے تو۔۔۔ تو ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی کیوں کہ ہم نے اس کے ساتھ بھلائی ہی کی تھی۔"

"تم کچھ بھی کہو ڈیسوزا' میں یہی کہوں گی کہ یہ سرگوشیاں کرنے والی اسی کی بھٹکتی ہوئی روح ہے ورنہ وہ۔۔۔ وہ اسے گرجا میں جانے سے نہ روکتی ... وہ اسے یہ۔۔۔ یہ نہ بتاتی کہ۔۔۔ کہ یہ نسلاً عیسائی نہیں ہے۔ مان لو ڈیسوزا کہ اگر ہم نے اس سے بدعہدی نہیں بھی کی تو۔۔۔ تو اس کی امانت میں خیانت کرنے کا تھوڑا بہت جرم ہم سے یقیناً سرزد ہوا ہے۔ بولو' ڈیسوزا' کیا ہم نے یہ نہیں چاہا کہ۔۔۔ کہ اسے عیسائی بنا دیں؟۔۔۔ کیا ہم نے یہ کوشش نہیں کی کہ اسے اپنے ساتھ گرجا لے جایا کریں؟ میرا خداوند مجھے معاف کرے کہ میں۔۔۔ میں بھی اس جرم میں برابر کی شریک رہی۔" ممی ایک عجیب

"نہیں۔"
"کیوں؟"
"اس لیے کہ میں وہ عہد توڑنا نہیں چاہتی جو میں نے اس سے کیا تھا۔ اس نے شادی کی پہلی رات مجھ سے عہد لیا تھا کہ میں کسی بھی حالت میں اور کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ میں نے اپنے محبوب سے کیا ہوا وہ عہد آج تک نہیں توڑا۔ اپنے عہد کو قائم رکھنے کے لیے میں نے بہت مار کھائی، بڑا ظلم برداشت کیا ہے۔ میں اپنی جان دے سکتی ہوں مگر اپنا عہد نہیں توڑ سکتی۔" اس کا اندازِ گفتگو سچا اور مختلف تھا۔

میرے جن سوالوں کے جواب اس نے نہیں دیے تھے اب ان کی وجہ میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "یقین کرو کہ میں تمہیں بھی تمہارا عہد توڑنے پر مجبور نہیں کروں گی۔ تم جب تک چاہو میری چھوٹی بہن بن کر اس گھر میں رہو۔"

میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ دیر تک میرے سینے سے لگی روتی رہی۔

پھر چند روز بعد اسی نے مجھے بتایا کہ جس رات وہ ہمارے گھر آئی تھی، اسی رات اس کے گھر والے اسے قتل کر دینا چاہتے تھے۔ اس نے چھپ کر دن کے وقت اپنے والد اور بھائیوں کی باتیں سن لی تھیں۔ اس کے والد اور بھائیوں نے متوقع رسوائی سے بچنے کے لیے یہی طے کیا تھا کہ رات کو خاموشی کے ساتھ اسے گلا گھونٹ کر مار دیا جائے۔ انہوں نے لاش ٹھکانے لگانے کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ کوٹھی کے عقبی حصے میں جو چھوٹا سا باغ تھا، وہاں انتہائی رازداری کے ساتھ اس کی قبر کھودی گئی تھی۔ اس کی والدہ کو قتل کے اس منصوبے سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ گھر کے مردوں نے ایک بات طے کی تھی اور اس پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ یہ اس کی قسمت ہی تھی کہ اسے اپنے گھر سے فرار ہونے کا موقع مل گیا ورنہ شاید وہ زندہ نہ بچتی۔ میرے بے حد اصرار پر اپنے والدین کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔

اس کے والدین کا تعلق دہلی کے ایک معزز نواب خاندان سے تھا۔ ان کی کوٹھی ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی مگر شاید انہیں یہ گمان بھی نہ ہو گا کہ ایک مسلمان گھرانے کی لڑکی کو کسی عیسائی کے گھر میں پناہ مل سکتی ہے یا وہ اپنی جان بچانے کے لیے کسی عیسائی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے۔ خود اس نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے دروازے پر دستک دینے سے پہلے خود اسے یہ معلوم نہیں تھا۔ اپنے چار دیواری سے باہر وہ کم ہی نکلی تھی۔ گھر کے باہر کی دنیا کے لیے اجنبی ہی تھی۔ ایک تو خود اس نے انتہائی احتیاط کی کہ کبھی ہمارے گھر کے دروازے تک نہیں آئی کہ اس کی نظر پڑ سکتی۔ عموماً وہ اسی کمرے میں رہتی تھی جو ہم نے اس کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اسی کمرے میں اب تم رہتی ہو۔ دوسرے یہ کہ ہم نے بھی اس کے بارے میں کسی کو بتانے سے حتی الامکان گریز کیا۔ تمہارے ڈیڈی نے ملازمین کو بھی اس سلسلے میں سختی سے تاکید کر دی تھی۔ اس کے والدین اور بھائیوں نے ممکن ہے اسے تلاش کیا ہو، تلاش میں ناکام ہو کر شاید صبر کر لیا ہو۔ اس کے گھر والوں نے یقیناً یہی سمجھا ہو گا کہ وہ گھر سے فرار ہو کر اسی کے پاس چلی گئی ہے جسے اپنا شوہر بتا رہی تھی۔

ہمارے یہاں رہتے ہوئے اسے تقریباً چار مہینے ہوئے تھے کہ اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ تمہارے ڈیڈی نے اسے اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا مگر اس کی طبیعت نہ سنبھلی۔ ایک روز اس کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی۔ ساری رات میں اس کے کمرے میں رہی اور جاگتی رہی۔ وہ مجھ سے بار بار کہتی رہی کہ میں اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤں مگر ایسی حالت میں اسے میں کس طرح تنہا چھوڑ سکتی تھی۔ اس رات کا واقعہ ہے کہ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر مجھ سے ایک عہد لیا۔ وہ مضمحل سی آواز میں بولی۔ "باجی! اب شاید میں زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ میں اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ وہ۔۔۔ وہ شاید اب نہیں آئے گا۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم! تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔" میں نے اسے تسلی دی۔

اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔ "آپ لوگوں نے مجھ مظلوم کو اپنے گھر میں پناہ دے کر جو احسان کیا ہے، خدا اس کا اجر آپ کو ضرور دے گا۔ اگر آپ لوگ مجھے نہ ملتے تو شاید۔۔۔ شاید میں اب تک زندہ نہ ہوتی۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "آپ سے ایک۔۔۔ ایک بات کہنا تھی۔ اب میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ کیا خبر کب۔۔۔ کب میری آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں ماں بن بھی سکوں گی یا نہیں، اپنے محبوب، اپنے شوہر کی نشانی کو دیکھ بھی سکوں گی یا نہیں۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہ سکی۔۔۔ ماں بن گئی تو۔۔۔ تو۔۔۔"

"تم زندہ رہو گی۔۔۔ ضرور زندہ رہو گی اور۔۔۔ اور اپنے بچے کی خوشیاں دیکھو گی۔" میں نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھ کر کہا۔

"میں آپ کو اپنے ایک راز میں شریک کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "میرے شوہر، میرے محبوب نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں بیٹے کی ماں بنوں تو اس کا نام طارنوش رکھوں۔"

"طارنوش!" میں حیرت سے بولی کیوں کہ میں نے کبھی پہلے کسی کا یہ نام نہیں سنا تھا۔ میرے لیے یہ نام اجنبی، نامانوس اور عجیب سا تھا۔

"ہاں طارنوش۔" اس نے نحیف آواز میں اس نام کے ہجے بتا کر تصدیق کی۔

"مگر یہ تو بڑا عجیب سا اور مشکل سا نام ہے۔ تم نے اپنے شوہر سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ اپنے ہونے والے بیٹے کا یہ نام کیوں رکھنا چاہتا ہے؟"

"پوچھا تھا اور اس نے مجھے یہ نام رکھنے کی وجہ بھی بتائی تھی مگر۔۔۔ مگر میں نے اس سے جو عہد کیا تھا اسی کے سبب۔۔۔ میں۔۔۔ میں یہ نام رکھنے کی وجہ بھی نہیں بتا سکوں گی۔ ہاں اتنا بتا سکتی ہوں کہ یہ نام بڑا محترم ہے۔ میں اپنے محبوب کی خواہش کا احترام ضرور کروں گی۔ اگر زندہ رہ گئی اور۔۔۔ اور واقعی ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ میں۔۔۔ میں اپنے بیٹے کا نام طارنوش ہی رکھوں گی۔"

وہ ابھی یہی کہہ پائی تھی کہ تمہارے ڈیڈی بھی جاگ اٹھے۔ مجھے کمرے میں نہ پا کر وہ بھی اپنے سلیپنگ گاؤن کا بند باندھتے ہوئے وہیں چلے آئے۔ تمہارے ڈیڈی بھی اس کی علالت سے فکرمند تھے۔ انہوں نے مجھ سے اس کی طبیعت پوچھی۔

"ڈیسوزا! تم جا کر سو جاؤ، تمہیں صبح دفتر بھی جانا ہے۔ میں اس کے پاس موجود ہوں۔ یہ۔۔۔ یہ ٹھیک ہے۔"

"مگر چہرے سے تو یہ ٹھیک نہیں لگتی۔ تم کہو تو میں موٹر نکال کر اسے ابھی کسی اسپتال میں لے جاؤں!"

"نہیں" میرے کچھ بولنے سے پہلے وہ بول اٹھی اور اپنے اوپر پڑی ہوئی چادر کھینچ کر درست کرنے لگی۔ پھر اس نے ڈیسوزا سے کہا۔ "اچھا ہوا کہ اس وقت آپ بھی آ گئے۔ کیا خبر پھر زندگی مجھے اتنی مہلت دے یا نہ دے کہ میں وہ بات آپ سے کہہ سکوں جو میرے دل میں ہے۔ آپ کی نیند تو خراب ہوئی، آپ کو زحمت تو ضرور ہوئی مگر صرف کچھ دیر۔۔۔ گھڑی بھر کو میرے پاس بیٹھ جائیں۔ میں نے آپ دونوں سے اپنے دل کی بات کہہ دی تو۔۔۔ تو پھر سکون سے مر سکوں گی۔"

تمہارے ڈیڈی، مسہری کے سرہانے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے۔ "ہاں کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"اگر۔۔۔ اگر میں۔۔۔ میں ماں بننے تک زندہ رہ جاؤں اور۔۔۔ اور پھر میری زندگی مجھ سے وفا نہ کرے تو۔۔۔ تو آپ دونوں نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، مجھے پناہ دی ہے، تو میرے بچے کو بھی اس سے محروم نہ کیجیے گا۔ پھر۔۔۔ پھر جب وہ باشعور ہو جائے تب۔۔۔ تو اسے یہ ضرور بتا دیجیے گا کہ۔۔۔ کہ اس کی ماں مسلمان تھی۔"

"ہم تم سے عہد کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہو گا!" تمہارے ڈیڈی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "تمہارے بچے کو ہم تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیں گے، مگر صرف اتنا ہی جتنا ہمارے علم میں ہے یا تم نے ہمیں بتایا ہے۔"

خود میں نے بھی اسے اس عہد پر قائم رہنے کا یقین دلایا۔ اس کے چہرے سے اطمینان اور آسودگی کا اظہار ہونے لگا۔ صبح ہونے تک حیرت انگیز طور پر اس کی طبیعت سنبھل گئی اور پھر وہ سو گئی۔ سارا۔۔۔ دن وہ ٹھیک رہی، لیکن رات ہوتے ہی اس کی طبیعت پھر بگڑنے لگی۔ اسی رات وہ ماں بن گئی، ایک بیٹے کی ماں، طارنوش کی ماں!

مجھے۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ اسی رات کے آخری پہر اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی امانت میرے سپرد کر دی تھی اور۔۔۔ اور میں نے اس کے نوزائیدہ بیٹے طارنوش کو اپنے کلیجے سے لگا لیا تھا۔ وہ۔۔۔ وہ رات اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔ ادھر سورج طلوع ہوا ادھر اس کی زندگی کا ماہتاب غروب ہو گیا۔

ہم بے اولاد تھے، سو ہم نے طارنوش کو خداوند کی نعمت سمجھ کر قبول کر لیا اور اس کا شکر بجا لائے۔ ہم نے اسے اپنی اولاد کی طرح پالا اور خداوند نے ہم پر اپنی برکتیں نازل کیں۔ ہم نے ایک لبِ مرگ عورت سے جو عہد کیا تھا، سو پورا کیا اور۔۔۔ اور آج۔۔۔ آج وہ دن بھی آ گیا کہ ہم نے طارنوش کو اس کی ماں کی خواہش کے مطابق وہ سب کچھ بتا دیا جو ہمارے علم میں تھا۔

***

ممی نے مجھے سب کچھ بتانے کے بعد ڈیڈی کی طرف دیکھا اور بولیں۔ "ڈیسوزا کوئی ایسی بات تو نہیں رہ گئی جو میں

طارنوش کو بتانا بھول گئی ہوں؟"

"نہیں ایلین، تم نے تمام واقعات پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ میرے خیال میں تم کچھ بھی نہیں بھولی ہو۔" ڈیڈی نے تصدیق کی پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "طارنوش بیٹے! اب تو تمہارے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں رہی جو تم ہم سے معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"کاش میری مرحومہ ماں نے آپ کو میرے والد کے بارے میں کچھ بتا دیا ہوتا!" میرے لہجے میں حسرت تھی۔ "کاش میرے والد نے ان سے یہ عہد نہ لیا ہوتا کہ وہ میرے والد کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائیں گی۔" یہ کہتے ہوئے مجھے اپنے ننھیال والوں کا خیال آیا اور میں نے ان کے متعلق ڈیڈی سے پوچھ لیا۔

"ہاں تمہارے نانا اور ماموں اب بھی یہیں قرول باغ کی اسی کوٹھی میں رہتے ہیں۔" پھر مجھے ڈیڈی نے ان کے ناموں اور پتے سے بھی آگاہ کر دیا، اس کے بعد کہنے لگے۔ "بیٹے! انہوں نے یقیناً تمہاری ماں پر ظلم کیا مگر۔ مگر خداوند نے معاف اور درگزر کی تلقین کی ہے۔ حالات کا جبر بعض اوقات آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتا۔ وہ درندوں سے بھی زیادہ سفاک اور بے رحم بن جاتا ہے تم۔ تم انہیں بھول جاؤ۔ انہیں معاف کر دو!"

ڈیڈی نے شاید میرے چہرے سے دلی جذبات کا اندازہ لگا لیا تھا، وہ مجھے اسی لیے عفو و درگزر کی تلقین کر رہے تھے۔ میرے دل میں واقعی ان ظالموں کے لیے انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ جنہوں نے میری ماں پر ظلم و تشدد کیے تھے، اسے قتل کرنا چاہا تھا اور گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ ڈیڈی سے اپنے دلی جذبات چھپانے کی خاطر میں نے جواباً کہا۔ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈیڈی! میں۔ میں ان لوگوں کی مجبوریاں سمجھ رہا ہوں۔ میرے دل میں تو صرف یہ خواہش ہے کہ اب نہیں تو ایک نہ ایک دن انہیں یہ ضرور بتا دوں، وہ۔ وہ جسے انہوں نے جان بچانے کے لیے گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا، میں اسی مظلوم کا بیٹا ہوں!"

"مگر اس سے تمہیں کیا حاصل ہوگا بیٹے؟۔ کیا فائدہ اس سے؟" ڈیڈی نے مجھے سمجھایا۔

"اس سے ڈیڈی، شاید میرے دل کو قرار آ جائے۔ شاید میں انہیں ان کے ظلم کا احساس دلانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ شاید ان کے چہروں پر ندامت کی تحریر پڑھ کر اپنی ماں پر کیے جانے والے ظلم کی تپش کچھ کم ہو جائے اس طرح۔ اس طرح یقیناً میری مظلوم ماں کی روح کو بھی سکون ملے گا کہ اس کے بیٹے نے ظالموں کو ان کے ظلم کا احساس دلا دیا۔"

معلوم نہیں ڈیڈی میری بات سے مطمئن ہو سکے یا نہیں، لیکن پھر انہوں نے مزید کچھ نہیں کہا۔ ان باتوں میں رات کے کھانے کو خاصی دیر ہو گئی تھی۔ ممی نے کھانے کے لیے کہا اور میں ڈیڈی کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔

ڈیڈی اور ممی سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا، اس کی روشنی میں اب میرے لیے یہ جاننا دشوار نہیں رہا کہ غیر ارادی طور پر میرا جھکاؤ مسلمانوں کی طرف کیوں تھا! میں ایک مسلمان ماں کا بیٹا تھا اور یقیناً میرا یہ رجحان موروثی اور فطری تھا۔ میں نادانستگی میں اپنی اصل کی طرف لوٹ رہا تھا۔

اس دن کے بعد سے میں اپنے نانا اور ماموؤں کے بارے میں معلومات جمع کرنے لگا۔ میرے نانا کا نام نواب فرقان علی تھا۔ وہ ابھی تک حیات تھے اور بڑے طمطراق کے آدمی تھے۔ انگریز غاصب حکمرانوں نے سب کچھ چھین چھان لیا تھا مگر اب بھی اتنا تھا کہ خوئے نوابی نہیں گئی تھی۔ اب بھی انہیں گھر سے کہیں باہر جانا ہوتا تو ٹم ٹم میں بیٹھ کر نکلتے تھے۔ انگرکھا زیب تن ہوتا اور سر پر جچی ہوئی دوپلی ٹوپی۔ سرخ و سفید چہرے پر گھنی مونچھیں، اوپر کے رخ تنی رہتی

تھیں۔ شاید وہ مونچھوں کو سخت رکھنے کے لیے ان پر کچھ لگاتے تھے۔ میرے دونوں ماموں بھی نانا کی ہو بہو تصویر تھے۔ میرا ایک ماموں زاد میری ہی عمر کا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے اس سے تعلقات استوار کر لیے۔ اس کا نام عفت علی تھا۔ اسے اپنے والد، یعنی میرے بڑے ماموں کی طرح شطرنج کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ مجھے شطرنج کھیلنا نہیں آتی تھی۔ عفت علی ہی سے قربت حاصل کرنے کے لیے میں نے شطرنج سیکھی۔ اس شطرنج کے کھیل کے باعث میری اور اس کی دوستی پکی ہو گئی۔

عفت علی ہی سے دوستی کے ناتے پہلی بار میں اس چار دیواری میں داخل ہوا جس کی حدود میں میری ماں کے لیے قبر کھودی گئی تھی۔ عفت علی ہی کیا اس کے گھر کے کسی فرد کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ اس گھر اور اس گھر کے افراد سے میرا کیا رشتہ ہے؟ یوں بھی ان دنوں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ میں بھی فارغ تھا اور عفت علی بھی! عفت علی سے مجھے قریب آنے کا موقع مل گیا تو اسی کے توسط سے میں نے دانستہ گھر کے دوسرے افراد سے بھی قریب ہونا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ میرے حسنِ اخلاق اور شائستگی کے سبھی اسیر ہوتے چلے گئے۔ اس گھر میں موجود حسین چہرے پہلے سخت پردے میں رہتے تھے لیکن اب بھی کبھار مجھے اپنی جھلک دکھانے لگے۔ پردے سے کبھی کسی کی جھلک نظر آ جاتی اور برقِ جمال حسن مجھے تڑپا دیا کرتا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس گھر میں تین حسین و نوجوان چہرے ہیں۔

بڑے ماموں کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹا عفت علی سے بڑا تھا جو علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھا اور دو عفت علی سے چھوٹے تھے جو ابھی اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ تین بیٹیوں میں سے ایک عفت علی سے دو سال بڑی اور ایک سال بھر چھوٹی تھی۔ تیسری بیٹی کی عمر ابھی چار سال تھی۔ چھوٹے ماموں کی صرف ایک بیٹی تھی جو عفت علی کی ہم عمر تھی، باقی تین بیٹے تھے اور سبھی چھوٹے۔

رابعہ، زاہدہ اور زیبا ان تینوں کے نام تھے۔ زاہدہ اور زیبا بڑے ماموں کی بیٹیاں تھیں، رابعہ چھوٹے ماموں کی۔ تینوں کی تینوں چندے آفتاب چندے ماہتاب تھیں۔ میں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ وہ تینوں ہی مجھ میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سماتیں پھر وہ "تین تلواریں" کس طرح سما جاتیں۔ میں ان تینوں کے حسن کا معترف ضرور تھا مگر ان میں سے کسی کے لیے بھی میرا دل تیزی سے نہیں دھڑکا تھا۔ میرا مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ میں نے اپنے انتقام کی راہیں متعین کر لی تھیں اور تو اور میں نے ممی ڈیڈی کو بھی اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔ عفت علی سے میری بڑھتی ہوئی دوستی دیکھ کر ڈیڈی نے ایک بار سمجھایا ضرور تھا کہ میں کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھاؤں۔ میں نے انہیں مطمئن کر دیا کہ میرا کوئی خطرناک ارادہ نہیں ہے۔

اب عفت علی مجھ سے ہر اچھی بری بات کرنے لگا تھا۔ ایک روز شطرنج کھیلتے ہوئے ایک چال چلنے کے بعد وہ مجھ سے اچانک بولا "کبھی تم نے کسی سے عشق کیا ہے؟"

"پہلے چال تو چلنے دو یار! تم تو مجھے عشق کے چکر میں پھنسا کر مات دے دو گے۔ تمہارا گھوڑا شہ دینے کے لیے پر تول رہا ہے، پہلے تو اسے لگام دے دوں!"

یہ کہہ کر میں نے پیدل کے زور پر اپنا گھوڑا بھی ڈھائی گھر چل دیا تاکہ عفت علی یا تو گھوڑے سے گھوڑا لڑا دے یا پیچھے ہٹ جائے۔

اس نے ہنستے ہوئے اپنا گھوڑا پیچھے ہٹا لیا اور بولا۔ "تم تو ایک دم لڑائی بھڑائی پر اتر آئے ہو۔" پھر وہ ذرا سا توقف کر کے بولا۔ "ہاں میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا، تم نے اس کا جواب نہیں دیا۔"

"ہاں وہ۔ عشق!" میں نے چال سوچتے ہوئے کہا۔ "دراصل یار ابھی میری عمر اس قابل نہیں ہوئی کہ عشق کروں۔ ویسے ایک بات اور بھی ہے کہ اب تک کسی نے گھاس ہی نہیں ڈالی۔" میں اسی لمحے ایک مانوس خوشبو محسوس ہوئی اور میری نظر سامنے پڑے ہوئے ریشمی پردے کی طرف اٹھ گئی۔ دریچے پر پڑا ہوا ریشمی پردہ لمحے بھر کو اپنی جگہ سے ہٹا اور میری نظر کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ کسی کا روئے زیبا تھا جو اپنی چھب دکھا کر چلمن کے پیچھے چلا گیا۔ دریچہ عفت علی کی پشت کی طرف تھا اور میرے بالکل سامنے۔ یہ دریچہ گھر کی اندرونی سمت کھلتا تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ خوشبو لگانے کا شوق اس گھر میں کس کو تھا۔ یہ زیبا کی من پسند خوشبو تھی اور اسی خوشبو کے سبب میں پہچان لیتا تھا کہ پردے کے پیچھے کون ہے۔ اس وقت مجھے زیبا ہی کا روئے زیبا نظر آیا تھا۔ وہ عین اس وقت وارد ہوئی تھی جب میں عفت علی سے یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اب تک کسی نے گھاس ہی نہیں ڈالی۔ پردہ اٹھا کر اور اپنا روئے زیبا دکھا کر اس نے مجھے گھاس ڈالنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

عفت علی کی نظریں بساط پر جمی ہوئی تھیں کیوں کہ میں اس دوران میں چال چل چکا تھا۔ میری توجہ زیبا کی طرف مبذول ہو گئی تھی یہی وجہ ہوئی کہ میں غلط چال چل گیا اور عفت علی نے اس سے فائدہ اٹھا کر میرا وزیر پیٹ لیا۔ اب

اگلا مرحلہ شراب و رنگ کا تھا اور ایک بڑی بازی لگی تھی۔ میں نے شکست قبول کر لی۔ یوں بھی عظمت علی شطرنج کا اچھا کھلاڑی تھا۔ مجھے تو شطرنج کھیلتے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے۔ پورا وزیر کم ہو جانے کے بعد بازی کھیلنا میرے لیے یوں بھی ممکن نہیں تھا۔ اگلی بازی کے لیے بساط پر مہرے لگانے سے پہلے عظمت علی آہستہ سے بولا۔ "پہلے عشق کی بازی پر گفتگو ہو جائے۔"

"مگر تم نے یہ بازی لگائی کس سے ہے؟" میں نے مسکرا کر کہا اور پردے کی طرف نظر اٹھائی۔ وہ خوشبو رخصت ہو چکی تھی۔ "تک دیکھ لیا دل شاد کیا۔" کی مصداق ہیشہ کی طرح وہ اپنا جلوہ دکھا کر چلی گئی تھی۔

"وہ ایک سنگ دل ہے۔ کبھی اس کا دل ہی نہیں پگھلتا۔ ظالم ہے جب بھی نظریں چار ہوتی ہیں' منہ بنا لیتی ہے۔" عظمت علی اپنی محبوبہ کا دکھڑا سنانے لگا۔

"اس کا تو مطلب یہ ہوا جانِ عزیز کہ تم تنہا بازی کھیل رہے ہو' دوسری طرف سے چال نہیں چلی جا رہی۔"

"واقعہ اب تک تو یہی ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔ "تم اگر اسے دیکھو تو تم بھی دل تھام کر رہ جاؤ۔ کہو تو کسی روز تمہیں بھی اس کا دیدار کرا دوں!"

"کیا؟" میں چونک اٹھا۔ "یار تم کسی زنِ بازاری کے چکر میں تو نہیں پھنس گئے کہ جس کا دیدار اتنا عام ہے کہ مجھے بھی شربتِ دیدار پلانے کی دعوت دے رہے ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے پیارے! تم غلط سمجھ رہے ہو بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ پردہ نہیں کرتی۔ اس کا نام کلونت کور ہے اور وہ پہاڑ گنج میں رہتی ہے۔"

"تو یہ قصہ ہے!" میں مسکرایا۔ "تم نے بھی حد کر دی! دل آیا بھی تو ایک غیر مذہب دوشیزہ پر! تمہارے حصے میں بڑا سخت امتحانی پرچہ آیا ہے جس میں ایک سو ایک فیصد فیل ہونے کے امکانات ہیں۔ تمہارے اور اس کے درمیان تو ایک ایسی دیوار کھڑی ہے پیارے کہ اگر اس پتھر میں جونک لگ بھی گئی تو تم دونوں مل کر بھی اس دیوار کو نہیں گرا سکو گے۔"

"اب اتنا سنگین مسئلہ بھی نہیں ہے' مسلمان کر لیں گے اسے! مگر پہلے وہ ہمارے جذبِ شوق کا جواب تو دے۔" وہ رنگین مزاج عاشقوں کی طرح بولا۔

پھر اس نے روز ہی کلونت کور کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیے۔ میرے دل میں بھی یہ اشتیاق پیدا ہو گیا کہ دیکھوں تو سہی' وہ آخر ہے کیا شے' جس کے حسن کی مدح سرائی میں عظمت علی نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔

پہاڑ گنج میں عظمت علی کا ایک دوست فرید احمد رہتا تھا۔ اسی کے گھر سے لگا ہوا گھر اس غارت گرِ ہوش کا تھا۔ فرید احمد اور اس کے گھر کی چھت سے چھت ملی ہوئی تھی۔ چھت پر چڑھ کر اس کے گھر میں جھانکنے میں آسانی بھی تھی۔ شام کو چار بجے کے قریب وہ عموماً کپڑے سکھانے چھت پر آتی تھی۔

میں عظمت علی اور فرید احمد ہم تینوں ہی وقت سے پہلے "مورچہ" لگا کر چھت پر بیٹھ گئے۔ چھت پر ایک چھپر بھی پڑا ہوا تھا۔ ہم تینوں اس کے سائے میں کھڑے ہو گئے ورنہ گرمی مزاج پوچھ رہی تھی۔ اگر شوقِ دیدار نہ ہوتا تو ہرگز میں دھوپ اور گرمی میں چھت پر جانے کو راضی نہ ہوتا۔ فرید احمد اور اس کی چھت کے درمیان چھوٹی سی دیوار تھی جس کی بلندی تین فٹ سے زیادہ نہیں ہو گی۔ گویا دیدارِ یار میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

خدا خدا کر کے وہ وقت آیا جس کا ہم تینوں ہی کو بے چینی سے انتظار تھا۔

"تم نے کچھ سنا فرید!" اچانک عظمت علی بول اٹھا۔ "چھم چھم پائل بول رہی ہے — وہ — وہ آ رہی ہے۔"

"ہاں پائل کی آواز تو آ رہی ہے۔" فرید احمد نے تصدیق کی۔ "وہ سیڑھیاں چڑھ رہی ہو گی۔"

"اب دیکھنا تم پیارے! اسے دیکھ کر تمہارے ہوش نہ اڑ جائیں تو کہنا۔" عظمت علی نے میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"واقعی بڑی قابلِ دید شے ہے۔ دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے سارنگی کے تار کھنچے ہوئے ہوں۔" فرید احمد نے یہ کہتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"یار عظمت' محبوبہ تو تمہاری ہے اور مزے لے رہے ہیں بھائی فرید۔" میں ہنس کر بولا۔

کچی عمر کا عشق ایسا ہی ہوتا ہے کہ آدمی ایسی باتوں پر دھیان نہیں دیتا اور شاید عظمت علی کا عشق بھی ابھی ہوس کی منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ غالباً اسی لیے اس نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ ممکن ہے فرید احمد میری بات کا کوئی جواب دیتا کہ اسی وقت وہ سراپا قیامت چھم چھم کرتی چھت پر آ گئی۔ وہ ہم سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر تھی اور اس کی نظر ابھی تک ہماری طرف نہیں اٹھی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں لوہے کی بڑی سی بالٹی تھی جس میں اوپر تک بھیگے ہوئے کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ عظمت علی نے غلط نہیں کہا تھا۔ اسے دیکھ کر واقعی میرے ہوش اڑ گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے دھوپ میں ایک دم تیزی آ گئی ہو۔ وہ ہلکی گلابی پھول دار

قمیص اور گلابی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے ایک مسکتا گلاب نظر آئی۔ اس کے گلے میں دوپٹا نہیں تھا اور سر کے لیے سیاہ گھنے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بالٹی رکھنے کو جھکی تو مجھے شاخِ خمیدہ کی یاد آ گئی۔ اس نے بالٹی سے ایک کپڑا اٹھا کر پھیلایا اور اسے دونوں ہاتھوں میں تھام کر جھٹکے دینے لگی۔ ہر جھٹکے کے ساتھ گویا کائنات زیر و زبر ہو رہی تھی۔ زلفوں کی آوارہ لٹیں اس کے کمان ابروؤں کو بار بار چوم رہی تھیں۔ زرپاش پیشانی کا ہلال' زلفوں کی گھٹاؤں میں ابھر رہا تھا' ڈوب رہا تھا۔ سرخ رخسار دھوپ کی تمازت سے اور بھی سرخ ہو رہے تھے اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سامنے موجود الگنی پر کپڑا پھیلا دیا اور پھر دوبارہ بالٹی کی طرف مڑی۔ وہ دنیا جہان سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھی۔ میری نظریں اس پر جم کے رہ گئی تھیں۔ ایک تیر تھا جو دل میں ترازو ہو گیا تھا۔

اس شعلۂ جوالا پر تمہارا حق ہے۔ میرے اندر جیسے کوئی بولا اور میں خود فراموشی کے عالم میں اس دیوار تک پہنچ گیا جو دونوں چھتوں کے درمیان تھی۔ میں ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔ میری نظروں کی تپش نے اسے شاید میری طرف متوجہ کر دیا۔ اس نے میری طرف نظر اٹھائی۔ معلوم نہیں وہ اعجازِ عشق تھا یا کچھ اور کہ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نہیں ابھرے۔ میری اور اس کی نظریں چار ہو چکی تھیں۔ میں مبہوت سا اسے دیکھے جا رہا تھا اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ کوئی چنگاری ادھر بھی وجود کے نہاں خانوں سے ابھری جس کی جھلک لمحہ بھر کو مجھے اس کی آنکھوں میں نظر آئی۔ وہ جس حالت میں تھی اسی حالت میں کھڑی رہ گئی تھی۔ یہ صرف چند لمحے تھے جو مجھے صدیوں پر محیط محسوس ہوئے۔ وہ مسکرائی اور اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا کپڑا جھٹک کر الگنی پر ڈال دیا۔

"ابے یار تم تو بڑے تیز رفتار ثابت ہو رہے ہو! یاروں کو پیچھے ہی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔" عظمت علی میرے قریب پہنچ کر بولا۔

میں وادیٔ کیف و نشاط سے نکل آیا اور چونک کر عظمت علی کی طرف یوں دیکھا جیسے میں نے اسے پہلی بار دیکھا ہو۔ فرید احمد بھی پیچھے ہی کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "پسند آئی نا؟ ہے نا پری ملکہ وکٹوریہ!"

میرے جی میں آئی' کہہ دوں کہ ابے گھامڑ اس کے آگے ملکہ وکٹوریہ کی کیا حیثیت ہے' مگر میں خاموش ہی رہا۔ کلونت کور کو ملکہ وکٹوریہ کہنا میرے نزدیک اس کے حسن کی توہین کے مترادف تھا۔

پھر وہ دونوں کلونت کور پر بازاری قسم کے جملے چست کرتے رہے مگر میں خاموش رہا۔ مجھے تو اس غارت ایماں کو دیکھنے ہی سے فرصت نہیں تھی۔ اسے اس قدر دیکھنے کے باوجود بھی میں نے جیسے ابھی کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ نگاہوں کی پیاس بجھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ میں آخر دیکھتا بھی کیا کیا کہ وہاں دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔

جب سے وہ دونوں میرے قریب آ کر کھڑے ہوئے تھے کلونت کور نے ایک نگاہِ غلط انداز بھی ان پر ڈالنا گوارا نہیں کیا۔ ہاں ان کے بازاری فقروں کا ردعمل اس پر ضرور ہوا تھا۔ اب مجھے اس کے چہرے پر برہمی کے آثار نظر آنے لگے۔ عظمت علی کو بھی یقیناً اس بات کا احساس ہو گیا تھا مگر وہ عجب ڈھیٹ تھا۔ اس نے استاد داغ کا ایک شعر پڑھ دیا۔

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ   ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے

جواب میں کلونت کور نے عظمت علی کو ایسی قہر آلود نظروں سے دیکھا جیسے کچا چبا جائے گی۔ پھر وہ خالی بالٹی اٹھا کر تیزی کے ساتھ زینے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "لفنگا کہیں کا!" یہ الفاظ گویا عظمت علی سے اس کی نفرت کا اظہار تھے۔ عظمت علی ڈھٹائی سے "ہائے" کر کے رہ گیا۔

"اب نیچے چلو یار' وہ چھمک چھم تو چلی گئی۔" فرید احمد اپنے مخصوص لہجے میں بولا اور ہم سب چھت سے نیچے اتر آئے۔

اس رات خواب اور بیداری دونوں ہی حالت میں کلونت کور میرے حواس پر چھائی رہی۔ دوسرے ہی دن سے میں اس کے گھر کے پھیرے لگانے لگا اور مجھے شوقِ دیدار میں ناکامی نہیں ہوئی۔ تیسرے دن میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ گھر کا سودا سلف لے کر لوٹ رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھی اور پھر اس کے حسین ہونٹوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ میں بے ظاہر بے تعلق سا بنا ہوا گلی کے نکڑ پر کھڑا تھا اور اسے قریب آتے دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے میرے دل پر پاؤں دھرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک موجِ رواں کی مانند۔ اندازِ خرام ایسا تھا جیسے زمانہ اس کے قدموں میں ٹھوکریں کھا رہا ہو۔ بسنتی جوڑا اس پر اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ وہ قریب سے قریب تر آتی گئی اور میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس کی ادھیڑ عمر ماں آگے آگے تھی اور وہ دو قدم پیچھے چل رہی تھی۔ قریب آئی تو میری اور اس کی نظریں مل گئیں۔ ایک عالم گزر گیا جی پر' میں نے محسوس کیا کہ ان نگاہوں میں میرے لیے پیغام

محبت تھا اور لبوں پر مچلتے ہوئے تبسم میں انداز پذیرائی۔ وہ مجسم خوشبو میری کشتِ جاں کو مہکاتی ہوئی بہت پاس سے گزر گئی۔

میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہیں آس پاس قریب کہیں فرید احمد بھی گھات لگائے بیٹھا ہو گا۔ میں تو اس وقت چونکا جب فرید احمد نے پیچھے سے اچانک میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا "آج عین موقعے پر پکڑے گئے استاد! کل بھی میں نے تمہیں گلی کے پھیرے لگاتے دیکھا تھا مگر تم جانے کہاں اڑن چھو ہو گئے۔ یاروں سے یار ماری نہیں چلے گی پیارے! ہم تو مل بانٹ کر کھانے والے ہیں۔"

اس دوران میں اس کی طرف مڑ چکا تھا۔ "تم غلط سمجھ رہے ہو۔" میں اس سے بولا۔ "میں تو تمہاری ہی طرف آ رہا تھا کہ اچانک وہ نظر آ گئی اور یہاں رک گیا۔"

"دیکھو یار مجھ سے زیادہ نہ اڑو! جھوٹ بولنا بھی ایک فن ہے جو یقیناً تمہیں نہیں آتا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ تم پہ مرمٹی ہے۔ اس روز بھی چھت پر وہ تمہیں دیکھ کر مسکرائی تھی اور آج بھی میں نے اسے مسکراتے دیکھ لیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تم مجھ سے اور عظمت علی سے زیادہ خوبصورت ہو مگر اس پر پہلا حق ہم دونوں کا ہے اور میں۔ میں تو برسوں سے اس کے لیے ٹھنڈی میٹھی آہیں بھر رہا ہوں مگر ظالم پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ عظمت علی کو بھی میں نے ہی پہلی بار اس کا دیدار کرایا تھا۔ اب البتہ تمہاری آمد سے کچھ امید بندھی ہے۔ توقع ہے کہ کچھ نہ کچھ دال دلیا ہو جائے گا لیکن تم بالا ہی بالا ہاتھ کی صفائی دکھانے پر آمادہ لگتے ہو۔ چلو آؤ چلو! بیٹھ کر رسان سے بات کریں گے۔" فرید احمد نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

فرید احمد بڑا کائیاں لگتا تھا۔ اسے غوطہ دینا آسان نہیں تھا۔ اس لیے میں نے مزید کج بحثی نہیں کی اور ہتھیار ڈال دیے۔ عشق رقیب کو برداشت نہیں کرتا مگر صورتِ حال ایسی تھی کہ رقیب کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں تھا بلکہ رقیب دیدارِ یار میں معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ سو میں اس کے ساتھ چل دیا۔

فرید احمد مجھے اپنے گھر کی بیٹھک میں لے آیا جہاں مونڈھے پڑے تھے اور ایک طرف موٹی سی دری زمین پر بچھی ہوئی تھی۔ میں ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا اور اس نے سامنے والا مونڈھا سنبھال لیا۔

"دیکھو مجھے لگتا ہے کہ تمہارے اندر صنف نازک کے لیے بڑی کشش ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبوتری ہمارے اڈے پر بیٹھنے کے بجائے تمہارے اڈے پر بیٹھنے کے لیے پر نہ تول رہی ہوتی۔" فرید احمد کا انداز ایسا تھا جیسے مجھے شیشے میں اتارنا چاہتا ہو۔ "میں نے عظمت علی سے بھی کل یہی بات کہی تھی مگر وہ نواب زادہ کسی کو خاطر میں لاتا ہے! وہ تو خود کو شہزادہ گلفام سمجھتا ہے۔ خیر اس کا ذکر چھوڑو! وہ چاہے تو اس معرکے میں ہمارے ساتھ رہے نہ چاہے نہ رہے۔ ساتھ رہے گا تو وہ بھی مزے کرے گا نہیں تو ہم دونوں کافی ہیں۔"
اپنی دانست میں وہ بڑی فراخ دلانہ پیش کش کر رہا تھا اور میں مصلحت کے تحت اس کی خرافات سننے پر مجبور تھا۔ مجھے چپ دیکھ کر وہ مزید بولا۔ "بولو کیا کہتے ہو؟ اگر تمہیں عظمت علی کا خیال ہے تو میں اسے اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دوں گا۔"

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ایک ہی ملاقات میں بے تکلفی کی تمام منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ اس میں کچھ عمر کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔ فرید احمد بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ اس سے پہلی ملاقات میں مجھے ایسا لگا کہ برسوں کی شناسائی ہو۔ پھر یہ تو یوں بھی اس سے دوسری ملاقات تھی۔ میں نے سوچا کہ فرید احمد کو پُل بنائے بغیر ندی پار اترنا مشکل ہے۔ اسے برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ وہ خود ہی کھیل ہو رہا تھا تو مجھے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ رہی گلونت کور تو مجھے پورا یقین تھا کہ فرید احمد کو گھاس نہیں ڈالے گی۔ فرید احمد بھی اس کا اعتراف کر چکا تھا۔ کھیل بالکل سیدھا سیدھا تھا۔ گلونت کور تک پہنچنے کے لیے ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو استعمال کرنا چاہتے تھے اسے مجھ پر صرف اتنی برتری حاصل تھی کہ اس کا گھر گلونت کور کے گھر سے ملا ہوا تھا اور میرے نزدیک یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔ اسے کسی بھی مرحلے پر ناک آؤٹ کیا جا سکتا تھا۔ عشق کی اس بازی میں واضح طور پر مجھے اپنی جیت نظر آ رہی تھی۔ عشق و ہوس میں جو فرق ہوتا ہے وہی فرق میرے اور فرید احمد کے درمیان تھا۔ میں نے اسی لیے کچھ شرائط کے ساتھ اس کی پیش کش قبول کر لی۔

پھر اس روز شام سے کچھ پہلے میں فرید احمد کے گھر پہنچ گیا۔ فرید احمد اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ ابتدا میں میرے اور گلونت کور کے درمیان نہیں آئے گا اور مجھے اس سے خلوت میں ملنے کا موقع دے گا۔ اسی کے ساتھ اس نے رازداری کا وعدہ بھی کر لیا تھا کہ عظمت علی کو ان ملاقاتوں کی خبر نہیں ہو گی۔

چھت پر ہم دونوں ساتھ ہی گئے مگر جب بائک کی صدا سنائی دینے لگی تو وہ سرداری کے فرائض انجام دینے کے لیے

زینے پر جا بیٹھا۔ چھت پر دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور صرف چھپر کے نیچے سایہ تھا مگر عشق میں آدمی سایہ طلب کب ہوتا ہے! آرام طلبی مزاجِ عشق پر گراں گزرتی ہے۔ سو میں بھی سائے سے نکل کر دھوپ میں آ گیا اور دونوں چھتوں کی درمیانی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

حسب معمول وہ چھم چھم کرتی ہوش اڑاتی آئی اور چھت پر آتے ہی مجھے دیکھ لیا مگر ایسی بن گئی جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ کپڑے سکھاتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے بار بار مجھے دیکھتی رہی۔ اس دوران میں اس کے حسین ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ بکھرتی رہی۔ میں کچھ نہ بولا کہ بولنا ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ وہ مجھ سے اتنے قریب تھی کہ اگر میں کچھ کہتا تو وہ سن لیتی۔ دیوار کے اس طرف میں تھا اس طرف وہ الگنی پر کپڑے پھیلاتی ہوئی وہ کچھ اور قریب آ گئی اور اسی لمحے جیسے میری سماعت میں رس گھل گیا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر آہستہ سے کہا تھا۔ "آج اکیلے کیسے ہو؟ تمہارے لنگوٹیے دوست کہاں ہیں؟"

"وہ دونوں میرے حق میں دستبردار ہو گئے ہیں۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا حالانکہ میں نے سفید جھوٹ بولا تھا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" اس نے اسی طرح براہِ راست میری طرف دیکھنے سے گریز کیا اور جھک کر بالٹی سے ایک کپڑا اٹھانے لگی۔

"طارنوش۔" میں نے بتایا۔ اس نے زیر لب میرا نام دہرایا۔

"عجیب نام ہے۔ بالکل تمہاری ہی طرح عجیب!" وہ مسکرائی۔ بالٹی اب کپڑوں سے خالی ہو چکی تھی۔ اس نے خالی بالٹی اٹھائی اور پھر اپنی گھنی پلکوں کی چلمن اٹھا کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور جیسے گنگناتی آواز میں سوال کیا۔ "کل بھی چھت پر آؤ گے نا؟"

"ہاں۔" میں بوجھل سی آواز میں بولا۔ شاید نشۂ حسن سے میری آواز بوجھل ہو گئی تھی۔

میرا جواب سن کر وہ مست کن انداز میں زینے کی طرف بڑھنے لگی۔ زینے تک پہنچتے پہنچتے اس نے کئی دفعہ مڑ مڑ کر دیکھا اور اپنی نظروں کے تیر چلائے۔ میں کسی زخمی ہرن کی طرح ان تیروں کو اپنے دل میں اتارتا رہا مگر اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔

پھر یہ ملاقاتیں روز ہونے لگیں۔ انہی ملاقاتوں کے درمیان اسے میرے بارے میں اور مجھے اس کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اسی کے ساتھ فرید احمد کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔ وہ اب صاف صاف الفاظ میں مجھ سے یہ مطالبہ کرنے لگا تھا کہ میں کسی دن گلونت کور کو اس کی بیٹھک میں بلا لوں۔ اس کی ہوس اب مزید انتظار کی متحمل نہیں ہو رہی تھی۔ میں اسے طرح دے رہا تھا کہ ابھی وہ حوصل نہیں آئی۔

ایک روز شام کو جب میں حسب معمول اس کے گھر پہنچا تو وہ بہت اکھڑا ہوا تھا۔ میں اسے رام کرنے کے لیے بولا۔ "کیا ہوا یار، آج تو تم بالکل اداس بلبل لگ رہے ہو۔"

"چھوڑو یار! میں نے سوچا کچھ تھا اور ہو کچھ گیا۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"کیا ہو گیا؟ کچھ بتاؤ گے بھی!" میں بولا حالانکہ مجھے سب کچھ معلوم تھا کہ اس کا منہ کیوں بنا ہوا ہے اور وہ کیا چاہتا ہے۔

"بتا دوں کیا سوچا تھا! برا تو نہیں مانو گے؟"

"تم کہو نہیں مانوں گا برا۔"

"میں نے بلبل سے بلبل پکڑنا چاہا تھا مگر اسے بسا آرزو کہ۔۔۔"

"تو اب کیا ایسی آفت ٹوٹ پڑی میری جان! بلبل تو زیرِ دام آ چکی ہے 'بس ذرا دانہ دنکا چگنے لگے' دور کھینچ لوں گا۔" میں نے اسی کی زبان میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "بس تھوڑا سا صبر کر لو!"

"میں صبر کرتا رہوں اور تم بلبل سے چونچ لڑاتے رہو! میں اندھا نہیں ہوں۔ سب دیکھتا رہتا ہوں میں کہ تم اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے کیا کیا کارروائیاں کرتے رہتے ہو! اور وہ۔ اسے تو میں اچھی طرح دیکھ لوں گا۔ ہم سے تو بڑی پارسا بنتی تھی وہ۔"

"اچھا اب غصہ تھوک دو! میں آج اسے گھاٹ پر لانے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے یہ سوچ کر اسے دلاسا دیا کہ کہیں وہ کم بخت واقعی رقیبِ روسیاہ نہ بن جائے اور آج ہی سے مجھے نہ ڑخا دے۔

"اگر تم کہتے ہو تو میں تمہیں آخری موقع دے دیتا ہوں۔ اب میں مزید الو بننے پر تیار نہیں ہوں۔ آج بھی رات کو تم اسے بیٹھک میں آنے پر آمادہ نہ کر سکے تو اپنا پتا صاف سمجھنا۔ میں تمہیں اس سے مزید ملنے کا موقع نہیں دوں گا۔ پھر میں جانوں اور وہ!"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی دھمکی بڑی مشکل سے برداشت کی۔

میں چھت پر پہنچا تو وہ لپک کر دیوار کے قریب آگئی اور شاکی لہجے میں بولی۔ "آج تم نے بڑی دیر کردی آنے میں؟"

"ہاں۔" میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "ایک عذاب شخص میری جان کو لپٹ گیا تھا۔" میں نے اب تک فرید احمد کے ناپاک عزائم سے اسے آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ فرید احمد کو میرا مخلص دوست ہی سمجھ رہی تھی مگر اب پانی سر سے گزر گیا تھا۔ مجبوراً میں نے مختصر الفاظ کا سہارا لے کر اسے فرید احمد کا اصل چہرہ دکھا دیا۔

"اتنا کمینہ ہے وہ!" اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"اس پر خاک ڈالو اور یہ سوچو کہ اب ہم کہاں مل سکتے ہیں؟ وقت کم ہے اور ابھی تم نے شاید آدھے ہی کپڑے سوکھنے کے لیے ڈالے ہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر ایک دم اس کے چہرے پر رونق آگئی "میری ایک سہیلی ہے شانتی۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ اسی محلے میں رہتی ہے۔ اس کا باپ چلنے پھرنے کے قابل نہیں۔ فالج ہو گیا ہے اسے۔ وہ۔ وہ جگہ بہت۔ بہت ٹھیک ہے ملنے کے لیے!۔ مگر میں۔ میں روز وہاں نہیں جا سکتی۔ دوسرے تیسرے دن تو خیر اب بھی ہو آتی ہوں۔" پھر وہ جلدی جلدی مجھے شانتی کے گھر کا پتا سمجھانے لگی۔ شانتی کا گھر وہاں سے دو گلی پیچھے تھا۔

"زندہ باد!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "آخر نکال ہی لی نہ تم نے بالمن کی راہ! میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی!" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں تو میں نے اسے فرید احمد کی طرف سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔

"جان سے ماردوں گی اسے' اگر اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی۔" وہ جلال میں آگئی۔ "میں سوار ہلونت سنگھ دی کڑی آں کسے گیدڑ دی نئیں!"

پھر اس سے اگلے روز صبح دس بجے شانتی کے گھر ملاقات کا طے ہو گیا اور میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ بدبخت فرید احمد نے تو اپنی دانست میں میرا پتا ہی صاف کردیا تھا۔ مجھے خوشی یہ تھی کہ اب وہ تنہا رہ جائے گا اور میں "بلبل" کو لے اڑوں گا۔

"کیا رہا؟" وہ میرے ساتھ زینے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے ہنکارا۔ "مان گئی کہ نہیں یا اٹھوانا پڑے گا سالی کو؟"

"وہ کرپان چلانا بھی جانتی ہے پیارے!" میں نے اس سے تفریح لینے کو کہا۔

"وہ ظالم تو خود کرپان ہے!" حسب معمول اس نے سسکاری بھری' پھر لہجہ بدل کر کہنے لگا۔ "یہ تو خیر دیکھا جائے گا کہ وہ کیا کیا چلانا جانتی ہے' فی الحال تو تم مجھے چلانے کی کوشش مت کرو اور مطلب کی بات بتاؤ! آج رات کو وہ آرہی ہے بیٹھک میں کہ نہیں؟"

"میں نے تم سے کہا تھا نہ یار کہ کچھ دن میں مان جائے گی مگر تم میری بات سن کر ہی نہیں دے رہے۔"

"اب بھی مزید کچھ دن چاہئیں تمہیں!۔ بہت خوب!۔ اتنی بڑی دلی میں ایک میں ہی تمہیں الو کی دم فاختہ نظر آیا ہوں!"

"وہ تو خیر تم ہو۔" میں نے آہستہ سے ہنس کر کہا۔ اب ہم نیچے بیٹھک میں آگئے تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"اگر تم الو کی دم فاختہ نہ ہوتے تو اتنا بے صبرا پن نہ دکھاتے۔ معلوم ہے کیا ہوا؟" میں نے اسے مزید گھمنے کی خاطر رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"کیا ہوا؟ بولو!" وہ میری چال میں آگیا اور متجسس نظر آنے لگا۔

"تمہارے بے صبرے پن کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کبوتری نے آج اڈے پر بیٹھنے سے ہی انکار کردیا۔"

"کیا مطلب!۔ میں سمجھا نہیں۔"

"اب سمجھنے کو رہ بھی کیا گیا ہے میرے اداس بلبل! دھوتی کی ناک میں لنگوٹی بھی گئی۔" میں اسی زبان میں گفتگو کر رہا تھا جو اسے پسند تھی۔

"تم صاف صاف بتاؤ نہ یار کہ بات کیا ہوئی اس سے؟ تم نے کیا کہا؟ وہ کیا بولی؟ مجھے پتا تو چلے کہ آخر ہوا کیا؟"

"دراصل میں نے گول مول رکھنے کے بجائے واضح طور پر عرض وصال کردی اور یہ بھی بتا دیا کہ جو عرضی میں نے اسے پیش کی ہے اس پر اپنے بھائی فرید احمد کے دستخط بھی ہیں یعنی تم بھی مشتاقِ وصلِ یار ہو۔ مقام وصل سے بھی میں نے تمہاری ہدایت کے مطابق اسے آگاہ کر دیا کہ وہ تمہاری بیٹھک ہو گی۔ پھر تو جناب اللہ دے اور بندہ لے! آپے سے باہر ہو گئی وہ! اور کہنے لگی کہ کرپان سے پیٹ پھاڑ دوں گی فرید احمد کا! اسی سے تو مجھے پتا چلا کہ وہ کرپان چلانا بھی جانتی ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے خوشامد درآمد کر کے اسے ٹھنڈا کیا ورنہ تو وہ اسی وقت کرپان لینے جارہی تھی۔ مجھے بھی اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر اب میں تمہاری چھت پر نظر آیا تو زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

"ارے ظالم تم نے یہ کیا کردیا! اگر اس نے اپنے باپ سے کہہ دیا تو کیا ہوگا؟ وہ تو ویسے ہی آتے جاتے مجھے بڑی خونخوار نظروں سے دیکھتا ہے۔ میں تو میں اس سوار کے بچے سے تو میرے ابا بھی دبتے ہیں۔ تم نے مروا دیا مجھے تو! ارے یہ معاملے بڑے چپ چپاتے نمٹائے جاتے ہیں تاکہ سانپ نکل جانے کے بعد لاٹھی پیٹنے سے کچھ نہ ہو۔ پہلے تو ہمیں کسی بھی طرح اس بلبل کے پر کاٹنے تھے۔ تم نے تو اسے بھٹکا کر اڑا ہی دیا۔ بڑا غضب کیا تم نے پیارے' بڑا غضب کیا!۔ تم تو نرے اناڑی نکلے۔ ارے اس طرح عرض وصل کی عرضیاں منظور ہوتی ہیں!۔ الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔"

"یار! تمہاری تو ہوا شٹ ہونے لگی اتنی سی بات پر! اور ابھی تم اسے اٹھوا لینے کی باتیں کر رہے تھے!" میں نے اسے تپایا۔

"یہ تمہیں اتنی سی بات لگ رہی ہے!۔ کمال کرتے ہو! جسے تم اتنی سی بات کہہ رہے ہو' اس پر تو خون ہو جاتے ہیں خون! بزرگوں نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا ہوتا ہے۔ سوچنے دو مجھے کہ اب کیا کیا جائے اور۔ اور بہتر یہ ہے کہ اب تم یہاں سے کھسک ہی لو! دو چار دن ادھر نہ آنا اور میں بھی اس چھپن چھری کے سامنے نہیں پڑوں گا۔ خدا کرے وہ اپنے باپ کو کچھ نہ بتائے۔"

فرید احمد سے میں نے خاصی تفریح لے لی تھی اور اس کی ساری اکڑ فوں نکل گئی تھی اس لیے میں وہاں سے چلا آیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ ڈیڈی کا اصرار تھا کہ میں اپنے مستقبل کی بہتری کے لیے لندن جانے پر راضی ہو جاؤں۔ وہ تو مجھے ملک سے باہر بھیجنے کی بات کر رہے تھے اور میں دلی تک چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ساتھیوں کو مقدمۂ بغاوت میں دو سال قید کی سزا ہو گئی تھی۔ انہوں نے دلی میں جو ایک درس گاہ جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی تھی اس نے کام شروع کر دیا تھا مگر مولانا کی گرفتاری کی وجہ سے اس کا نظم و نسق ابھی بہتر نہیں ہوا تھا۔ میں اگر ضد پر اڑ جاتا تو یہ مجبوری ڈیڈی کو میری بات ماننی ہی پڑتی اور مجھے اس درس گاہ میں داخل کرا دیتے' لیکن اب میں ان سے زیادہ ضد نہیں کرتا تھا۔ انہوں نے جس طرح میری بے سہارا ماں کو سہارا دیا تھا اور جس طرح مجھے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا' اس کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ میں نافرمانی پر اتر آتا۔ میں ان کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے اپنے دل کے تقاضوں کی بھی خبر تھی۔ کلونت کور کو چھوڑ کر بھلا میں کیسے کہیں چلا جاتا۔ میری اور اس کی

ملاقاتیں جاری تھیں اور اب ملاقاتوں میں گرم جوشی آگئی تھی۔ میرا اور اس کا عشق اب عہد و پیماں کی منزلوں میں داخل ہو چکا تھا۔

دوسری جانب ایک خاص مقصد کے حصول کی خاطر اپنے نانا نواب فرقان علی کی کوٹھی میں بھی میری آمدورفت خاصی بڑھ گئی تھی۔ میرا زیادہ تر وقت انہی کے ہاں گزرتا۔ اپنے گھر کی حیثیت تو اب میرے لیے ایک سرائے کی سی ہو گئی تھی۔ نواب صاحب کی کوٹھی میں اب مجھ سے پردہ بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ میری حیثیت اس گھر کے ایک فرد کی سی ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے ظاہری اخلاق اور تہذیب و شائستگی سے سبھی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ جس گھر میں تین تین جوان لڑکیاں موجود ہوں وہاں ایک اجنبی نوجوان کو بلا روک ٹوک آنے جانے کی اجازت دے دی جائے' مگر وہ زمانہ ایسا ہی تھا۔ جسے ایک بار اپنا کہہ دیا جاتا پھر وہ ہر حال میں اپنا ہی ہوتا تھا پرایا نہیں۔ معزز اور روایتی گھرانوں میں تعلقات اور دوستی کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ جب گھر کے اور افراد موجود ہوتے تو میں رابعہ' زاہدہ اور زیبا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ وہ تینوں بھی محتاط رہتیں مگر انہیں یا مجھے جیسے ہی کوئی موقع مل جاتا ہم اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے۔ یہ بڑا خطرناک کھیل تھا۔ میں الگ الگ ان تینوں ہی غزالانِ خوش خرام و خوش اندام کو آہستہ آہستہ زیر دام لا رہا تھا۔ میں یہ کھیل پورے اعتماد سے کھیل رہا تھا اس لیے کہ اس گھر میں اب میرا اعتبار قائم ہو چکا تھا۔

ان حالات میں دلی سے میرا کہیں جانا' ممکن نہیں تھا مگر ڈیڈی اور ممی کو کس طرح مطمئن کیا جائے' یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اسی دوران میں ایک روز جب میں رات کے وقت نواب صاحب کی کوٹھی سے واپس آیا تو ڈیڈی نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"کیا سوچا تم نے؟" ڈیڈی نے مجھے مخاطب کیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تمہارا سال ضائع ہو جائے۔ اب وقت بہت کم رہ گیا ہے بیٹے! میں نے اس مسئلے کا ایک حل نکالا ہے۔ اگر تم لندن جانا نہیں چاہتے ہو تو علی گڑھ چلے جاؤ! وہاں کا معیارِ تعلیم بھی برا نہیں ہے۔ رہی یہاں دلی کے جامعہ ملیہ میں داخلے کی بات تو میرے خیال میں فی الحال یہ مناسب نہیں ہے' کسی بھی طرح مناسب نہیں! پہلے بھی میں اس سلسلے میں تم سے تفصیلی بات کر چکا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

میں عجب گو مگو کے عالم میں تھا کہ کہوں تو کیا کہوں!

آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا معاملہ ہو رہا تھا۔ اس وقت میری سمجھ میں یہی آیا کہ فی الحال ڈیڈی سے سوچنے کی کچھ مہلت لے لوں اور میں نے یہی کیا۔

"کوئی فیصلہ کرنے میں اتنی دیر نہ لگا دینا کہ داخلوں کا وقت ہی گزر جائے۔" انہوں نے مجھے تاکید کی' پھر بولے۔ "جاؤ اب آرام کرو۔"

ڈیڈی کے کمرے سے نکل کر میں اپنے کمرے میں آگیا۔ میرا ذہن بے حد الجھا ہوا تھا۔ میں اپنے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ اچانک مجھے وہی پُراسرار خوشبو محسوس ہوئی جس سے میں اب مانوس ہو چکا تھا۔ پھر آشنا سرگوشی ابھری۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' تم فی الحال یہیں دہلی میں رہو گے۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ اس پُراسرار نادیدہ وجود نے میری رہنمائی کے لیے پیش گوئی کی تھی۔ اب تک مجھ سے سرگوشیوں میں جو کچھ کہا جاتا رہا تھا' وہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ مجھے اسی لیے یقین سا آگیا کہ پیش گوئی درست ثابت ہو گی۔ ہاں میں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ ایسا کس طرح ممکن ہے؟ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ چند ہی لمحوں میں وہ خوشبو معدوم ہو گئی۔ اب میں اس سے حواس باختہ نہیں ہوتا تھا۔ بڑی حد تک میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا اس لیے میں آرام سے سو گیا۔

دوسرے دن جب میں رات کا کھانا کھا کر نواب صاحب کی کوٹھی جانے والا تھا کہ ڈیڈی آگئے۔ انہیں آج دفتر سے لوٹنے میں خاصی دیر ہو گئی تھی اور ممی فکر مند تھیں۔ ڈیڈی کے آنے سے میں بھی کچھ دیر کو رک گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے ڈیڈی کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نظر آئے تھے اور میں اس کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ ڈیڈی آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو گئے اور ٹانگیں پھیلا دیں۔

"ڈیسوزا!" ممی نے ڈیڈی کو مخاطب کیا۔ "تم آج کچھ الجھے الجھے سے لگ رہے ہو' دیر سے بھی آئے ہو' کیا بات ہے؟"

"بتاتا ہوں' پہلے ایک کپ عمدہ سی چائے پلوا دو۔" ڈیڈی طویل سانس لے کر بولے۔ "اتنے میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"وقت تو خیر کھانے کا ہے مگر تم کہتے ہو تو میں چائے بنوا دیتی ہوں۔" ممی بولیں اور ملازمہ کو چائے بنانے کے لیے کہا۔

"کھانا میں نے صاحب لوگوں کے ساتھ دفتر ہی میں کھا لیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے ڈیڈی لباس تبدیل کرنے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

آج رات میں نے زیبا سے کوٹھی کے عقبی باغ میں ملنے کا وعدہ لے لیا تھا مگر یہاں صورت حال ایسی ہو گئی تھی کہ مجھے رکنا پڑا۔

کچھ دیر بعد جب ڈیڈی لباس تبدیل کر کے آگئے تو چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ممی سے بولے۔ "میرے کپڑے اور دیگر ضروری سامان تمہیں سوٹ کیس میں رکھنا ہے اور ہولڈال بھی اسٹور سے نکلوانا ہے۔"

"وہ کیوں بھئی؟ کیا تم کہیں جا رہے ہو؟۔ کہیں باہر؟" ممی نے پوچھا۔

"ہاں۔" ڈیڈی نے جواب دیا۔ "مجھے فوری طور پر کلکتے بھیجا جا رہا ہے۔ وہاں مجھے کم از کم دو ہفتے تو لگ ہی جائیں گے۔ کل ہی صبح مجھے روانہ ہونا ہے۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے!۔ چلے جاؤ۔" ممی نے کہا۔

"سرکاری ذمے داریاں تو خیر اپنی جگہ ہیں' انہیں تو خیر میں کسی طرح بھگت ہی لوں گا۔ مجھے اصل پریشانی اس کی طرف سے ہے۔" ڈیڈی نے میری طرف اشارا کیا۔

"وہ کیوں ڈیڈی؟" میں بول اٹھا۔

"تمہارے داخلے کا مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا نا! کل بھی میں نے تم سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ وقت اب کم رہ گیا ہے اور ایسے موقع پر مجھے مجبوراً کلکتے جانا پڑ رہا ہے۔"

"میری طرف سے آپ قطعی فکر نہ کریں ڈیڈی! جب تک آپ کلکتے سے لوٹ کر آئیں گے' میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر چکا ہوں گا۔" میں نے انہیں اطمینان دلایا۔

"ٹھیک ہے' لیکن میرے آنے کے بعد تم ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کرو گے!"

"بہتر ہے۔" میں سعادت مندی سے بولا۔ اس وقت میرے ذہن میں وہ سرگوشی گونج رہی تھی جو میں نے گزشتہ رات سنی تھی۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے پہلے سے یقین تھا۔ پندرھویں دن ڈیڈی کا تار ملا کہ ابھی وہ دہلی نہیں آسکتے۔ حکومت کی طرف سے انہیں مزید ایک مہینے کلکتے میں رکنے کے احکام مل گئے تھے۔ اسی میں داخلوں کا وقت گزر گیا۔ ممی نے ایک آدھ بار دبی دبی زبان میں اس سلسلے میں کہا بھی مگر میں ٹال گیا۔

عظمت علی نے اس دوران جامعہ ملیہ میں داخلہ لے لیا تھا کیوں کہ وہ دہلی کی رنگینیاں چھوڑ کر علی گڑھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ یوں بھی بس وہ خانہ پُری کے لیے پڑھ رہا تھا کہ نواب

خاندان کا فرد ہو کر جاہل نہ کہلائے۔ پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اس کے سارے مشغلے وہی تھے جو فکرِ معاش سے آزاد کسی رئیس گھرانے کے فرد کو لاحق ہو سکتے ہیں۔ میں بھی چاہتا تو جامعہ ملیہ میں داخلہ لے سکتا تھا' لیکن ڈیڈی کی مرضی کے بغیر میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنا ایک تعلیمی سال ضائع ہو جانے پر افسوس تو تھا مگر ڈیڈی کی ناراضی منظور نہیں تھی۔ جامعہ ملیہ میں داخلہ لینے کو وہ صاف صاف منع کر چکے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی وجہ ان کی سرکاری ملازمت بھی تھی۔ یہ جامعہ ایک ایسے شخص کے نام سے منسوب تھی' مسلمانوں کے لیے اس کی بنیاد ایک ایسے شخص نے ڈالی تھی جو انگریز کی حکومت کا باغی تھا اور جو بغاوت کے ہی الزام میں سزا بھگت رہا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز حکمراں بوکھلا گئے تھے۔ مولانا حسرت موہانی مکمل آزادی کا نعرہ بلند کر چکے تھے۔ انگریز اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ ظلم و تشدد کر کے آزادی کے حق میں اٹھنے والی آوازوں کو دبا دیں گے۔ انہیں یہ گمان تھا کہ ہندوستان کے رہنما قید و بند کی صعوبتوں سے تنگ آ کر ہتھیار ڈال دیں گے' مگر یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ ایسا نہیں ہوا انہوں نے جیل جانا قبول کر لیا مگر آزادی کا سودا نہیں کیا۔

ان دنوں ہندوستان بھر کے تقریباً تمام ہی بڑے بڑے رہنما قید کر دیے گئے۔ ان میں مسلمان رہنماؤں کی اکثریت تھی۔ مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی' مولانا حسرت موہانی' مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی قید تھے اور جو ابھی زیرِ دام نہیں آسکے تھے ان کے لیے کوششیں جاری تھیں۔ کچھ پر مقدمات چلا کر سزائیں سنائی جا چکی تھیں اور کچھ پر مقدمات چلائے جا رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک رہنما تحریر و تقریر کا بادشاہ تھا مگر زبان و قلم پر لگائی جانے والی پابندیوں نے ان کے حوصلے اور مضبوط کر دیے۔

کلکتے میں بھی بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی کلکتے ہی میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ ڈیڈی کا شمار کیوں کہ اعلیٰ سرکاری افسران میں ہوتا تھا اس لیے مجھے شبہ تھا کہ وہ انہی مقدمات کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے ثبوت فراہم کرنے کے لیے وہاں بھیجے گئے ہیں۔ اس شبے کے سبب مجھے اپنے آپ پر ندامت سی تھی۔ یہ احساس میرے لیے باعثِ ندامت تھا کہ میں جس شخص کو ڈیڈی کہتا ہوں اور جس نے میری پرورش کی ہے' وہ شخص ظالم حکمرانوں کا آلۂ کار بنا ہوا تھا۔ ہاں ڈیڈی کے کلکتے جانے اور خلافِ توقع وہاں رک جانے کی وجہ سے میں ابھی تک دہلی ہی میں تھا۔ مجھ سے پہلے ایک طرح پُراسرار وجود نے جو پیش گوئی کی تھی کہ تم فی الحال دہلی ہی میں رہو گے' یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی تھی۔ یہی میری خواہش بھی تھی اور میری محبوبہ کلونت کور بھی یہی چاہتی تھی۔

کچھ تو ممی ڈیڈی کا دل رکھنے کی خاطر اور کچھ یہ سوچ کر کہ میرا ایک تعلیمی سال ضائع ہو گیا ہے میں نے دن کا کچھ وقت حصولِ علم میں لگا دیا تھا۔ ابتدائی تعلیم بھی میں نے گھر ہی پر ٹیوٹرز کے ذریعے حاصل کی تھی۔ اب میں نے پھر یہ سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ممی اس سے خوش ہو گئیں کہ میں اپنی تعلیم کی طرف سے غافل نہیں ہوں۔ کسی درس گاہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بجائے گھر پر ٹیوٹرز کے ذریعے پڑھنے میں اخراجات خاصے تھے مگر ممی کی پیشانی پر بل نہیں پڑا۔ وہ بہ خوشی یہ اخراجات برداشت کرنے پر راضی ہو گئیں۔ یوں بھی بچپن سے انہوں نے مجھے پیسے کے معاملے میں تنگ دست نہیں رکھا تھا۔ میری جیبیں ہمیشہ بھری رہتی تھیں۔ میری ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ گھر پر پڑھنے سے میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ڈیڈی جب کلکتے سے لوٹ کر آئیں تو انہیں میرے تعلیمی سال کے ضائع ہو جانے کا زیادہ رنج نہ ہو۔ پھر یہی ہوا' ڈیڈی جب تقریباً دو ماہ بعد کلکتے سے لوٹ کر آئے تو انہوں نے میرے اس اقدام کو بہت سراہا اور کہا کہ تم اپنی تعلیمی استعداد بڑھاؤ' میں کوشش کروں گا کہ تمہیں براہِ راست سیکنڈ ایئر میں داخلہ مل جائے۔ مسلم اورینٹل کالج علی گڑھ کے انگریز پرنسپل تک میری رسائی مشکل نہیں ہے۔ میں خود تمہارے ساتھ علی گڑھ چلوں گا اور میرے خداوند نے چاہا تو اگلے سال سیکنڈ ایئر میں تمہیں داخلہ مل جائے گا۔

میں اب تک نام ہی کا مسلمان تھا۔ مجھے اپنے مذہب کی بنیادی باتوں تک کا علم نہیں تھا۔ عربی' فارسی اور اردو پڑھنے کے لیے میں نے ایک الگ ٹیوٹر رکھ لیا تھا۔ اسی کے ساتھ میں اسلامی تاریخ کا مطالعہ بھی کرنا چاہتا تھا' مگر وہ میری اگلی منزل تھی کیوں کہ اسلامی تاریخ کی زیادہ تر کتابیں' عربی' فارسی اور اردو ہی میں تھیں اور یہ تینوں زبانیں ابھی میں سیکھ رہا تھا۔ یا تو یہ میری رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کا اثر تھا یا پھر اپنے استادوں کے بہ قول میں غیر معمولی ذہین طالب علم تھا کہ تینوں نئی زبانیں میں حیرت انگیز تیزی کے ساتھ سیکھ رہا تھا۔

صرف حصولِ علم ہی میں نہیں بلکہ میں کئی جہتوں میں بہ یک وقت انتہائی تیز رفتاری کا ثبوت دے رہا تھا۔ نواب صاحب کی کوٹھی کے تینوں "غزال" اب میرے اشارے پر

چوکڑیاں بھرنے لگے تھے۔ ہر غزال کی خواہش تھی کہ پہلے اسے شکار کیا جائے اور میں ان تینوں ہی کو اب تک چکر دے رہا تھا۔ اسی دوران میں ایک ایسا حیران کن پُراسرار واقعہ رونما ہوا کہ میں اپنے وجود کی گتھیاں سلجھانے میں کچھ اور بھی الجھ گیا۔

یہ ایک بھیگی شام کا واقعہ ہے کہ جب میں نواب صاحب کی کوٹھی میں تھا۔ حسب معمول عظمت علی سے میری شطرنج کی بازی جمی ہوئی تھی کہ زیبا وہاں آگئی اور ٹھنک کر بولی۔ "آپ لوگ باغ میں چلیں اور ہمیں جھولا جھلائیں۔"

میں نے زیبا کی طرف دیکھا۔ غرارہ سوٹ میں وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ اسی دوران میں اس نے مجھے اشارہ کیا۔ عطر بھی اس نے جی بھر کے لگایا تھا' مہک رہی تھی۔

"پگلی ہو گئی ہو کیا! دیکھ نہیں رہیں کہ یہاں زبردست بازی لگی ہوئی ہے!" عظمت علی بساط سے اپنا رخ اٹھا کر چال چلتے ہوئے بولا۔

"اللہ اتنا حسین موسم ہے' آسمان پر بادل گھر گھر کر آرہے ہیں اور آپ ہیں کہ یہاں بند ہیں۔" زیبا ایک ادا سے بولی۔

"گھر میں کوئی اور نہیں ہے جو تم ہمارا بھیجا چاٹ رہی ہو! کسی ملازمہ کو ساتھ لے جاؤ۔ تمہیں بادل گھر گھر کے آنے کی پڑی ہے اور یہاں اپنا بادشاہ گھرا ہوا ہے۔"

"دادی اماں نے ساری ملازماؤں کو باورچی خانے میں بھیج دیا ہے۔ کچھ خبر بھی ہے جناب کہ کڑھائی چڑھنے والی ہے۔ گرما گرم پوریاں کچوریاں تلی جانے والی ہیں۔ دادا حضور کا فرمان ہے' کسی اور کا نہیں کہ دادی اماں ٹال جائیں۔"

"لیکن تم تو ٹلو یہاں سے اللہ کی بندی!" عظمت علی بولا "رابعہ باجی ہیں' زاہدہ باجی ہیں' ارے کسی کو بھی ساتھ لے جاؤ باغ میں جھولا جھولنے کو!"

اسی وقت میں نے اپنا وزیر آگے بڑھایا اور شہ دی۔

"وہ دونوں اپنے اپنے کمروں میں سو رہی ہیں جناب! سبق پڑھائے جارہے ہیں کہ اسے لے جاؤ' اسے لے جاؤ مگر خود نہیں ٹل کے دے رہے اپنی جگہ سے! دیکھیں اگر آپ لوگوں نے ہمیں زیادہ ستایا ناتو معلوم ہے کہ ہم کیا کریں گے۔ ہم بازی بگاڑ دیں گے!" یہ کہہ کر وہ جھکی اور یوں جھکی کہ میرے سارے جسم میں بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ شاید وہ دانستہ عظمت علی سے قدرے دور اور مجھ سے لگ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے یوں اچانک جھکنے سے میرا سارا وجود خوشبو کے گرداب میں گردش کرنے لگا۔ اس کے جسم کا لمس دیوانہ کر دینے والا تھا' مگر دیوانہ بہ کار خویش ہشیار تھا سو جلد سنبھل گیا۔

میں نے خود پر قابو پانے کے بعد اس کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "سنو! بس چند چالوں کی بات ہے' مان جاؤ! تمہارے بھیا کو مات ہونے والی ہے۔"

"کوئی لوٹ نہیں بچ رہی ہے کہ مات ہونے والی ہے!" عظمت علی نے اکڑ کر کہا۔ "پیدل دوں گا پیدل! بچو وزیر پٹ ہونے والا ہے۔" یہ کہہ کر جوش میں اس نے اگلی چالیں گنے بغیر میرا وزیر مار لیا' پھر چہچہایا "بڑے آئے تھے وزیر سے شہ دینے!"

جس خانے میں میرا وزیر تھا اب وہاں اس کا رخ آگیا تھا۔ اس کے بادشاہ کو چلنے کے لیے کوئی گھر نہیں بچا تھا۔ آگے خود اس کے پیدلوں نے راستہ روک رکھا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے اس کے رخ سے دانستہ اپنا وزیر پٹوایا تھا کہ بادشاہ کو کوئی چال چلنے کی جگہ نہ رہے۔ اگر وہ اگلی چالیں گن لیتا کہ میرا وزیر پیٹ لیا تو کیا صورت ہوگی' پھر اتنا بے بس نہ ہوتا۔

میرا اشارہ پاکر زیبا میرے قریب ہی قالین پر بیٹھ گئی تھی اور میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"چلو مات ہو گئی تمہیں!" میں نے چال چلنے سے پہلے ہنس کر عظمت علی کو مخاطب کیا۔

"اندھی نہیں لگ رہی پیارے! چال چلو۔ تم پورا وزیر کم ہو کھد بڑ کھد بڑ کیا روں گا!" عظمت علی جوابا بولا۔

"اندھی تو لگ بھی گئی جان عزیز! افسوس کہ تمہیں خبر ہی نہیں ہوئی۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا گھوڑا اٹھایا اور بولا۔ "یہ شہ!۔۔ اور یہ مات!"

عظمت علی حق دق رہ گیا' پھر کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا "واقعی اندھی لگ گئی!"

زیبا کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے کہنی سے ٹھوکا دیا اور بولی۔ "اب شرافت سے کھڑے ہو جائیں اور ہمیں باغ میں چل کر جھولا جھلائیں ہم دوسری بازی کھیلنے نہیں دیں گے۔"

"اچھا چلو بابا!" عظمت علی نے بھنا کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "تمہاری وجہ سے میں بازی ہارا ہوں۔" پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "چلو تم بھی اٹھو! ابھی تم نکلو گے نہیں' ایک بازی اور لگے گی۔"

"تین بازیاں ہو چکی ہیں جن میں سے تم دو ہار چکے ہو۔ بس ہو گیا آج کی بازیوں کا فیصلہ! مجھے اب جانے ہی دو۔" میں نے دانستہ مسکرا کر کہا میں جانتا تھا کہ عظمت علی مجھے ہرگز نہیں جانے دے گا۔ انکار سے میرا مقصد محض یہ ظاہر کرنا تھا کہ مجھے ان دونوں کے ساتھ باغ میں جانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

"بالکل نہیں!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "تمہیں رکنا پڑے گا!"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے' میں یہیں ہوں' تم زیبا کو جھولا جھلا کر آجاؤ۔" یہ کہتے ہوئے میں نے زیبا کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس نے مجھ پر آنکھیں نکالی تھیں۔

"اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ میں تمہیں جیت کر چپکے سے کھسک جانے کا موقع دے دوں۔ اٹھو! ساتھ چلو۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"مجبوراً۔" میں ان دونوں کے ساتھ باغ میں آگیا۔ موسم واقعی بہت حسین ہو رہا تھا۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ زیبا نے غلط نہیں کہا تھا۔ بڑے سے ایک پیڑ کی ڈال پر جھولا پڑا تھا۔

"جلدی بیٹھو جھولے میں!" عظمت علی منہ بنا کر زیبا سے بولا۔

"بیٹھتے ہیں بھئی' ایسی بھی کیا آفت ہے!" زیبا اپنا غرارہ سنبھالتی ہوئی جھولے پر بیٹھ گئی۔

عظمت علی اور میں باری باری اسے جھولا جھلانے لگے۔ اسی وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔

"ایسے میں گرم گرم کچوریاں ہوں نا تو مزا آجائے۔" زیبا جھولا جھولتے ہوئے عظمت علی سے بولی۔

میں سمجھ گیا کہ اس بہانے زیبا وہاں سے عظمت علی کو ٹرخانا چاہتی ہے۔

"ہاں واقعی یہ بات تو ٹھیک کہہ رہی ہو تم! میں ابھی کسی ملازمہ سے کہہ کر آتا ہوں کہ ہم باغ میں ہیں' ہمارے لیے کچوریاں لے کر آجائے۔" عظمت علی فوراً بول اٹھا۔ وہ زیبا کے داؤ میں آگیا اور ہلکی ہلکی پھوار میں بھیگتا ہوا کوٹھی کی طرف چل دیا۔ زیبا کو جھولا جھلانے کا "قرض" وہ مجھے سونپ گیا۔

"اور زور سے!۔۔ اور زور سے!" زیبا جھولا جھولتے ہوئے بلند آواز میں بولی۔ اس دوران عظمت علی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے دائیں جانب نظر آنے والے پیڑوں کے پیچھے جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ زیبا اسی لمحے کی منتظر تھی۔ وہ پینگ لے کر واپس آئی تو اس نے دونوں پیر زمین پر ٹیک دیے اور جھولا رک گیا۔ اس کا جسم میرے سینے سے

آلگا۔ میں نہ تو فرشتہ تھا اور نہ پتھر کا بنا ہوا کہ مجھ پر حسین موسم اور حسین جسم کے قرب کا نشہ طاری نہ ہوتا۔ میں نے اسے اپنی دونوں بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

"اُف! یہاں کوئی دیکھ لے گا' چھوڑ دیں ہمیں!" اس کی ترغیبی آواز نے میرا نشہ اور سوا کر دیا۔

ان لمحات میں مجھ پر نہ جانے کیا ایسی بے خودی طاری ہوئی کہ اسے گھسیٹ کر دور گھنے پیڑوں کے پیچھے لے گیا۔ پھر مجھے ہوش نہ رہا کہ وقت کتنا گزر چکا ہے! میں تو اس وقت چونکا جب ارد گرد سے "زیبا!۔ زیبا!" کی صدائیں سنائی دینے لگیں اور اس وقت تو مجھ پر سناٹا بیت گیا جب میں نے سامنے ہی عظمت علی کو آتے دیکھا۔ وہ صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ راہِ فرار مسدود تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" زیبا نے گھبرا کر سرگوشی کی۔ وہ اس قدر گھبرا گئی تھی کہ اسے میری آغوش سے اٹھنے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔

"تم کہہ دینا کہ ٹھوکر کھا کر یہاں گر گئی تھیں اور پھر بے ہوش ہو گئی۔۔۔ اور میں۔۔۔ میں عظمت علی کے جاتے ہی چلا گیا تھا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ۔۔ کہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے فرار ہو جاؤں۔" میں نے بھی جواباً ویسی ہی آواز میں سرگوشی کی۔

میں نے کہنے کو تو زیبا سے کہہ دیا تھا مگر اوسان میرے بھی خطا ہو چکے تھے۔ ہر طرف سے زیبا کو صدائیں لگانے والے قریب سے قریب تر ہوتے جارہے تھے اور عظمت علی تو بے حد قریب پہنچ چکا تھا۔ زیبا خوف اور متوقع رسوائی کے سبب میری آغوش میں سمٹی ہوئی کانپ رہی تھی۔ اب فرار کا وقت گزر چکا تھا۔ زیبا اگر اپنے حواس نہ کھو بیٹھتی تو میں لپک کر کسی قریبی پیڑ پر چڑھ گیا ہوتا۔

میرا دل انتہائی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میرا سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا اسی لمحے مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے وجود کو دہکتے ہوئے انگاروں پر پھینک دیا ہو۔ میں نے گھبرا کر زیبا کو اپنی آغوش سے دور دھکیل دیا اور اس کے منہ سے ڈری ڈری سی چیخ نکل گئی۔

"زیبا!" عظمت علی چیخا اور دوڑ کر پیڑ کی دوسری جانب سے اچانک میرے سامنے آگیا۔

عظمت علی کے سامنے آنے سے چند ہی لمحے پہلے میں خوف زدہ کر دینے والے پُراسرار تجربے سے گزر چکا تھا۔ مجھے اپنا جسم نظر نہیں آرہا تھا۔ میرا جسم غائب ہو چکا تھا۔ میں ایک نادیدہ وجود میں تبدیل ہو گیا تھا۔

میں عظمت علی کو بالکل اپنے سامنے زیبا پر جھکتے دیکھ رہا تھا مگر یقیناً عظمت علی مجھے دیکھنے سے قاصر تھا۔

پھر میں وہاں ایک لمحے بھی نہیں رکا اور تقریباً دوڑتا ہوا پہلے باغ سے اور پھر کوٹھی کی حدود سے نکل گیا۔ اس دوران میں کوٹھی کے ملازمین اور مکین دونوں ہی سے میری مڈبھیڑ ہوئی مگر ان میں سے کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میں حالانکہ ان کے درمیان ہی سے گزرا تھا مگر انہیں نظر نہیں آیا تھا۔

کوٹھی سے نکل آنے کے بعد مجھ پر شدید خوف کا غلبہ ہو گیا۔ میرا جسم جانے کیسے مجھ سے کھو گیا تھا' جدا ہو گیا تھا۔ کیا میرا جسم مجھے اب کبھی واپس نہیں ملے گا؟ کیا میں بھٹکتی ہوئی کوئی آوارہ روح بن گیا ہوں؟ یہ کیا ہو گیا ہے مجھے؟ خوف کے ساتھ ساتھ ہی مجھے اپنی حالت پر انتہائی رنج ہونے لگا۔

اپنے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک مجھے شدید قسم کی ٹھنڈک کا احساس ہوا اور اسی کے ساتھ مجھے میرا جسم واپس مل گیا۔ زندگی میں شاید اتنی خوشی مجھے کبھی نہیں ملی جو اس لمحے محسوس ہوئی۔ میں زور سے ہنس پڑا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ میں اس شخص کی پروا کیے بغیر ہی اپنی ہی دھن میں مست تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

گھر پہنچ کر بھیگے ہوئے کپڑے تبدیل کر کے جب میں اپنے کمرے میں آگیا تو گزرے ہوئے دہشتناک واقعے کے متعلق سوچنے لگا۔ کسی بھی طرح یہ عقل میں آنے والی بات نہیں تھی۔ میں یہ سوچ کر فکر مند ہو گیا کہ اگر پھر کبھی ایسا ہو گیا اور میرا جسم مجھے واپس نہ ملا تو کیا ہو گا؟

"ایسا نہیں ہو گا۔" میرے کانوں میں ایک مانوس سرگوشی ابھری اور میرا کمرا خوشبو سے مہکنے لگا۔ "تم سے کہا گیا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم پر خود تمہارے وجود کے اسرار کھلتے جائیں گے' سو یہ اسرار کھل رہے ہیں۔ ان سے خوف زدہ یا ملول ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں تو اس پر خوش ہونا چاہیے کہ قادرِ مطلق نے تمہارے حیرت انگیز وجود کو ایسی خوبیوں سے مالا مال کیا ہے جو دوسرے انسانوں کو میسر نہیں۔ شکر بجا لاؤ اس کا کہ جو ہر شے پر قادر ہے۔ تمہارے وجود میں جو پُراسرار قوتیں پوشیدہ ہیں' وہ رفتہ رفتہ ہی تم پر ظاہر ہوں گی اور ایک دن ایسا بھی آئے گا جب یہ تمام تر قوتیں تمہارے ارادے کی پابند ہو جائیں گی۔ اس دن کا انتظار کرو کہ وہ دن ابھی آیا نہیں۔" انہی الفاظ کے ساتھ سرگوشیاں بند ہو گئیں اور مانوس خوشبو بھی میرے کمرے

سے غائب ہو گئی۔

میں جس حالت میں بیٹھا تھا دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا اور میری سماعت میں وہی سرگوشیاں گونجتی رہیں جو اب معدوم ہو چکی تھیں۔ کیا واقعی میں دنیا میں رہنے والے تمام انسانوں سے مختلف ہوں' یہ خیال میرے اندر ایک احساس تفاخر پیدا کرنے لگا۔ مجھے تصویر کا دوسرا رخ نظر آنے لگا مجھ سے کہا گیا تھا کہ میرے وجود میں پُراسرار قوتیں پوشیدہ ہیں' قادرِ مطلق نے مجھے بڑی خوبیوں سے مالا مال کیا ہے۔ اگر میں بذاتِ خود ایک پُراسرار تجربے سے نہ گزر چکا ہوتا تو شاید مجھے ان سرگوشیوں پر اتنا یقین نہ آتا۔

"میں عام انسانوں سے مختلف ہوں۔" میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا "میں ان سے برتر ہوں۔ مگر کیوں؟ ایسا کیوں ہے؟ وجہ کیا ہے اس کی؟" بڑبڑاتے بڑبڑاتے میں خود ہی چپ ہو گیا میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

پھر میں اپنے گزرے ہوئے اس پُراسرار واقعے پر غور کرنے لگا۔ میں ایک یقینی رسوائی اور ممکنہ ذلت سے بچ گیا تھا۔ زیبا کو میری آغوش میں دیکھ لیا جاتا تو یقیناً آئندہ نواب صاحب کی کوٹھی میں قدم نہ رکھ پاتا۔ پھر جو کچھ میں نے سوچا تھا پورا نہ ہوتا۔ ان سنسنی خیز لمحات کے بارے میں سوچتے ہوئے اچانک میرے اندر سرخوشی کی ایک لہر پیدا ہونے لگی۔ میں ایک اور ہی نہج پر سوچ رہا تھا۔ اگر میری یہ اہلیت میرے ارادے اور خیال کی پابند ہو جائے یعنی میں جب نظر آنا چاہوں' نظر آؤں اور جب چاہوں نظر نہ آؤں تو کیا صورت پیش آئے گی؟ پھر تو میں بلا روک ٹوک جہاں چاہوں گا آجا سکوں گا۔ کوئی مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔

پہلا خیال مجھے کلونت کور کا آیا کہ میں بلا جھجک اس کے گھر میں داخل ہو رہا ہوں۔ مجھے یہ پروا نہیں کہ گھر میں کون کون موجود ہے' میں سب کے سامنے اس کا ہاتھ تھام کر اسے ایک طرف لے جاتا ہوں اور ــــ اور اس سے خراجِ محبت وصول کرنے لگتا ہوں۔ صفحۂ ذہن پر ابھرنے والے اس لذت انگیز منظر نے مجھ پر بے خودی سی طاری کر دی۔ پھر میرے

خیال کی رَو زیبا' زاہدہ اور رابعہ کی طرف منتقل ہو گئی۔ دوسرا سکون بخش منظر میرے ذہن میں ابھرا۔ خوشبو میں بسی ہوئی زیبا محوِ خواب ہے۔ میں اس کی خواب گاہ میں داخل ہوتا ہوں' اسے جگاتا ہوں اور اپنے سے قریب کر لیتا ہوں۔ اسی وقت کمرے میں کوئی داخل ہوتا ہے۔ یہ زیبا کی ماں ہے' مگر میں نظر نہیں آتا۔ وہاں سے میں رابعہ کے پاس پہنچتا ہوں۔ وہ اپنی دادی کے کمرے میں ہے اور وہاں گھر کے دیگر افراد بھی موجود ہیں لیکن میں نہیں ڈرتا اور رابعہ کے قریب پہنچ جاتا ہوں۔ میں اس کے کان میں سرگوشی کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ کمرے سے باہر آجاتی ہے۔

اس روز میں نے اپنی چشمِ تصور سے بہت حسین منظر دیکھے۔

دوسرے دن صبح کے وقت مجھے کلونت کور سے نہیں ملنا تھا۔ ہفتے بھر میں اس سے بس دو تین روز ہی ملاقات ہو پاتی تھی۔ دوپہر کے بعد میرے ٹیوٹرز آجاتے تھے جو تقریباً شام تک مجھے پڑھاتے تھے عموماً میں شام کے وقت ہی نواب صاحب کی کوٹھی کا رخ کرتا تھا لیکن گزشتہ روز جو واقعہ پیش آیا تھا' اس نے میرے اندر تجسس پیدا کر دیا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس واقعے کا گھر والوں پر کیا ردِ عمل ہوا اور میرے وہاں سے غائب ہو جانے کے بعد زیبا پر کیا گزری؟ میں نے اسی لیے ناشتا کرتے ہی نواب صاحب کی کوٹھی کا رخ کیا۔ مجھے علم تھا کہ اس وقت عظمت علی نہیں ہو گا اور وہ [illegible] گیا ہو گا مگر اب کوٹھی میں اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ گھر کے دوسرے افراد بھی مجھ سے خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔

کوٹھی میں قدم رکھتے ہی مجھے ایک ملازمہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ زیبا کی طبیعت خراب ہے اور اسے بخار آگیا ہے۔

وہ بڑی کوٹھی چار حصوں میں تقسیم تھی۔ اس کا ایک حصہ بڑے نواب صاحب' یعنی میرے نانا نواب فرقان علی اور میری نانی کے لیے مخصوص تھا۔ دوسرے حصے میں بڑے ماموں نواب زادہ عرفان علی رہتے تھے۔ دائیں جانب والے حصے میں چھوٹے ماموں نواب زادہ غفران علی کی سکونت تھی۔ کوٹھی کا بیرونی حصہ مردانہ کہلاتا تھا جس سے ملحق مہمان خانہ تھا۔ اس مہمان خانے کو مردانے حصے ہی میں شمار کیا جاتا تھا۔ کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہونے کے بعد دائیں جانب سرونٹ کوارٹرز کے سامنے گھاس کے بڑے بڑے قطعے تھے۔ گھاس کے ان قطعوں اور باغ کے درمیان سڑک تھی جو کوٹھی تک جاتی تھی۔

ملازمہ سے جب مجھے زیبا کی علالت کے بارے میں معلوم ہوا تو میں کوٹھی کے اس حصے کی طرف چل دیا جو میرے بڑے ماموں نواب زادہ عرفان علی اور ان کے اہل و عیال کے لیے مخصوص تھا۔ میں کیوں کہ بڑے ماموں ہی کے بیٹے عظمت علی کا دوست تھا۔ اس لیے بڑے ماموں مجھ سے کچھ زیادہ ہی شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ عموماً نواب خاندانوں کا یہ اصول تھا کہ جب اولاد جوان ہو جاتی تھی تو اسے الگ کمرا دے دیا جاتا تھا۔ زیبا جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکی تھی اور اس کی بڑی بہن زاہدہ بھی! اس لیے ان دونوں کے کمرے الگ الگ تھے۔

میں کوٹھی کے اس حصے میں پہنچا ہی تھا کہ سامنے سے بڑے ماموں آتے دکھائی دیے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ ہر وقت اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی وہ اسی "مشغلے" میں مصروف آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی مونچھیں نکیلی اور اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں جنہیں وہ بل پہ بل دے کر اور نکیلا بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ ظاہر ہے نواب زادے تھے' ان کی مونچھیں کیسے نیچی ہو سکتی تھیں لیکن انہیں کیا معلوم کہ ان کی مونچھوں کو نیچا کرنا ہی میرا مقصدِ حیات تھا۔ ان ہی مونچھوں کے بل نے تو میری ماں کو گھر سے بے گھر کیا تھا۔ بڑے ماموں بھی تو ان تین افراد میں شامل تھے جو میری ماں کو قتل کر دینا چاہتے تھے' انہیں قبر میں اتار دینے کے خواہش مند تھے۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو میں اس عالمِ رنگ و بُو میں آنکھیں نہ کھول پاتا۔ انہی احساسات و جذبات کے سبب جب بھی میری ماں کے ان تینوں مجرموں میں سے کوئی میرے سامنے آجاتا تھا تو میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ میں بہ مشکل خود پر قابو پانے میں کامیاب ہوتا تھا۔ ابتدا میں یہ صورتحال میرے لیے امتحان کی سی حیثیت رکھتی تھی مگر رفتہ رفتہ میں اس کا عادی ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی بڑے ماموں کے چہرے پر نظر پڑتے ہی لمحہ بھر کو مجھے طرارہ سا آیا لیکن میں سنبھل گیا۔ انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور قریب آکر رک گئے تھے۔

"آداب!" میرا ہاتھ پیشانی کی طرف اٹھ گیا۔

"جیتے رہو!" انہوں نے اپنی بھاری آواز میں مجھے دعا دی' پھر چٹکی سے مونچھ کو بل دیتے ہوئے کہنے لگے۔ "میاں سنا ہے تم بھی کل یہیں باغ میں تھے۔ غالباً عظمت میاں ہمیں بتا رہے تھے۔ پھر تم کہاں چلے گئے تھے؟ ملازمین میں سے بھی کسی نے تمہیں کوٹھی سے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ حد تو یہ ہے میاں کہ کوٹھی کے پھاٹک پر موجود چوکیدار کی نظر بھی

تم پر سیں پڑی۔ ہاں برخوردار زیبا کا کہنا یہ ہے کہ تم باغ سے عظمت میاں کے جاتے ہی چلے گئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر قصہ کیا ہوا!"

بڑے ماموں کی باتوں سے مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ گزشتہ روز جو واقعہ پیش آیا تھا' اس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے خاصی تحقیق و جستجو کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس واقعے سے لاعلمی کا اظہار کرنا تھا اس لیے فوراً ہی بولا۔

"جی ہاں' میں تو عظمت کے جاتے ہی چلا گیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ میں خاصی تھکن محسوس کر رہا تھا اور عظمت مزید ایک بازی کھیلنے کی ضد کر رہے تھے۔ ہم دونوں تین بازیاں کھیل چکے تھے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ شطرنج کی تین بازیاں ذہنی طور آدمی کو کس قدر تھکا دیتی ہیں' مگر واقعہ کیا ہے؟ آپ کچھ متجسس نظر آ رہے ہیں۔"

چہرے سے ہی بڑے ماموں پہنچے ہوئے "فقیر" لگتے تھے۔ جوانی میں شاید انہوں نے بھی ایسی بہت سی "بازیاں" کھیلی تھیں۔ وہ غالباً اسی لیے مجھے ٹٹولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں شاید مجھ پر شک ہو گیا تھا۔ کسی جوان لڑکی کا اتنی دیر کے لیے بے پتا ہو جانا' پہلے سے وہاں ایک نوجوان کا موجود ہونا اور پھر کسی کی نظر میں آئے بغیر اس نوجوان کا غائب ہو جانا' ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں ایسی نہیں تھیں کہ صرف لڑکی کے بیان پر اکتفا کر لیا جاتا۔

میری بات کے جواب میں بڑے ماموں نے گہری نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ جیسے چہرے سے اندازہ لگانا چاہتے ہوں کہ واقعی مجھے کچھ معلوم نہیں یا انہیں بے وقوف بنانے کے لیے "بھولا بادشاہ" بنا ہوا ہوں۔ پھر وہ بولے۔ "تم نے ٹھیک کہا میاں' ہم واقعی متجسس ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کوٹھی کی حدود میں پہلے کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہم ابھی تک اس گتھی کو سلجھا نہیں پائے۔" یہ کہتے ہی انہوں نے اچانک سوال کر دیا۔ "برخورداری زیبا کو جب ٹھوکر لگی تو کیا تم نے اسے نہیں سنبھالا؟"

سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ اگر میں پہلے سے چوکنا اور محتاط نہ ہوتا تو یقیناً مجھ کھا جاتا۔ میں نے اسی لیے بلا جھجک فوراً جواب دے دیا۔ "کب اور کہاں ٹھوکر لگی انہیں؟ میں تو انہیں جھولا جھولتے ہوئے چھوڑ گیا تھا! ابھی جب میں یہاں آیا ہوں تو ایک ملازمہ نے البتہ یہ ضرور بتایا ہے کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ میں انہی کی عیادت کے لیے جا رہا تھا۔ ٹھوکر لگنے سے کہیں چوٹ تو نہیں آئی انہیں؟"

"میاں' بات یہ ہے کہ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے' آگے پیچھے دیکھ کر نہیں چلا جاتا۔ ٹھوکریں کھانے ہی کی عمر ہے یہ" ان کا لہجہ معنی خیز تھا اور نظریں اب تک میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میری طرف سے ان کے دل میں شک کی گرہ پڑ چکی ہے۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا "کل شام یہاں کیا واقعہ رونما ہوا' اگر تمہارے علم میں نہیں تو ابھی معلوم ہو جائے گا۔ تم عیادت کو جا ہی رہے ہو۔ ہمیں ذرا کچہری جانے کی جلدی ہے ورنہ تم سے مزید گفتگو کرتے۔" یہ کہتے ہی وہ آگے بڑھ گئے۔

"جی۔ جی بہتر ہے۔" میں اس کے سوا اور کہتا بھی کیا۔

"اگر تمہارے علم میں نہیں۔" بڑے ماموں کے الفاظ واضح طور پر اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ وہ میری طرف سے ابھی مطمئن نہیں ہوئے۔ میں جب اس قدر محتاط اور چوکنا ہونے کے باوجود انہیں مطمئن نہیں کر سکا تو ظاہر ہے کہ زیبا ان کی جرح کے آگے کہاں ٹھہر پائی ہو گی۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ ساری گڑبڑ زیبا ہی کے بیان سے پھیلی ہو گی۔ مجھ پر اسی لیے شک کیا جا رہا تھا۔ حقیقت جاننے کے لیے اب میں تیز قدمی سے زیبا کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

زیبا مجھے کمرے میں اکیلی نہیں ملی۔ بڑی ممانی بھی اس کے پاس تھیں۔ زیبا کی چار سالہ بہن بھی اپنی ماں کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا انہیں؟" میں نے بڑی ممانی کو آداب کرنے کے بعد پوچھا۔

میری آواز سن کر زیبا نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ میرے آنے سے پہلے بند کیے پڑی تھی۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے اپنے سینے پر پڑا ہوا دوپٹا درست کیا۔ ممانی مجھے دیکھ کر جواباً بولیں۔ "بخار آ گیا ہے۔ یہ سب کل بارش میں بھیگنے کا نتیجہ ہے۔"

بڑے ماموں کی نسبت ممانی سیدھی تھیں۔ میں نے ان سے جو کچھ پوچھا انہوں نے صاف صاف بتا دیا' پھر زیبا کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار دیکھنے لگیں۔

ہوا یہ تھا کہ جب عظمت لوٹ کر باغ میں گیا تو اس نے زیبا کو وہاں نہیں پایا جہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے ہم... کو پہلے خود ہی ادھر ادھر تلاش کیا' پھر کوٹھی میں جا کر دونوں کی گمشدگی کے بارے میں بتا دیا۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ بڑے ماموں کے کانوں تک بات پہنچ گئی۔ پھر تو ذرا سی دیر میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے گھر کے سارے ملازمین کو تلاش میں لگا دیا اور خود بھی باغ میں پہنچ گئے۔ عظمت

بھی وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ بڑے ماموں نے باغ میں شکار کا سماں باندھ دیا۔ جس طرح جنگل میں شیر کا ہانکا ہوتا ہے' انہوں نے اسی طرح باغ میں ملازمین کو پھیلا دیا اور انہیں ہر طرف سے آگے بڑھتے ہوئے وہاں پہنچنے کی تاکید کی جہاں جھولا پڑا ہوا تھا۔ خود وہ اور عظمت علی بھی اس "ہانکے" میں عملی طور پر حصہ لے رہے تھے۔ پھر "شیر" تو نکل گیا' اس کی "دُم" رہ گئی۔

عظمت علی اپنی بہن کی ذری ذری چیخ سن کر ہی اس تک پہنچا تھا اور پھر بڑے ماموں اور ملازمین بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ ممانی نے جس طرح یہ واقعہ بیان کیا' اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ بڑے ماموں نے پہلے ہی سے اپنے ذہن میں کوئی بات فرض کر لی تھی۔ بہ قول ممانی کے' بڑے ماموں نے زیبا سے پہلا سوال میرے ہی بارے میں کیا تھا کہ میں کہاں گیا؟ بدحواسی میں زیبا نے کہہ دیا کہ مجھے نہیں معلوم' اس کے بعد زیبا کو کوٹھی میں بھیج دیا گیا اور میری تلاش شروع ہو گئی۔ اسی دوران میں کوٹھی کے تمام ہی ملازمین حتیٰ کہ چوکیدار اور مالی سے بھی پوچھ گچھ کی گئی۔ کسی نے مجھے دیکھا ہوتا تو کچھ بتاتا بھی۔ بعد میں زیبا نے میری پڑھائی ہوئی پٹی کے مطابق جو کہانی سنائی' اس پر بڑے ماموں نے بہت بحث کی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب میں پہلے ہی وہاں سے چلا گیا تھا تو "مجھے نہیں معلوم" کیوں کہا؟ زیبا کا خوف زدہ انداز میں چیخ اٹھنا بھی اس کہانی کو جھوٹ ثابت کر رہا تھا۔ وہ اگر بے ہوش ہی ہو گئی تھی تو بے ہوشی کے دوران میں اس کی چیخ کیسے نکلی؟ یا اگر وہ پہلے ہی ہوش میں آ چکی تھی تو وہاں سے اٹھی کیوں نہیں؟ پکارنے والوں کی صداؤں کا اس نے جواب کیوں نہیں دیا؟ میں نے جب گھبرا کر زیبا کو اپنی آغوش سے دور دھکیل دیا تو اس کے منہ سے ذری سی چیخ نکلی تھی۔ زیبا کے پاس باپ کے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے وہ چیخنے سے صاف مکر گئی تھی۔ اس نے صرف یہ بتایا تھا کہ جب میں چلا گیا تو وہ موسم کا لطف لینے کی غرض سے باغ میں ٹہلتی ہوئی ایک طرف نکل گئی اور کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آنے پر اس نے عظمت علی کو اپنے قریب دیکھا۔ زیبا کے بیان کو غلط ثابت کرنے کے لیے بڑے ماموں نے اس جگہ کا ایک بار پھر تفصیلی جائزہ لیا تھا جہاں گھنے پیڑوں کے درمیان وہ میری آغوش کی زینت بنی تھی۔ وہاں زمین پر پڑی ہوئی کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے زیبا کو ٹھوکر لگ سکتی ہو۔ پھر باغ سے لوٹ کر آنے کے بعد انہوں نے زیبا کے سر کا "معائنہ" بھی کیا تھا۔ سر پر چوٹ کا کوئی خفیف سا نشان بھی نہیں تھا۔ ممانی سے بڑے ماموں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ صرف ٹھوکر کھا کر کسی کا بے ہوش ہو جانا قطعی ممکن نہیں ہے۔ زیبا جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کی زبان کھلواؤ۔ ورنہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا! اب تک زیبا اپنے اسی بیان پر اڑی ہوئی تھی' مگر باپ کے خوف سے اسے بخار آ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے بھی بڑے ماموں وہیں ہو کر گئے تھے اور ممانی سے پوچھا تھا کہ زیبا نے زبان کھولی یا نہیں؟ باپ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی یقیناً زیبا سوتی بن گئی تھی۔

ایک تو ماں کی ممتا اور دوسرے سیدھا پن! ممانی نے اسی لیے مجھے ایک ایک بات بتا دی تھی' یہ خیال کیے بغیر کہ اس معاملے کا ایک فریق خود میں بھی تھا۔ وہ تو مجھ سے الٹی اپنے شوہر کی شکایت کر رہی تھیں۔ "وہ تو شروع سے بال کی کھال نکالنے کے عادی ہیں۔ ہیں ہی ابتدا سے شکی مزاج! اتنی سی بات پر بچی کی جان آدھی کر دی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ بیٹے کہ جب اور کوئی بات ہی نہیں تو یہ غریب کیا کہے؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی' ممانی کی وہاں موجودگی کے سبب میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں زیبا سے کہہ دیا کہ وہ اپنے بیان پر اڑی رہے۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اقرار میں سر ہلا دیا۔

پھر میں وہاں مزید نہیں رکا۔ بڑے ماموں کا رویہ اب میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ زیبا کے غیر منطقی بیان نے انہیں میری طرف سے شک میں ڈال دیا تھا۔ کوٹھی سے نکلتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ اب کم از کم چند روز ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔ خود کو خواہ مخواہ آزمائش میں ڈالنا فضول تھا۔ میں وہاں آتا جاتا رہتا تو بڑے ماموں مجھے کریدتے رہتے۔

میری توقع کے عین مطابق دوسرے ہی روز شام کو عظمت علی خود مجھ سے ملنے آ گیا۔

"یار' تم تو بالکل گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئے! کل شام بھی تم نہیں آئے اور آج بھی میں تمہارا انتظار کرتے کرتے تھک کر خود آیا ہوں۔ آج تو ابا جان بھی تمہیں پوچھ رہے تھے۔" عظمت علی کا دل میری طرف سے بالکل صاف ہے' یہ اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"حیرت ہے کہ تمہارے ابا جان مجھے پوچھ رہے تھے!" میں بولا "حالانکہ انہی کے رویے کی وجہ سے میں نے کوٹھی میں آنا جانا ترک کیا ہے۔"

"تمہارا بھی جواب نہیں یار! وہ تو ہر بات کے پیچھے پڑ

جاتے ہیں۔ ابھی تک انہوں نے زیبا کی جان نہیں چھوڑی۔ اماں بھی سخت پریشان ہیں۔ ایسے میں وہاں جی بولائے گا کہ نہیں! اس پر یہ کہ تم بھی قلعہ بند ہو کے بیٹھ گئے اپنے گھر میں! اسے یاری نہیں کہتے پیارے! اپنا تو اصول یاری میں یہ ہے کہ یار پر مکمل اعتماد کرو۔ میں تم پر پورا اعتماد کرتا ہوں۔"

"مجھے اس سے کب انکار ہے کہ دوست ہر حال میں دوست رہتے ہیں' ان کی خوشیاں اور غم مشترک ہوتے ہیں' مگر تم ہی سوچو کہ جب اس فضا میں شکوک اور شبہات کا زہر گھلنے لگے تو دل پر کیا گزرے گی!"

"شکوک و شبہات کا زہر! کیا مطلب ہے تمہارا؟ کس نے تم پر شک کیا؟"

"تمہارے ابا جان نے" یہ کہہ کر میں نے عظمت علی کو مختصراً اس گفتگو سے آگاہ کر دیا جو میرے اور بڑے ماموں کے درمیان ہوئی تھی۔ میں نے عظمت سے کہا۔ "اور تم تو خود اس بات کے گواہ ہو کہ میں تم لوگوں کے ساتھ باغ میں نہیں جا رہا تھا۔ تم خود ہی زبردستی مجھے اٹھا کر لے گئے تھے۔"

"اب سمجھ میں آیا کہ ابا جان مجھ سے بھی تمہارے بارے میں اتنی پوچھ گچھ کیوں کر رہے تھے! یہ تو واقعی بڑے افسوس کی بات ہے۔ انہیں تو اس انداز میں سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ زیبا تو بہت معصوم ہے جیسی وہ میرے لیے ویسی تمہارے لیے!"

میرے جی میں تو آئی کہ میں عظمت علی کے اس خیال کی فوری تردید کر دوں مگر مصلحت آڑے آ گئی۔ ذرا توقف سے عظمت علی مجھ سے پھر مخاطب ہوا۔ "ویسے دوست کی حیثیت سے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ہمارے یہاں آنا جانا ترک نہ کرو۔ اگر ابا جان خوامخواہ تمہاری طرف سے شک میں مبتلا ہو گئے ہیں تو اس سے ان کے شکوک و شبہات کو اور بھی تقویت ملے گی۔ وہ یہی سوچیں گے کہ تمہارے دل میں واقعی خدانخواستہ کوئی چور ہے اسی لیے تم نے آمد و رفت بند کر دی۔"

عظمت علی کی یہ بات میرے دل کو بھی لگی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ میں بولا۔ "کہہ تو تم ٹھیک ہی رہے ہو' مگر اس میں کچھ سبکی سی محسوس ہوتی ہے۔ ایسی فضا اور ایسے حالات میں آنا جانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پھر بھی تمہارا مشورہ ہے تو سوچوں گا اس پر!"

"یہ کی نہ تم نے یاروں والی بات! چلو آج اس خوشی میں جی بی روڈ کا ایک پھیرا لگا کر آتے ہیں۔ راستے میں کچھ دیر فرید احمد سے گپ شپ لڑائیں گے اور اسے بھی ساتھ لے لیں

گے۔ اگر موقع لگا تو اس جانِ بہار کے بھی دیدار کر لیں گے جس کے دیدار کو ایک مدت سے آنکھیں ترس گئی ہیں۔" عظمت علی کا اشارہ کلونت کور کی طرف تھا۔ "کم بخت فرید احمد تو کسی طرح اس کے دیدار ہی کرانے پر اب راضی نہیں ہوتا۔"

پہلے بھی عظمت کئی بار مجھ سے جی بی روڈ چلنے کا کہہ چکا تھا' مگر میں ٹال گیا تھا حسن کو سربازار سجا دیکھنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس روز بھی میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی' لیکن وہ نہیں ٹلا۔ یوں بھی وہ ایک بڑے اور معزز خاندان کا فرد تھا جہاں ایسی باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتیں۔ ایسے معزز خاندانوں میں یہ بیماری عام تھی کہ ادھر لڑکے بالوں نے جوانی کی حدود میں قدم رکھا' ادھر بازارِ حسن کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ کچھ اعلیٰ خاندانوں میں تو ان ڈیرے دار طوائفوں کے کوٹھے تہذیب و شائستگی اور ادب آداب کی "تربیت گاہ" کا درجہ رکھتے تھے۔ ہرچند کہ کم از کم ننھیال کی طرف سے میرا تعلق بھی ایک نواب خاندان ہی سے تھا مگر آج تک میرا دل اس پر مائل نہیں ہوا تھا۔ میں نے جی بی روڈ کا نام تو سنا تھا لیکن کبھی وہاں گیا نہیں تھا۔ اس لیے مجھے وہاں جانے میں تامل بھی تھا مگر عظمت علی سے مراسم رکھنا میری ضرورت تھی۔ سو بادلِ ناخواستہ میں جی بی روڈ جانے پر آمادہ ہو گیا اور میری رضامندی سے عظمت بہت خوش ہوا۔

ڈیڈی کے آنے سے پہلے ہی میں عظمت کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔ ممی سے میں نے احتیاطاً کہہ دیا تھا کہ میری واپسی میں دیر ہو سکتی ہے۔

فرید احمد ہمیں گھر پر نہیں ملا۔ اس کے چھوٹے بھائی نے ہمیں بیٹھک میں بٹھا دیا اور اسے ڈھونڈنے چلا گیا۔ عظمت علی نے کلونت کور کا ذکر چھیڑ دیا جس سے میں گریز کرنا چاہتا تھا۔ "یار" ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اچانک

فرید احمد نے دیدار یار پر پابندی کیوں لگا دی؟ یہ قبل اس کے کلونت کور نے ایک دن اسے کرپان دکھا کر دھمکی دی تھی کہ اب تم یا تمہارے دوست چھت پر تاک جھانک کرتے نظر آئے تو پیٹ پھاڑ دوں گی۔ تمہاری سمجھ میں آئی ہے یہ بات کہ واقعی کلونت کور ایسی نازک اندام لڑکی نے فرید احمد پر کرپان نکال لی ہو گی اور فرید احمد ایسا دھینگڑی ڈر گیا ہو گا؟ مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔ لگتا ہے کہ فرید احمد اکیلے ہی اکیلے مزے اڑا رہا ہے۔"

"اس لڑکی میں آخر کون سے ایسے لعل جڑے ہیں' جو تم اس پر اتنے لٹوٹ ہو؟"

"ارے ظالم تم تو یہ نہ کہو! تم نے تو اس ستم گر کو دیکھا ہے۔ لگتا ہے کہ تمہارے سینے میں دل ہی نہیں اور اگر ہے تو جذبات سے خالی ہے۔"

"ہاں یار اس کی باتوں میں مت آنا۔ یہ چھپا رستم ہے۔" عقب سے فرید احمد کی آواز آئی۔

کچھ دیر ہم لوگ اسی قسم کی باتیں کرتے رہے انہی خوش گپیوں میں وقت گزر گیا اور مغرب کی اذان ہو گئی۔ اسی کے ساتھ ہم تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب ہم تانگے میں بیٹھ کر جی بی روڈ کی طرف چلے تو راستے میں فرید احمد نے کسی ریحانہ کا ذکر کیا۔ وہ دھیمی آواز میں عظمت علی سے کہہ رہا تھا۔ "بس کچھ ہی دن پہلے وہ آئی ہے۔ منہ بولتا جادو ہے بنگال کا! میں اسے جا کے ایک بار دیکھ آیا ہوں' یہ بڑی بڑی آنکھیں اور یہ بال ہیں ظالم کے۔ آج ادھر ہی بائی کی طرف نہیں چلیں گے۔"

فرید احمد کی بات سن کر میں چونک اٹھا۔ میں تو اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ بازار کا چکر لگا کر آ جائیں گے اور عظمت علی نے ایسی ہی کوئی بات کہی بھی تھی' مگر ان کے ساتھ مجھے کسی طوائف کے کوٹھے پر بھی چڑھنا پڑے گا' یہ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ میں نے فرید احمد کی بات سے یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ وہ دونوں پہلے بھی کوٹھے جھانکتے رہے ہیں اور پرانے پاپی ہیں۔

تانگا اس بازار میں پہنچ کر ایک جگہ رکا تو مجھے یوں لگا جیسے میلا لگا ہو۔ ہر طرف گہما گہمی اور رونق تھی۔ کہیں نوعمر لڑکے مہکتے پھولوں کے ہار لیے ادھر سے ادھر لپک رہے تھے تو کہیں گلوریاں بن رہی تھیں۔ کوئی شیروانی پہنے اکڑا ہوا چلا جا رہا تھا تو کوئی اپنی دھوتی سنبھالے بالکونیوں پر سجے ہوئے چہروں کو دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ سب کے چہروں پر شادابی اور بے فکرا پن تھا۔ کہیں سے طبلہ گمکنے کی آواز آ رہی تھی تو کہیں چھنا چھن گھنگھرو بول رہے تھے۔ میں تو وہاں آ کر جیسے کھو سا گیا۔ تانگے سے اتر کر میں ایک طرف کھڑا ہو کر ساری ہاؤ ہو دیکھ رہا تھا۔

"چلو یار!" اچانک عظمت علی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور میں چونک اٹھا۔

"سنو! بازار کا چکر لگا لیتے ہیں مگر ہم کسی طوائف کے کوٹھے پر نہیں چڑھیں گے۔" میں نے اپنے دل کی بات عظمت علی سے کہہ دی۔

فرید احمد بول اٹھا۔ "گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز! یہ بھی خوب رہی۔ اماں اب یہاں آ ہی گئے ہیں تو کیا ویسے ہی لوٹ جائیں! مجھے خبر نہیں تھی کہ تم اتنے خشکے ہو۔ ریحانہ کو رقص کرتے دیکھو گے تو دل تھام کے رہ جاؤ گے۔" وہ مجھے للچانے لگا۔

پھر میں نے لاکھ چاہا کہ انہیں روک لوں اور خود بھی اوپر نہ جاؤں مگر وہ نہ مانے۔ عظمت علی نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولا۔ "اگر تم نے اب بھی اپنی ضد نہ چھوڑی تو ہم دونوں تمہیں ڈولی ڈنڈا کر کے لے جائیں گے اور خلقِ خدا تمہارا تماشا دیکھے گی۔"

بادلِ ناخواستہ میں ان دونوں کے ساتھ قریبی زینے پر چڑھنے لگا۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہم دائیں جانب مڑ گئے فرید احمد آگے آگے تھا' میں اور عظمت علی اس کے پیچھے تھے۔ چند قدم چل کر فرید احمد ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا جس پر ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔ اندر سے ہارمونیم' سارنگی طبلے اور گھنگھروؤں کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔

"آؤ!" فرید احمد ہماری طرف مڑ کر بولا اور ہاتھ سے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

ہم سب پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گئے۔ میری پہلی نظر اس "شعلۂ رقصاں" پر پڑی جو اس بڑے کمرے کے وسط میں طبلے کی تھاپ پر قیامت جگا رہی تھی۔ فانوس روشن تھے سازندے ایک جانب اندرونی دروازے کے قریب دیوار سے لگے بیٹھے تھے اور اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انہی کے پاس ایک ادھیڑ عمر عورت سامنے بڑا سا نقشین پاندان رکھے "چکالی" کر رہی تھی۔ سفید چاندنی کے درمیان قالین بچھا ہوا تھا۔ اسی قالین پر سرخ ساری میں لپٹا ایک شعلہ رقصاں تھا۔ دونوں جانب دائیں بائیں کی دیواروں سے لگے گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ان گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے تماش بین بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے کچھ فاصلے سے پیک دان رکھے

تھے۔ کمرا خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اکثر تماش بینوں کے ہاتھوں سے خوشبودار پھولوں کے ہار لپٹے ہوئے تھے۔ ان کے لباس بھی معطر محسوس ہو رہے تھے۔

میں ابھی اس کمرے کا تفصیلی جائزہ لے ہی رہا تھا کہ عظمت علی نے مجھے ٹہوکا دیا اور جھک کر پیروں سے جوتے اتارنے لگا۔ فرید احمد ہم سے پہلے ہی جوتے اتار کر دائیں جانب ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں ہم دونوں بھی بیٹھ سکیں۔ میں نے جوتے اتارے اور نرم گدے پر بچھی ہوئی سفید چاندنی پر قدم رکھتا ہوا۔ عظمت علی کے عقب میں بڑھا۔

اس وقت تک وہاں زیادہ تماش بین جمع نہیں ہوئے تھے۔ ہم جہاں بیٹھے تھے' اس سے ذرا ہٹ کر دو افراد بیٹھے تھے اور سامنے والی دیوار کے ساتھ چار افراد کی ایک ٹولی بیٹھی تھی۔ ایک شخص تنہا بھی بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ رقص کرنے والی صرف رقص کر رہی تھی گا نہیں رہی تھی۔

ہم ابھی سنبھل کر بیٹھے ہی تھے کہ رقص ختم ہو گیا۔ "واہ واہ" کی آوازیں بلند ہوئیں۔ رقاصہ کا ہاتھ اظہار تشکر میں پیشانی تک پہنچ گیا۔ اسی کے ساتھ وہ جھکی بھی تھی۔ کچھ تماش بینوں نے اس کے قدموں میں چاندی کے روپے پھینکے جنہیں قالین سے اٹھا کر وہ ادھیڑ عمر عورت کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ روپے اس نے عورت کے حوالے کر دیے تھے۔ ہمارے قریب ہی جو دو افراد بیٹھے تھے' وہ اٹھنے لگے تو ادھیڑ عمر عورت جو نائکہ تھی بولی۔ "حضور! پان تو کھاتے جایئے!"

وہ دونوں "اچھا" کہہ کر پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ نائکہ نے پان کی تھالی رقاصہ کو تھما دی۔ وہ اٹھی اور پہلے انہی دونوں کی طرف بڑھی جو جانے والے تھے۔

"یہی ہے ریحانہ۔" فرید احمد نے بتایا۔

میں نے اسے دیکھا۔ گندمی رنگ تھا مگر ناک نقشہ اچھا تھا۔ جسم متناسب اور قد لمبا تھا۔ پیچھے سے بال کھلے ہوئے تھے اور آگے سے کسے ہوئے تھے۔ ان میں بیلے کے پھولوں کا ایک گجرا بھی اٹکا ہوا تھا۔ آنکھیں بڑی اور خوبصورت تھیں جن میں کاجل لگا تھا۔ اب وہ پانوں کی تھالی لے کر ہماری طرف بڑھ آئی تھی۔

"شکریہ! ہم پان نہیں کھاتے۔" عظمت علی نے کہا اور اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر تھالی میں رکھ دیا۔ تھالی میں پہلے سے دو روپے پڑے تھے۔

وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ فرید احمد نے اس سے پوچھا۔ "تم اردو جانتی ہو؟"

"تھوڑا تھوڑا اردو آتا ہے ہم کو۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا' پھر اٹھ کر سامنے بیٹھی ہوئی ٹولی کی طرف چلی گئی۔ ان چاروں کے روبرو بھی وہ اسی طرح باادب بیٹھی۔

تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ ساز دوبارہ چھڑ گئے۔ اس دوران میں ایک قبول صورت نوجوان لڑکی اندرونی دروازے سے نکل کر سازندوں کے قریب آ بیٹھی تھی۔ رقاصہ ریحانہ' نائکہ کے پاس بیٹھی تھی۔

"تن کے بیٹھے ہیں!" چاروں افراد کی ٹولی نے بلند آواز میں فرمائش کی۔

قبول صورت مطربہ نے مسکرا کر اقرار میں سر ہلایا اور پیچھے مڑ کر سازندوں کو کچھ ہدایت دی۔ وہ چاروں استاد داغ دہلوی کی یہ غزل شاید پہلے بھی گانے والی سے سن چکے ہوں گے جس کا مطلع یہ تھا۔

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

لڑکی تو قبول صورت ہی تھی مگر آواز غضب کی تھی۔ اس نے سماں باندھ دیا۔ وہ جب غزل کے مقطع پر پہنچی۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

اچانک یوں محسوس ہوا جیسے بھگدڑ سی مچ گئی ہو۔ کسرتی اور گٹھیلے جسم کے تین آدمی ریشمی پردہ اٹھا کر اندر آ گئے۔ ان کے حلیے عجب تھے۔ کپڑے کی بنیان نما بنڈیاں ہی ان کے اوپری جسموں پر تھیں' سر گھٹے ہوئے تھے اور لمبی چوٹیاں گردن تک آ رہی تھیں۔ کمرے میں ان لوگوں کے داخل ہوتے ہی سازندوں کے ہاتھ رک گئے۔ ساز خاموش ہو گئے۔ کمرے کی فضا پر بوجھل اور ناگوار سا سکوت طاری ہو گیا تھا۔

یہ سکوت انہی تینوں میں سے ایک کی بھاری آواز سے ٹوٹا۔ اس نے حقارت آمیز انداز میں وہاں بیٹھے ہوئے تمام تماش بینوں کو حکم دیا۔ "چلو بے یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ' راجا جی آ رہے ہیں۔" وہ سکھ کو شین بولنے کا عادی لگتا تھا۔

فرید احمد کی زبان میں تو ہر وقت کھجلی ہوتی ہی رہتی تھی۔ کوئی اور تو خیر کچھ نہیں بولا' فرید احمد جواباً بول اٹھا۔ "ابے لاؤ کے! تجھے بات کرنے کی تمیز ہے! اس نے کھول رہے تجھے کھونٹے سے! یہ کیا تیرے راجا جی کی اماں کا کوٹھا ہے کہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔ مال خرچتے ہیں' ایسے ہی نہیں آ کر بیٹھ جاتے یہاں!"

"جدا باد۔ جدا باد!" سامنے بیٹھے ہوئے تنہا شخص نے فرید احمد کی حوصلہ افزائی کے لیے ہانک لگائی۔ وہ شاید "زندہ باد" کہنا چاہتا تھا۔

"اوئے رگھو! تو اش جدا باد کو شنبھال' میں اش شالے کو دیکتا ہوں!" وہی پہلا دیو قامت اپنے ایک ساتھی سے بولا' پھر اس نے دروازے کے قریب کھڑے ہوئے اپنے تیسرے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "تو نیچے جا کے راجا جی شے کہہ دے' ابھی اوپر نہ آئیں' مخفل ہی میں پڑ جاریں! میں ان شب شالوں کو بھگاتا ہوں ابھی!"

پہلے سر گھٹے کا تیسرا ساتھی پردہ اٹھا کر چلا گیا تو وہ فرید احمد کو گھورتا ہوا چپل پیروں سے اتارے بغیر سفید چاندنی پر بے تکے قدموں سے آگے بڑھا۔

اسی وقت نائکہ نے آگے بڑھتے ہوئے بھگو سے بلند آواز میں کہا "بس کر بھگو! میرے کوٹھے پر جھگڑا فساد نہ کرا! میں خود ان لوگوں سے کہہ دیتی ہوں کہ چلے جائیں۔"

"تو چپ رہ بوڑھی گھوڑی! ورنہ تیرے بھی لگام ڈال دوں گا!" سر گھٹا جس کا نام بھگو تھا' غرایا۔

نائکہ بدحواس سی نظر آنے لگی' پھر اس نے سارنگیے کو مخاطب کیا۔ "تو جلدی سے بھاگ کر سردارے کو بلا لا' کہنا کہ بائی جی نے فوراً بلایا ہے' کوٹھے پر جھگڑا ہو گیا ہے۔ اسی وقت اس کم بختی مارے کو مرنا پڑنے کی لگی ہے! دیکھ پیچھے والے زینے سے چلا جا۔ سن! وہ کالوکے گتے پر ہوگا۔" پھر اس نے مطربہ اور رقاصہ دونوں کو اندر گھر میں بھیج دیا۔

ادھر تو سارنگی نواز بوڑھا اندرونی دروازے کی طرف لپکا' ادھر بھگو نے "جدا باد" کا نعرہ مارنے والے کی ٹھکائی شروع کر دی' پھر اسے پیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا اور باہر دھکا دے دیا۔ یہ رنگ محفل دیکھ کر چاروں افراد کی ٹولی بھی "جدا باد" کے پیچھے پیچھے کھسک لی۔ تماش بینوں میں اب وہاں ہم تینوں رہ گئے تھے۔ بھگو اب ہمارے سر پر آ گیا۔ مجھ سے یا عظمت علی سے اس نے کچھ نہیں کہا اور جھک کر فرید احمد کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔

"چھوڑ دو یار اسے!" عظمت علی نے بھگو سے کہا۔ "ہم چلے جاتے ہیں۔"

"اپنے کھتے چلے جاؤ گے مہاراج! اش نے راجا جی کا اپمان کیا ہے اشے۔ اش کتے کے پلے کو تو نہیں چھوڑوں گا میں!" یہ کہتے ہی اس نے فرید احمد کو اس طرح ایک ہاتھ سے اوپر اٹھا لیا جیسے فرید احمد کوئی ہلکا سا کھلونا تھا۔ اب وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا اور فرید احمد کو ایک ہاتھ سے اوپر اٹھائے جا رہا تھا۔ فرید احمد کا گریبان اب بھی اس کے آہنی پنجے کی گرفت میں تھا۔ فرید احمد کی دونوں ٹانگیں ہوا میں معلق تھیں اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔

فرید احمد بہرحال ہمارے ساتھ آیا تھا۔ وہ ہمارا دوست تھا۔ ہر چند کہ اسے ان سانڈ قسم کے غنڈوں سے زبان درازی نہیں کرنا چاہیے تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم اسے ان غنڈوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے۔ یہی سوچ کر میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سخت لہجے میں بولا۔ "چھوڑ دے اسے ورنہ اچھا نہیں ہوگا!"

عظمت علی بھی اب میرے تیور دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

میری بات کے جواب میں بھگو حقارت سے ہنس کر بولا۔ "ابے شالو! تم تو ویشے بھی مشلا (مسلمان) لگتے ہو۔ تمہیں مارنا توپن (ثواب) ہے۔" اس نے اب بھی فرید احمد کو ایک ہاتھ سے اٹھا رکھا تھا۔ اس سے اس کے بازو کی مچھلی نمایاں ہو گئی تھی۔

مجھے اور عظمت علی کو اٹھ کر کھڑے ہوتے دیکھ کر بھگو کا ساتھی رگھو تیزی سے ہماری طرف لپکا۔

"تو الگ کھڑا رہ رگھو! میں ان تینوں کو ابھی ناک رگڑواتا ہوں۔" یہ کہتے ہی بھگو نے فرید احمد کو جھولا دے کر کسی مردہ چھپکلی کی طرح دیوار کی طرف اچھال دیا۔ فرید احمد کا سر دیوار سے ٹکرایا اور پھر اس نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔ وہ شاید سانس گھٹنے کے سبب یا پھر دیوار سے سر ٹکرانے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

فرید احمد سے نمٹ کر بھگو میری طرف مڑا اور مجھے موٹی سی گالی دے کر میرے پیٹ پر لات ماری۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میں دور جا گرا اور اذیت کے سبب دہرا ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا تھا اسی لیے میں عظمت علی کا حشر نہ دیکھ سکا۔ میں نے اس کی صرف چیخ سنی تھی۔

نائکہ کسی چابی بھرے کھلونے کی طرح مدد کے لیے چیخے جا رہی تھی۔ اس عرصے میں سازندے بھی بھاگ لیے تھے۔

اچانک مجھے وہی پُراسرار سی مانوس خوشبو محسوس ہوئی' اسی کے ساتھ میرے کانوں میں نسوانی سرگوشی ابھری "اٹھو کہ تم ایک غیر معمولی وجود ہو۔ اٹھو کہ تم ایک حیرت انگیز اور ناقابل شکست ہستی ہو۔ تمہیں کوئی زیر نہیں کر سکتا!۔ کوئی نہیں! تم ناقابل شکست ہو۔"

وہ خوشبو ابھی معدوم ہی ہوئی تھی کہ حقیقتاً میرے جسم میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ ان میں اتنی شدت تھی کہ میرا جسم جھٹکے کھانے لگا۔ ان جھٹکوں کے ساتھ ہی پیٹ پر پڑنے والی ضرب کی اذیت قطعی غائب ہو گئی اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ بجلیاں اب بھی میرے رگ و پے میں دوڑ رہی

تھیں۔ اب وہاں نائیکا بھی نہیں تھی۔ اندرونی کمرے کا دروازہ بند نظر آ رہا تھا۔ نائیکا نے اندر جا کر شاید دروازہ بند کر لیا تھا کہ کہیں دنگے فساد میں اس کے چوٹ چپیٹ نہ آ جائے۔ فرید احمد اب تک دیوار کے قریب بے حس و حرکت پڑا تھا۔ عظمت علی گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے سر کے بال بھکو کی بند مٹھی میں تھے۔ سر کے بال کھنچنے کی وجہ سے عظمت علی کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

"ابے او چھنگی! تو پھر اٹھ کھڑا ہو گیا۔ تیری تو۔۔" بھکو نے مجھے پھر گالی دی اور عظمت علی کے بالوں کو جھٹکا دے کر اسے ایک طرف لڑھکا دیا۔ یقیناً اب وہ پہلے مجھ سے نمٹنا چاہتا تھا۔ اسی وقت بھکو کا تیسرا ساتھی بھی آ گیا جسے اس نے نیچے بھیجا تھا۔ بھکو نے اسے بھی مداخلت سے روک دیا۔ اسے یقیناً اپنی طاقت پر بڑا غرور تھا جس کا مظاہرہ میں دیکھ چکا تھا۔

"جلدی کر بھکو! راجا جی کہتے ہیں کہ کہیں پولیس نہ آ جائے۔ اور وہ بنگالن نرتکی (رقاصہ) کدھر گئی؟ راجا جی نے کہا ہے کہ وہ اب اوپر نہیں آئیں گے۔ ہمیں اس نرتکی کو اٹھا کر لے چلنے کا حکم دیا ہے راجا جی نے!" بھکو کے تیسرے ساتھی نے اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے اسے اٹھانا کون سی بڑی بات ہے! اندر ہے وہ مگر پہلے ان سالوں کو تو۔ ان مشٹوں کو تو پچھاڑ لوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے مخصوص انداز میں بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ اس کے چوڑے چکلے چہرے پر وحشت و درندگی کے آثار تھے۔ وہ کسی مرکھنے بیل کی طرح سر جھکائے، آنکھیں چڑھائے میری طرف آ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بازو اس طرح پھیلا رکھے تھے جیسے مجھے ان کے درمیان لے کر بھینچ ڈالنا چاہتا ہو۔

میرے سارے وجود میں ایک طوفان گردش کر رہا تھا اور پھر وہ طوفان کی زد میں آ ہی گیا۔ اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالنا چاہا تھا۔ وہ شاید میرا بھی وہی حشر کرنا چاہتا تھا جو فرید کا کیا تھا۔ مجھے بھی شاید وہ اٹھا کر دیوار سے دے مارنا چاہتا تھا، لیکن میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے طوفانی رفتار سے لپک کر اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ میرا گھونسا اس کی دائیں آنکھ کے نیچے رخسار کی ابھری ہوئی ہڈی پر پڑا تھا۔ گھونسا پڑتے ہی وہ بری طرح ڈکرا کر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے رخسار کی کھال پھٹ گئی تھی جس سے خون بہہ رہا تھا۔

"اٹھ حرام زادے اٹھ!" میں چیخا اور مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی لگی۔ وہ نہیں اٹھا تو میں نے جھپٹ کر اس کے پہلو میں زبردست ٹھوکر لگائی۔ خلافِ توقع اس کا بھاری جسم اپنی جگہ سے اچھلا اور مخالف سمت کی دیوار سے ٹکرا کر طبلے کی جوڑی پر جا گرا۔ اسی دوران میں اس کے منہ سے تیز چیخ بھی نکلی تھی۔ طبلے کی جوڑی سے لڑھک کر اس کا جسم نیچے آ رہا۔ وہ دونوں ہاتھوں کا سہارا لے کر کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں اسی کی طرف متوجہ تھا کہ اچانک مجھے اپنی پشت پر بوجھ سا محسوس ہوا۔ میں نے جھک کر اور اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے دوسرے بدمعاش کو سامنے فرش پر دے مارا۔ اسی نے عقب سے مجھ پر چھلانگ لگائی تھی۔ مجھے خود بھی حیرت تھی کہ میں نے اس کے اتنے بھاری جسم کو کس آسانی سے اٹھا کر پٹخ دیا تھا۔ پھر تیسرے شیطان نے بھی اپنی حسرت نکالنے میں دیر نہیں کی تھی۔ اس نے ہارمونیم اٹھا کر میرے سر کو نشانہ بنانا چاہا تھا۔ میں اسی لیے زقند بھر کر ایک طرف ہو گیا تھا اور پلٹ کر اس کے ایک کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ ہارمونیم دور جا گرا تھا۔ میری انگلیوں کی گرفت اس کی کلائی پر سخت ہوتی جا رہی تھی اور اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔ عظمت علی اپنی تکلیف بھول کر حیرت سے آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے پھٹے ہوئے ہونٹ سے اب بھی خون بہہ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر تو بیٹھ گیا مگر شاید ابھی اس میں کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی۔

اسی دوران میں بھکو اٹھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ کسی شرابی کی طرح جھومتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ جس نے مجھ پر پیچھے سے چھلانگ لگائی تھی اور فرش پر میرے قریب ہی پڑا تھا، اس نے بھی لیٹے لیٹے اپنے دونوں ہاتھوں سے میری ایک ٹانگ پکڑ لی۔ وہ مجھے گرانے کے لیے زور لگا

رہا تھا مگر مجھے میری جگہ سے خفیف سی حرکت دینے میں بھی کامیاب نہ ہوا۔ میں نے اپنے دائیں پیر کی ٹھوکر سے اس کی پیشانی پر ضرب لگائی۔ وہ ڈکرایا۔ میری ٹھوکر کی ضرب سے اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس نے میری بائیں ٹانگ چھوڑ دی اور اپنی لہولہان پیشانی کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر تڑپنے لگا۔

جس کی دائیں کلائی میری گرفت میں تھی اس نے بائیں ہاتھ سے میری گردن دبوچنا چاہی۔ میں نے اس کی کلائی پر ہلکا سا دباؤ ڈالا، اسی کے ساتھ اپنے بائیں ہاتھ کا الٹا تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ اس نے میری گردن چھوڑی ہی تھی کہ میں نے اس کی کلائی کو جھٹکا دیا۔ کلائی کی ہڈی ٹوٹنے کی صاف آواز میں نے بھی سنی۔ اس کے منہ سے بڑی بھیانک چیخ بلند ہوئی اور پھر اس کا بے ہوش جسم میرے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ اس کی کلائی میں نے پہلے ہی چھوڑ دی تھی۔ پیشانی پر ضرب کھانے والا بھی اس عرصے میں تڑپ تڑپ کر ساکت ہو چکا تھا

اب وہ پہلا دیو قامت بھکو ہی میرے مقابل تھا۔ وہ جھومتا جھامتا میرے نزدیک تو آ گیا، مگر شاید اسے مجھ پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

"تجھے اب ڈر کیوں لگ رہا ہے، آگے بڑھ نا! ہم تو مسلمان ہیں ہمیں مارنا تو پُن ہے" میں نے اسے للکارا۔

میری توقع کے خلاف اچانک وہ سر جھکا کر مری سی آواز میں کہنے لگا "یہاں سے جانے دے مجھے!"

"ایسے کیسے چلے جاؤ گے مہاراج!" میں نے اس کے لہجے اور الفاظ کی نقل اتاری۔ "آپ راجا جی کے ایمان کا بدلہ نہیں لو گے"

پھر میں نے اس سے بالکل اس طرح کھیلنا شروع کر دیا جیسے شیر اپنے بے بس شکار سے کھیلتا ہے۔ اسی عرصے میں فرید احمد کو ہوش آ گیا۔ وہ میرے ہاتھوں اس "گینڈے" کو پٹتے دیکھ کر حیرت سے چیخ اٹھا تھا۔ مجھے اسی سے معلوم ہوا تھا کہ وہ ہوش میں آ گیا ہے۔ اس نے پُرجوش انداز میں اور بالکل بچوں کے سے انداز میں مجھ سے کہا تھا "چپاتی بنا دو کمینے کو!"

"نہیں!" میں نے عظمت علی کی آواز سنی اس نے مجھ سے کہا "بس بہت ہو گیا، اب اسے چھوڑ دو!"

"تم دونوں نیچے چلو میں ابھی آ رہا ہوں۔" میں جواباً بولا۔ بھکو کو اپنے روبرو گھگھیاتے ہوئے دیکھ کر اور اس کی پٹائی کرتے ہوئے مجھے عجب سی لذت محسوس ہو رہی تھی۔ میں اسی لیے ابھی وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں اس کے بہت مجھے بجھے ہاتھ جڑ رہا تھا تاکہ وہ جلد بے ہوش نہ ہو جائے۔ اب وہ مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے صرف مدافعت کر رہا تھا۔

حالانکہ میرا لہجہ تحکمیہ نہیں تھا مگر عظمت علی اور فرید احمد مزید ایک لفظ کہے بغیر وہاں سے چلے گئے تھے۔ انہیں گئے ہوئے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ اچانک بھاری قدموں کی چاپ ابھری اور پھر پردہ اٹھا کر چار پولیس والے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اسی لمحے میں نے بھکو کی کھوپڑی پر ٹھوکر ماری۔ وہ میرے دونوں پیروں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چیختا ہوا دور جا گرا اور پھر اس کا جسم ڈھیلا ہو گیا۔ احتیاط کے باوجود ٹھوکر کچھ زیادہ ہی زور کی پڑ گئی تھی۔ میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا تھا۔

پولیس والوں میں سے ایک کی بغل میں چھوٹا سا ڈنڈا دبا ہوا تھا۔ وہ شاید ان کا افسر لگتا تھا۔ اسی نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ "پکڑ لو اسے!"

حکم سنتے ہی تینوں پولیس والے میری طرف لپکے۔ میں نے سوچا کہ مجھے ان کے ہاتھ نہیں آنا چاہیے۔ پھر میں نے انہیں کمرے میں دوڑانا شروع کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ موقع ملتے ہی کھلے دروازے سے نکل کر بھاگ جاؤں، مگر دروازے کے بیچ وہ پولیس افسر ڈنڈا ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوا تھا۔ مجھے خود بھی اپنی رفتار پر حیرت ہو رہی تھی۔ ابھی تک وہ تینوں میرے جسم کو چھونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ ایک تو میں کسی کیس میں ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا، دوسرے ملک میں کسی بھی پولیس والوں سے بھڑنے کے حق میں نہیں تھا۔ بھلا ان سے میرا کیا جھگڑا تھا!

معلوم نہیں کیسے پولیس افسر کو یہ خیال آیا کہ کہیں میں دروازے سے نکل کر بھاگ نہ جاؤں۔ یہ اندازہ میں نے پولیس افسر کی اس حرکت سے لگایا کہ اس نے کمرے کا بیرونی دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور پھر سپاہیوں کو برا بھلا کہتا ہوا میرے پیچھے دوڑنے لگا تھا۔

اب فرار کا واحد راستہ بھی بند ہو چکا تھا۔ بھاگتے بھاگتے میری نظر ایک دریچے پر پڑی۔ سمت کا تعین میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ یہ دریچہ اندر گھر کی طرف ہو گا یا اس راہداری میں کھلتا ہو گا جو بیرونی دروازے کے سامنے تھی۔ دوڑتے ہوئے میں نے ایک دم جست بھری اور اس دریچے پر چڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ دریچہ سڑک کی طرف کھلتا تھا۔ میں نے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا۔

"آپ بے ہوش ہو جائے گا' وہاں سے گر کے۔ اتر آؤ!"

پولیس افسر اپنا زخم بڑا مارا ہوا تھا اور بانپتا ہوا دریچے کی طرف دوڑا اور سپاہیوں نے بھی ادھر ہی کا رخ کیا۔ میرا رخ سڑک کی طرف تھا اور میں دوسری منزل کے دریچے میں کھڑا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا۔ مجھ سے ایک ایسی غلطی ہو گئی تھی جس کا ازالہ ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایک سپاہی بھاگتا ہوا دریچے کے قریب پہنچ گیا اور اس نے میرا ایک پیر پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ شاید میرا پیر پکڑ کر مجھے دریچے کے نیچے سے گھسیٹ لینا چاہتا تھا۔ میں اس وقت ڈرتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ سپاہی قریب آ جائیں تو میں ان کے عقب میں کودوں' پھر بھاگتا ہوا بیرونی دروازے تک پہنچوں اور کنڈی کھول کر باہر نکل جاؤں۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ سپاہی میری ٹانگ پکڑ کر نیچے کھینچنے کی کوشش کرے گا۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ جب اس سپاہی نے میرے پیر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو غیر ارادی طور پر میں نے وہ پیر اٹھا لیا اور اسی لیے میرے جسم کا توازن بگڑ گیا۔ میں دریچے سے سڑک کی طرف گرا۔ حیرت انگیز امر یہ تھا کہ مجھے ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا اور میں نے اپنے جسم کو بہت آہستہ آہستہ نیچے گرتے دیکھا۔ مجھے اپنا جسم بے حد ہلکا لگ رہا تھا۔ میں کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوا کے دوش پر بہتا ہوا دھیرے دھیرے نیچے آ رہا تھا۔

نیچے بازار میں آتے جاتے جن لوگوں نے مجھے دوسری منزل کے ایک دریچے سے گرتے دیکھا' ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں' پھر ایک دم سناٹا سا چھا گیا۔ لوگ اب تصویر حیرت بنے مجھے آہستہ آہستہ نیچے آتے دیکھ رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہرے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ ایسا حیران کن اور ناقابل یقین منظر انہوں نے شاید اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا ہو گا۔ اب وہ چیخنا بھول گئے تھے۔

سڑک پر جس جگہ میں گرنے والا تھا۔ وہاں لوگوں کا ٹھٹھ لگ گیا۔ جب میں اور نیچے آ گیا تو لوگ دائرے کی صورت میں پیچھے ہٹ گئے۔ سڑک سے میں اب چند فٹ ہی دور رہ گیا تھا کہ کہیں چوٹ نہ لگ جائے' یہ سوچ کر میں نے اپنے دونوں پیر اس طرح سیدھے کر لیے جس طرح کوئی پرندہ اڑتے اڑتے کہیں بیٹھنے سے پہلے اپنے دونوں پنجے نیچے کر لیتا ہے۔ میرے جوتے اوپر ہی رہ گئے تھے اور میں ننگے پیر تھا۔ اس وجہ سے اور بھی محتاط تھا۔ سڑک پر میں بہت اطمینان سے اتر گیا۔ میرے جسم کو ہلکا سا جھٹکا بھی نہیں لگا تھا۔ سڑک پر میں بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ دائرے کی صورت میں کھڑے ہوئے لوگ میرے قریب آنے کی ہمت نہیں کر رہے تھے وہ مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں۔

فضا سے نیچے آتے ہی میرے ذہن میں پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ فوراً مجھے اس علاقے سے کہیں دور نکل جانا چاہیے۔ اگر میں یہیں رہا تو پولیس مجھے دوبارہ بھی پکڑنے کی کوشش کر سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں تیزی کے ساتھ ایک طرف بڑھا اور لوگ گھبرا کر ادھر ادھر ہو گئے۔

"رک جاؤ' ہم بھی آ رہے ہیں۔" عقب سے میں نے عظمت علی کی آواز سنی مگر میں رکا نہیں۔ عظمت علی اور فرید احمد بھی یقیناً بھیڑ میں موجود تھے اور انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میرے لیے وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ تیزی کے ساتھ میں قریب ہی نظر آنے والی ایک نیم تاریک سی گلی میں گھس گیا۔ جلد از جلد میں ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جانا چاہتا تھا جنہوں نے مجھے سڑک پر اترتے دیکھا تھا۔

"وہ رہا۔ وہ ادھر گیا ہے۔ اس گلی میں!" لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور میری رفتار میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ میں اس گلی سے ایک اور سنسان سی گلی میں مڑ گیا۔ اب میں تقریباً دوڑ رہا تھا۔

گلیوں ہی گلیوں میں اس علاقے سے کافی دور نکل آیا اور پھر سڑک پر آ کے ایک خالی تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگے والے نے شاید میرے ننگے پیروں پر توجہ نہیں دی تھی ورنہ میری طرف سے کھٹک جاتا اور مجھے قرول باغ لے جانے کی ہامی نہ بھرتا۔ پھر اپنے گھر پہنچ کر دروازے پر دستک دیتے ہوئے بھی مجھے یہی خیال تھا۔ ممی یا ڈیڈی میں سے کوئی پوچھتا کہ میں ننگے پیر کیوں ہوں اور اپنے جوتے کہاں چھوڑ آیا؟ تو میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ ہوتا۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ دروازہ ملازمہ نے کھولا اور میں تیزی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ پھر میں نے اپنے کمرے تک پہنچنے میں انتہائی سرعت کا ثبوت دیا تھا۔

جیسے ہی میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا' میرے جسم کو شدید جھٹکا لگا۔ اس کے ساتھ مجھ پر ایک دم اتنی نقاہت طاری ہو گئی کہ بہ مشکل اپنی مسہری تک پہنچ سکا اور پھر اس پر جیسے ڈھے گیا۔ چند ہی لمحے بعد میری حالت اعتدال پر آ گئی۔

یہ سب کیا تھا؟ کیا ہے؟ گزرے ہوئے حیرت ناک واقعے کی تفصیلات میرے ذہن میں اجاگر ہونے لگیں۔ مجھے

اب یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی میں نے ہی تھا تمہیں دیو ہیکل سرکشوں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرے اندر ایسی ناقابل یقین اور حیرت انگیز طاقت کس طرح پیدا ہو گئی تھی؟ میں تو ان میں سے کسی ایک کے سامنے چند لمحے نہیں ٹک سکتا تھا۔ اس کے بعد میرا پولیس والوں کے ہاتھ نہ آنا' میری تیز رفتاری بھی عقل کو دنگ کر دینے والی تھی اور سب سے زیادہ تعجب خیز یہ بات تھی کہ دوسری منزل سے نیچے گرنے کے باوجود معمولی چوٹ تو دور کی بات ہے' مجھے ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی تھی۔ اب خود مجھے یہ سوچ کر خوف آ رہا تھا کہ میں دوسری منزل سے گر گیا تھا۔

میرا وجود آخر ہے کیا معمہ جو خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا؟ میرے اندر یہ پُراسرار قوتیں کیوں ہیں؟ مجھے ہی ایسی نعمتوں سے کیوں نوازا گیا ہے جو روئے زمین پر بسنے والے کسی انسان کو عطا نہیں کی گئیں؟ میں عام انسانوں سے مختلف کیوں ہوں؟ کیا بھید ہے اس میں؟ مجھے سنائی دینے والی وہ نسوانی سرگوشیاں کس کی ہیں جو بروقت میری رہنمائی کرتی ہیں' پیش آنے والے واقعات سے مجھے آگاہ کرتی ہیں اور مجھی پر میرے وجود کے اسرار کھولتی ہیں؟ اس نادیدہ انسانی وجود سے میرا کیا رشتہ ہے؟ بہت دن پہلے ممی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ میری ماں کی بھٹکی ہوئی روح ہے۔ کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ وہ میری ماں ہی ہے؟ اسی کی بھٹکی ہوئی روح ہے؟

"نہیں!" پُراسرار سرگوشی ابھری اور میں نے وہی مانوس و مخصوص خوشبو محسوس کی۔ اس نادیدہ وجود نے جیسے میرے خیالات پڑھ لیے تھے۔ مجھے اس کی سرگوشی سنائی دے رہی تھی۔ "میں تمہاری ماں کی بھٹکی ہوئی روح نہیں ہوں۔"

"پھر کون ہو تم؟ کسی کی روح ہو؟" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب نادانستگی میں اس نادیدہ وجود سے میں سوال کر بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے کبھی مجھ میں اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسے مخاطب کر سکتا۔

"میں کسی کی روح نہیں ہوں۔" مجھے اپنے سوال کا جواب ملا۔

پھر تم نظر کیوں نہیں آتیں؟ یہ سوال میرے ذہن میں ابھرا تو ضرور مگر میری زبان تک نہ آ سکا۔ اس کے باوجود مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

"میں نظر بھی آ سکتی ہوں۔ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں۔ میں اپنی مرضی کے مطابق ہر صورت میں ظاہر ہو سکتی ہوں سنو کہ تمہارے ذہن میں پیدا ہونے والے تمام سوالوں سے میں واقف ہوں۔ مجھے علم ہے کہ خود میرا نادیدہ وجود بھی تمہارے ذہن میں متعدد وسوسے پیدا کرتا ہے۔ سو میرے بارے میں فی الحال صرف اتنا جان لو کہ قادر مطلق نے میرے وجود کی تخلیق آگ اور ہوا سے کی ہے' ایسی آگ کہ جس میں نور بھی تھا اور ظلمت بھی! آگ ایسی کہ اس میں دھواں نہ تھا' مگر یہ باتیں ابھی پوری طرح تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تمہارے شعور کو ابھی بلوغت کی حدیں طے کرنا ہیں اور سنو کہ قرآن پڑھا کرو! اس کتاب حکمت سے تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ وہ ایک ایسی عظیم کتاب ہے جس میں ہر سوال کا جواب موجود ہے۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ واقعی اس کی باتیں سمجھنا میرے لیے آسان نہیں تھا۔

"غور سے رک رک کر اور سمجھ کر قرآن پڑھو!" اس نے پھر مجھے تاکید کی۔

"میں ایسا ہی کروں گا۔" میرے لبوں نے جیسے خود بہ خود حرکت کی۔ اسی لمحے میرے ذہن میں خیال آیا کہ جب وہ میرے ذہن میں پیدا ہونے والے تمام سوالوں سے واقف ہے تو پھر ان کے جواب کیوں نہیں دیتی؟

"تو جان لو کہ تمہارے وجود میں ایسا حفاظتی نظام پوشیدہ ہے جو خود بہ خود اس وقت حرکت میں آ جاتا ہے جب تمہیں کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ آج اور ایک بار پہلے بھی تمہیں اس کا تجربہ ہو چکا ہے کیوں کہ تم اپنے اندر چھپی ہوئی ان حیران کن قوتوں سے ناآشنا ہو اس لیے مجھے تمہاری رہنمائی کرنا پڑی ہاں تم یہ سوچنے میں حق بجانب ہو کہ میں نے تمہاری رہنمائی کیوں کی؟۔ سو میرے اور تمہارے درمیان ماں بیٹے کا رشتہ تو نہیں' مگر تم میری اولاد ہی کی طرح ہو۔ تم میری ایک عزیز ہستی کی نشانی ہو۔ تمہاری رہنمائی کرنا میرا فرض تھا اور ہے اور فرض ہے۔ سو میں نے یہ فرض پورا کیا اور پورا کرتی رہوں گی' اس وقت تک۔ جب تک میری زندگی ہے۔" اس کی سرگوشیوں کے دوران جو سوالات میرے ذہن میں ابھر رہے تھے' وہ ان کے بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ "ہاں موت میرا بھی مقدر ہے' ہر وجود کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ میں اس سے مبرا نہیں ہوں۔"

"کیا وہ عزیز ہستی میری ماں تھی جس کے سبب تم مجھے اپنی اولاد کی طرح سمجھتی ہو؟" یک سوال میری زبان تک بھی آ گیا۔

"ہاں تمہاری ماں بھی مجھے عزیز تھی' مگر ابھی میں نے جس عزیز ہستی کا ذکر کیا' وہ تمہاری ماں نہیں تھی۔ وہ کون

تھی؟ تمہارے اس سوال کا جواب فی الحال نہیں دیا جا سکتا۔ سنو کہ قبل از وقت کچھ باتیں جان لینا کبھی کبھی نقصان دہ ہوتا ہے۔ وقت کو اپنا سفر طے کرنے دو اور علم حاصل کر کے علم حاصل کرنا سب سے افضل ہے۔"

"میں۔ میں یقیناً علم حاصل کروں گا اور۔ اور ایک روز یہ جان لوں گا کہ قادرِ مطلق نے میرے وجود میں یہ حیرت انگیز قوتیں کیوں جمع کر دی ہیں! مجھے ان نعمتوں سے کیوں نوازا گیا ہے جو کسی انسان کو عطا نہیں ہوئیں!" میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔

"ہاں۔ یقیناً ایک روز تم یہ جان لو گے اور اتنا تمہیں میں بھی بتا سکتی ہوں کہ تمہارے وجود کا بھید تمہارے نام میں چھپا ہوا ہے۔ یہ نام ایک پردہ ہے اور جس دن یہ پردہ اٹھ گیا یا خود تم نے اس پردے کو اٹھا دیا تم پر تمہارے وجود کی بہت سی حقیقتیں منکشف ہو جائیں گی۔ تم نے ٹھیک سوچا' میں یہ بھید جانتی ہوں' یہ پردہ اٹھا سکتی ہوں' مگر ابھی پردہ اٹھانے کا وقت نہیں آیا۔ صبر کرو طارنوش میرے بچے ابھی صبر کرو!"

"تمہارا نام کیا ہے؟ میں تمہیں کس نام سے یاد رکھوں؟ کس نام سے پکاروں؟۔ اور۔ اور کیا کبھی میں نے تمہیں پکارا تب۔ تو تم میری پکار سن لو گی؟ میرے پاس آ جاؤ گی؟" میں نے رک رک کر اس سے پوچھا۔ میری آواز جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس سے میرا بہت قریبی رشتہ ہو۔

"تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میرا نام امنی ہے اور سنو کہ یہ ضروری نہیں' جب تم مجھے پکارو میں آ ہی جاؤں' مگر میں تمہاری طرف سے غافل نہیں رہتی۔ میں تمہارے ارد گرد ہی منڈلاتی رہتی ہوں۔ اس لیے کہ ابھی تم اپنے وجود کی حیرت ناکیوں سے پوری طرح آگہی نہیں رکھتے اور۔ اور اس کی ایک بڑی وجہ اور بھی ہے۔ تمہیں۔ تمہیں کچھ ایسی قوتوں کی طرف سے بھی خدانخواستہ خطرہ پیش آ سکتا ہے جن سے ابھی تم واقف نہیں ہو۔ میں اسی لیے تم سے قریب رہنے کی کوشش کرتی ہوں کہ وہ۔ وہ جنہوں نے تمہارے باپ کو قتل کروا دیا۔ کہیں تمہیں بھی کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ نہیں! اب میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔ خدا حافظ!"

میں بے چین ہو کر اسے پکارتا رہ گیا' مگر وہ نہیں پلٹی' اس کی مخصوص خوشبو معدوم ہو چکی تھی۔

یہ انکشاف میرے لیے انتہائی ہولناک تھا کہ میرے والد کو قتل کیا جا چکا ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں۔ میری یہ آپ بھی خواہش تھی کہ اگر میں اپنی ماں کو نہیں دیکھ سکا تو زندگی میں کبھی نہ کبھی اپنے والد سے میری ملاقات ہو جائے گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے تھے اور کب ممی میرے کمرے میں داخل ہو گئی تھیں۔ میں تو اس وقت چونکا تھا جب ممی کا ہاتھ مجھے اپنے شانے پر محسوس ہوا تھا۔

ممی کو اس عالم میں اپنے پاس دیکھ کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں ان کے سینے سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگا۔ "میں بے سایہ ہو گیا ممی!۔ بے سایہ ہو گیا!"

"تجھے کیا۔ کیا ہو گیا میرے بچے۔ کیا ہو گیا؟" ممی کی آواز بھی بھرا گئی۔

"ممی!۔ ممی' میرے والد کو قتل کر دیا گیا۔ وہ۔ وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے ممی۔ چلے گئے!" میں ممی کے سینے سے لگا ہوا بلبلا رہا تھا اور روئے جا رہا تھا۔ "میں یتیم ہو گیا۔ آج میں یتیم ہو گیا ممی!"

میرے زور زور سے رونے کی آوازیں سن کر ڈیڈی بھی وہیں آ گئے۔ انہوں نے ممی سے میرے رونے کی وجہ پوچھی ان کے لہجے سے گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

"یہ۔ یہ کہہ رہا ہے کہ اس کے والد کو قتل کر دیا گیا۔" ممی نے بہ مشکل بتایا۔ "معلوم نہیں یہ کہاں گیا تھا؟ اور۔ اور کہاں سے یہ خبر سن کے آیا ہے!"

ڈیڈی نے محبت سے میری پیٹھ تھپکی اور دلاسا دیتے ہوئے بھاری آواز میں بولے۔ "مجھے بتا۔ بتا میرے بچے کہ تیرے والد کو کس نے قتل کروایا ہے؟۔ یقین کر کہ وہ سزا سے نہیں بچ سکے گا۔ اسے ڈیسوزا پھانسی کے پھندے تک پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔"

میں نے آنسو بھری آنکھوں سے ڈیڈی کی طرف پلٹ کر دیکھا اور پھر ان کے گلے سے لگ گیا۔ "مجھے۔ مجھے نہیں معلوم ڈیڈی کہ۔ کہ میرے والد کو کس نے قتل کیا ہے! اگر۔ اگر یہ معلوم ہوتا تو۔ تو میں خود اس قاتل کو زندہ نہ چھوڑتا۔"

"نہیں میرے بچے! ایسا نہ کہو' قانون کو ہاتھ میں نہیں لیتے۔" ڈیڈی نے مجھے سمجھایا۔ "تمہیں اگر کبھی معلوم بھی ہو جائے کہ تمہارے والد کا قاتل کون ہے تو تم صرف اور صرف قانون کا سہارا لو گے۔ خود اس سے انتقام لینے کی کوشش نہیں کرو گے!"

ڈیڈی کے دیر تک سمجھانے اور انہیں مطمئن کرنے کے لیے میں نے اوپری دل سے یہ وعدہ کر لیا کہ قانون کو ہاتھ میں نہیں لوں گا۔ پھر جب میری طبیعت کچھ سنبھل گئی تو انہوں نے وہی سوال کیا جس کی مجھے توقع تھی۔

امنی کے علاوہ وجود سے ڈیڈی اور ممی دونوں ہی باخبر تھے۔ میں نے اسی لیے انہیں بتا دیا کہ اپنے والد کے قتل کی خبر مجھے کس سے ملی ہے!

"خداوند تمہاری ماں کی روح پر اپنی برکتیں نازل کرے' خود اس نے بھی ہمیں تمہارے والد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی ہم نے اسے اس کا وہ عہد توڑنے پر مجبور کیا جو اس نے اپنے شوہر سے کیا تھا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ تمہارے والد کے متعلق کچھ معلوم ہوا ہے' مگر افسوس کہ خبر ملی بھی تو اندوہناک!"

ڈیڈی کہہ رہے تھے۔ "وہ جو تم سے سرگوشیاں کرتی ہے' سچی ہے کہ آج تک اس نے کوئی جھوٹ بات نہیں کی' مگر۔ مگر تم۔ تم یتیم نہیں ہو میرے بچے! تمہارے ممی ڈیڈی ابھی زندہ ہیں۔ زندہ ہیں!" ڈیڈی کی آواز شدتِ جذبات سے کانپنے لگی اور ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

میرا دل ایک بار پھر بھر آیا اور میں نے ڈیڈی سے بوجھل آواز میں کہا۔ "آپ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں۔ میں یتیم نہیں ہوں۔ زندہ ہیں میرے ماں باپ!"

وہ شب میرے لیے شبِ گریہ تھی۔ میں نے دیر تک گریہ کیا اور پھر مجھے صبر آنے لگا۔ میرے رب نے مجھے صبر دیا اور میں نے صبر کیا۔ اسی رات میں نے یہ بھی سوچا کہ جو لوگ میری ماں کو قتل کر دینا چاہتے تھے' وہی میرے باپ کے قاتل بھی تو ہو سکتے ہیں۔ بعد میں کسی طرح انہیں علم ہو گیا ہو گا کہ میری ماں نے کس سے شادی کی تھی! یا پھر میرے والد خود میری ماں کی تلاش میں قاتلوں کے دروازے تک پہنچ گئے ہوں اور یہ راز کھل گیا ہو۔

مجرم مجھ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ دوسرے ہی دن میں وہاں پہنچ گیا۔ یہ نواب فرقان علی کی کوٹھی تھی۔ امنی نے میرے وجود میں چھپی ہوئی جن حیرت انگیز اور پُراسرار قوتوں کا انکشاف کیا تھا' ان سے واقف ہونے کے بعد میرے دل سے خوف نکل گیا تھا۔ میرے اطمینان اور بے خوفی کے لیے یہ یقین کافی تھا کہ میرے وجود میں ایسا حفاظتی نظام پوشیدہ ہے جو خود بہ خود اس وقت حرکت میں آ جاتا ہے جب مجھے کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ اب میرے سلگتے ہوئے احساسات مزید انتظار کے متحمل نہیں تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ اپنی ماں کا انتقام لینے کے لیے رفتہ رفتہ انہیں ذلت و رسوائی کی حد تک لے جاؤں گا اور پھر انہیں پچھتاوے کی موت

مارنے کو' مگر اب صورتِ حال بدل چکی تھی۔ پہلے مجھے اپنے اندر چھپی ہوئی قوتوں کا عرفان نہیں تھا ورنہ نواب زادہ عظمت علی کی موجودگی میں بچی کا کوئی خاص کام نہیں تھا۔

میرا چہرہ دھواں دے رہا تھا مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ شاید اسی لیے بڑی کوٹھی میں رہنے والے بڑے لوگوں کو یہ گمان تک نہ ہوا کہ میں نے آج کس ارادے سے وہاں قدم رکھا ہو گا۔ گزشتہ روز بازارِ حسن میں پیش آنے والے واقعے سے عظمت علی انتہائی مرعوب تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ قدرے سوجا ہوا تھا۔

"طارنوش! کل تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ہم تمہیں آوازیں دیتے رہ گئے!" عظمت علی مجھ سے بولا۔ ہم دونوں اس وقت کوٹھی کے مردانے حصے میں تھے۔ پھر اس نے پیش آنے والے واقعے پر اظہارِ حیرت کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں معلوم نہیں تھا دوست کہ تم اتنے بہادر اور طاقت ور ہو!"

"بھول جاؤ اس قصے کو اور یہ بتاؤ کہ تمہارے والد اس وقت کہاں ہیں؟"

عظمت علی گڑبڑا گیا۔ "وہ کوٹھی ہی میں ہیں' مگر۔ زیبا والے معاملے پر ان سے بات نہ کرنا۔"

"کیوں؟۔ کیوں بات نہ کروں؟" میرا لہجہ بدل گیا۔ "انہوں نے مجھ پر بیٹے کا اظہار کیا تھا اور میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ان کا فیصلہ غلط نہیں ہے۔"

"تم۔ تم کیا۔ تم کیا کہہ رہے ہو طارنوش؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں میں!" میرا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔ اسی کے ساتھ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جا رہے ہو تم؟۔ رک جاؤ طارنوش! میں۔ میں تمہیں ایک اہم بات بتانے والا ہوں جو۔ جو مجھے ابھی کچھ۔ کچھ دیر پہلے ایک ملازمہ نے بتائی ہے۔ اگر تم۔ تم خود اس وقت نہ آتے تو میں۔ میں تمہارے گھر آتا۔ میں اسی لیے تم سے کہہ رہا تھا کہ زیبا والے معاملے پر ابا جان سے گفتگو نہ کرنا۔"

میں رک گیا اور سپاٹ آواز میں عظمت علی سے پوچھا۔ "بتاؤ تمہیں کیا معلوم ہوا ہے؟"

"زیبا نے تم سے اقرارِ محبت کر لیا ہے اور۔ اور ابا جان اس پر سخت برہم ہیں۔ انہوں نے اماں جان سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ زیبا کا ہاتھ ایک عیسائی کے ہاتھ میں نہیں دیں گے اور۔ اور انہوں نے زیبا کو بہ طور سزا آج دوپہر کے بعد سے اس کے کمرے میں بند کر رکھا ہے۔ زیبا کو دوپہر کا کھانا بھی نہیں دیا گیا اور اب۔ اب شام ہو گئی ہے

وہ سچ ہے بھوپی ہے۔ سارا گھر ایک عذاب میں گرفتار ہے۔ دادا حضور تک بھی یہ بات پہنچ گئی ہے اور انہوں نے ابا جان کو طلب کرلیا ہے۔ ابا جان اس وقت انہی کے پاس ہیں اور ــــ"

عظمت علی نے کچھ اور بھی کہا ہوگا مگر شدید غصے کے سبب میں مزید کچھ اور نہیں سن سکا۔ مجھے اپنی ماں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات یاد آرہے تھے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اس کوٹھی میں ایک اور قبر کھودنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ ایک بار پھر تاریخ کو دہرانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میں نے نظر بھر کر عظمت علی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے بسی اور بے چارگی تھی۔ وہ زیبا کا بھائی اور میرا دوست تھا لیکن اس کے گھر میں میرے لیے گنجائش تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں ابھی اور اسی وقت تمہارے ابا اور خاندان کے دیگر بڑوں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"خدا کے لیے طارنوش' جذبات میں نہ بہو۔ کوئی غلط قدم نہ اٹھاؤ میرے دوست!" عظمت علی کا انداز مجھے سمجھانے والا تھا۔ "شاید طارنوش تم مجھے اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں لگتے۔"

"میں پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں ہوں عظمت علی! اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ لوگ زیبا کو قتل کردیں گے۔"

"کیسی باتیں کررہے ہو تم؟" عظمت علی کو میری بات پر یقین نہیں آیا' اس کا اظہار اس کے لہجے سے ہو رہا تھا۔ اسے میرے انکشاف پر حقیقت کا گمان نہیں تھا۔ "میں تمہاری بات پر کس طرح یقین کرلوں! کوئی باپ یا دادا بھلا اپنی بیٹی یا پوتی کو کیسے قتل کرسکتا ہے!"

"میں فی الحال تمہاری بات کا جواب نہیں دے سکتا۔" یہ کہتا ہوا میں حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔

عظمت علی خاموشی سے میرے ساتھ چلنے لگا۔ میرے قدم تیزی کے ساتھ حویلی کے اس حصے کی جانب بڑھ رہے تھے جو اس گھر کے سربراہ نواب فرقان علی کے لیے مخصوص تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو نواب صاحب کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دروازے کے سامنے ایک ملازم کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "بڑے نواب صاحب کا حکم ہے کہ کسی کو اندر نہ جانے دیا جائے۔"

"اندر کون کون ہے؟" عظمت علی نے آہستہ سے پوچھا۔

ملازم کا جواب میری توقع کے مطابق تھا۔ بڑے نواب صاحب نے دونوں نواب زادوں کو اپنے حضور طلب کیا ہوا تھا۔

مجھے طیش آگیا۔ "اندر کوئی بھی ہو' میں ہر قیمت پر کمرے میں جاؤں گا!"

عظمت علی میرے تیور بھانپ گیا تھا۔ اس نے ملازم کو اشارہ کیا کہ مجھے اندر جانے دے۔ ملازم دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر میں نے دیر نہیں کی اور دروازہ دھڑ دھڑا دیا۔

"کون ہے یہ گستاخ؟" اندر سے آنے والی آواز میں تیزی اور غصہ تھا۔ یہ آواز نواب صاحب کی تھی جس میں بڑھاپے کے باوجود بلا کا رعب و دبدبہ تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور پھر بلند آواز میں بولا۔ "طارنوش۔ میں طارنوش ہوں۔" میری آواز میں بھی تیزی اور غصہ تھا۔

"طارنوش!" عظمت علی کے والد' یعنی میرے بڑے ماموں کی آواز تھی۔ "اچھا ہوا کہ تو خود چل کر یہاں تک آگیا۔"

اسی کے ساتھ نواب صاحب کی آواز گرجی۔ "منجھلے میاں عرفان علی! یہ ہمارا حکم ہے اور دروازہ کھول دو!"

میں سمجھ گیا کہ میری آمد کی اطلاع پاتے ہی بڑے ماموں نے طمنچہ نکال لیا تھا اور بڑے نواب صاحب ان سے طمنچہ مانگ رہے تھے۔ عظمت علی میرے برابر تھر تھر کھڑا تھا۔ خوف سے اس کی قوتِ گویائی سلب ہوگئی تھی۔

بڑے ماموں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے گریبان سے پکڑ کر اندر گھسیٹا۔ "عظمت علی! تم یہاں سے چلے جاؤ اور ملازم سے کہو کہ کسی کو ادھر نہ آنے دے!" یہ کہہ کر انہوں نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

یہ نواب صاحب کی نشست گاہ تھی اور وہ سامنے ہی بڑی سی چوکی پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بڑے طمطراق سے بیٹھے تھے۔ طمنچہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ قریب ہی دوسرے گاؤ تکیے کے سہارے میرے چھوٹے ماموں نواب زادہ غفران علی بیٹھے ہوئے تھے۔

"ابا حضور! مجرم حاضر ہے۔" یہ کہتے ہوئے ماموں نے میرے گریبان کو جھٹکا دے کر مجھے آگے دھکیلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ میں نے ذرا سی کوشش میں اپنا گریبان ان سے چھڑالیا۔

"تمہاری موت ہی تمہیں کھینچ کر یہاں لائی ہے۔" نواب صاحب گرجے۔ "تم نے ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی

اس گھر کی عزت یعنی زیبا۔" اتنا کہہ کر وہ رک گئے کہنے لگے۔ "تم نے ہماری عزت خاک میں ملا دی ہے۔"

"میں نے کسی کی عزت خاک میں نہیں ملائی۔" میں صاف مکر گیا' پھر بولا۔ "اگر زیبا نے مجھ میں دلچسپی لینے کا کوئی اظہار کیا ہے تو یہ اس کا ایک طرفہ خیال ہے۔"

"ہم اسے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے!" نواب صاحب میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

"یہ میں جانتا ہوں نواب صاحب کہ آپ زیبا کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ زیبا تو آپ کی پوتی ہے' آپ نے تو اپنی سعدیہ کو معاف نہیں کیا تھا۔"

میرے لہجے کے ٹھہراؤ اور اس انکشاف سے ان تینوں چہروں کی رنگت بدل گئی۔ چند لمحے کو کمرے میں بوجھل سی خاموشی پھیل گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" نواب صاحب کی آواز نے خاموشی توڑا۔ وہ مجھ سے سوال کررہے تھے۔

"مطلب یہ ہے نواب صاحب کہ آپ نے بہت عرصے اس حویلی کے باغ میں اپنی بیٹی کے لیے جو قبر کھدوائی تھی' وہ اب تک خالی پڑی ہے۔ آپ لوگ اس وقت یہی سوچ رہے ہوں گے کہ اس قبر میں زیبا کو دفن کردیا جائے۔"

"تم کیا بک رہے ہو!" میرے بڑے ماموں عرفان علی گرج اٹھے۔ اب ان کا لہجہ ذرا سا نرم پڑ گیا تھا۔

"یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ زیبا اور سعدیہ بیگم کے معاملات ایک سے ہیں۔" میرے انکشاف نے ان تینوں کو نڈھال سا کردیا تھا۔ میں نے ان کی انا کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے کہا "اور میں ــــ میں اسی بدنصیب سعدیہ کا بیٹا ہوں۔" میری آواز میں ارتعاش تھا۔

میں نے دیکھا وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ غالباً صورتِ حال ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ان کے چہرے ستے گئے۔ نواب صاحب کی پیشانی پر الجھن اور پریشانی کی لکیریں واضح تھیں مگر کچھ ہی دیر میں وہ اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ حالات سے سمجھوتے پر تیار نہیں۔

پھر وہی ہوا جو میرا قیاس تھا۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولے "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم سعدیہ بیگم کے بیٹے ہو؟"

میں دھیمی اور پُرسکون آواز میں بولا۔ "مجھے اس پر فخر ہے کہ میں ان کا بیٹا ہوں اور اس پر شرمندہ ہوں کہ میرا کوئی رشتہ آپ سے بھی ہے۔" میں کسی مصلحت کو آڑے آنا نہیں چاہتا تھا۔

"ہم تم سے ثبوت طلب کرتے ہیں!" نواب صاحب نے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا۔

"مجھے ثبوت پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے نواب صاحب! میں اس رشتے کے حوالے سے اپنی کسی خواہش کی تکمیل نہیں چاہتا۔ مجھے نہ کسی جاگیر کی ضرورت ہے نہ دولت و جائداد کی! میں ایسے رشتے کا ثبوت فراہم ہی نہیں کرنا چاہتا جس کا کوئی حوالہ آپ لوگ بنیں۔" مجھے اپنے لہجے کی کڑواہٹ کا احساس تھا۔

"لڑکے! زبان درازی نہ کر! اور یہ نہ بھول کہ ہم گستاخوں کی زبان ان کی گدی سے کھنچوا لیتے ہیں۔" نواب صاحب چیخ اٹھے۔

"آپ مجھے میری ماں کی طرح مظلوم اور بے بس نہ سمجھیں نواب صاحب!" میں نے ان کے دونوں بیٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "آپ کو میری ماں پر جو ظلم کرنا تھے' کرلیے۔ آپ نے انہیں گھر سے بے گھر کیا۔ آپ سنگ دل اور بے رحم ہیں۔ آپ نے ظلم کی انتہا کردی تھی۔" میری آواز بتدریج بلند ہوتی گئی۔ "خود ساختہ عزت اور اپنی جھوٹی انا پر آپ نے اپنی بیٹی کو قربان کردیا۔ آپ کیسے باپ ہیں؟ اور ــ یہ لوگ ــ یہ کیسے بھائی ہیں؟ لعنت ہے ایسے رشتوں پر!" میرے لہجے میں حقارت در آئی۔

"تم ہم سے جواب طلبی کررہے ہو' ہم سے! اور ہمارے پاس تمہاری باتوں کا صرف اور صرف ایک ہی جواب ہے۔ یہ کہ ہم تمہیں موت کی نیند سلادیں!" غصے کے سبب نواب صاحب کی آواز بدل سی گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی بھیڑیا غرا رہا ہو۔ الفاظ ختم ہوتے ہی ان کے ہاتھ میں تھمے ہوئے طمنچے کی نال اوپر اٹھنے لگی۔ انہوں نے میرے سینے کا نشانہ لیا تھا۔

*

Scanned By:
Azam & Ali

aazzamm@yahoo.com

اگر مجھے اپنے اندر چھپی ہوئی حیرت انگیز قوتوں کا یقین نہ ہوتا تو شاید موت کو اتنے قریب دیکھ کر حوصلہ ہار دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور بے خوفی سے بولا "چلائیے گولی نواب صاحب! آپ نے میری ماں کو چھپے ہی مارا' میرے باپ کو قتل کرایا' اب میرا سینہ بھی چھلنی کر دیجیے!"

"تمہارا باپ!" نواب صاحب یہ کہتے ہوئے چونک اٹھے۔

"ہاں میرا باپ!" میں نے ترکی بہ ترکی کہا "اس کے قاتل بھی تو آپ ہی ہیں!"

"ہم۔۔۔ ہم تمہارے باپ کو نہیں جانتے!۔۔۔ ہم نے اسے کبھی نہیں دیکھا مگر۔۔۔ مگر ہم سعدیہ۔۔۔ سعدیہ کے بارے میں ضرور جاننا چاہیں گے کہ وہ۔۔۔ وہ کہاں ہے!" اب نواب صاحب کی آواز سے واضح طور پر یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اندر سے ٹوٹنا شروع ہو رہے ہیں۔

"میں اس وقت تک اپنی ماں کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا جب تک آپ میرے باپ کے قتل کا اعتراف نہیں کر لیں گے!" میری آواز میں تلخی تھی۔

"کاش ہم نے تمہارے باپ کو واقعی اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہوتا!" نواب صاحب کے لہجے میں دکھ بھی تھا اور غصہ بھی! چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولے "تمہارے حکم کے باوجود تم نے اب تک یہ ثبوت پیش نہیں کیا کہ تم سعدیہ بیگم کے بیٹے ہو!" ان کا انداز جواب طلبی کا سا تھا مگر اب آواز میں پہلے جیسی تختی باقی نہیں رہی تھی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اب اس معمے کو حل کرنا چاہتے ہیں۔

"میں پہلے بھی آپ کی اس بات کا جواب دے چکا ہوں نواب صاحب کہ مجھے ثبوت پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت میرے یہاں آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ سے اپنے باپ کے قتل کا اعتراف کرا سکوں" میں اپنی بات پر قائم رہا۔

"تم حد ادب سے بار بار تجاوز کر رہے ہو لڑکے!" نواب صاحب پھر برہم ہو گئے "حالانکہ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ سعدیہ بیگم کے بارے میں کچھ جاننے سے پہلے تمہیں ہلاک کر دیں۔ تم ہمارے قہر کو آواز دے رہے ہو!" ان کی بڑی سرخ آنکھوں میں پریشانی تھی۔ غالباً وہ اس بارے میں متذبذب تھے' جو انہیں مجھ سے روا رکھنا تھا۔

"ابا حضور!" سہا میرے بڑے ماموں نواب زادہ ... علی بول اٹھے "یہ اس طرح نہیں مانے گا۔ اس کی ... کھلوانے کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ ... شکنجے میں کسنا پڑے گا۔ جب اس کی ہڈیاں ٹوٹنے لگیں گی ... خود ہی سارا سبق فر فر سنانا شروع کر دے گا۔"

"بھائی جان کا مشورہ درست ہے ابا حضور!" ... چھوٹے ماموں نواب زادہ نفران علی نے بھی تائید کی "... مجھے ایذا رسانی کے آلات لانے کی اجازت مرحمت فرما دیجیے! موجودہ حالات کے پیش نظر اس کی زبان کھلوانا ضروری ہو گیا ہے۔ ہم تینوں کے سوا جن باتوں کا علم ... نہیں تھا' آخر اسے وہ باتیں کیسے معلوم ہو گئیں! اس کا وجود ہماری عزت و آبرو کے لیے شدید خطرہ بن سکتا ہے۔"

نواب صاحب اپنے دونوں بیٹوں کی باتیں سن کر کچھ دیر خاموش رہے۔ ان کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے۔ پھر جب وہ بولے تو ان کی آواز میں ... سختی و سفاکی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے "اس مسئلے کا ایک حل یہ بھی تو ہے کہ یہ قصہ ہمیشہ کے لیے یہیں ختم کر دیا جائے۔ اس گستاخ لڑکے کی زبان بند کر دی جائے' اسے موت کی نیند سلا دیا جائے۔ یوں بھی یہ اسی سزا کا مستحق ہے کہ اس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے" یہ کہہ کر نواب صاحب نے تصدیق طلب نظروں سے باری باری اپنے دونوں بیٹوں کی طرف دیکھا۔

"بجا فرمایا ابا حضور!" بڑے ماموں نے کہا "مگر اس طرح اب یہ قصہ ختم نہیں ہوگا۔ سعدیہ بیگم کے بارے میں تو اب یہ جاننا ضروری ہو گیا ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

"تو پھر ٹھیک ہے' مار مار کر ادھ موا کر دو اس کی کھال! اسے اس وقت تک اذیتیں دو جب تک یہ زبان نہ کھولے!" نواب صاحب نے فیصلہ سنا دیا۔

میں ان کی یہ ساری باتیں اس طرح سنتا رہا جیسے ان باتوں کا تعلق مجھ سے نہ ہو اور وہ میرے بجائے کسی دوسرے کو اذیتیں دینے کی بات کر رہے ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور پھر بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ نواب صاحب کی طرف بڑھنے لگا۔

"رک جاؤ' ورنہ میں گولی مار دوں گا!" نواب صاحب گرجے۔

"پھر چلائیے نا گولی' روکا کس نے ہے!" میں بدستور ان کی طرف بڑھتا رہا۔ اس وقت میرے ذہن میں پُراسرار ... باتیں کرنے والی اسی کے یہ الفاظ گونج رہے تھے کہ تمہارے وجود میں ایسا حفاظتی نظام پوشیدہ ہے جو خود بخود اس وقت حرکت میں آ جاتا ہے جب تمہیں کوئی خطرہ درپیش ہے۔ اسی یقین پر میں نے دانستہ خود کو شدید خطرے میں ڈال رہا تھا۔ میری نظریں نواب صاحب کے ہاتھ میں موجود پستول پر جمی ہوئی تھیں جس کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

اچانک میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ نواب صاحب کی انگلی کا دباؤ طمنچے کے ٹریگر پر بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے گرمی محسوس ہوئی اور میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اسی وقت دو باتیں ہوئیں۔ میرا وجود غائب ہو گیا اور گرا زبردست دھماکے سے گونج اٹھا۔

نواب صاحب نے مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ ان کی چلائی ہوئی گولی مجھے کوئی نقصان پہنچائے بغیر میرے نادیدہ وجود کے درمیان سے گزر گئی تھی۔ میرے لیے یہ ایک اور حیرت ناک تجربہ تھا کہ نادیدہ ہونے کے بعد میرے جسم کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ پہلی بار نادیدہ ہونے کے بعد میں خوف زدہ ہو گیا تھا مگر اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا جسم واپس مل جائے گا۔ اسی دوسرے تجربے کے دوران میں مجھے ایک بات کا احساس اور ہوا۔ یہ احساس بھی میرے لیے عجیب ہی تھا۔ میرا جسم خود میری اور دوسروں کی نظروں سے اوجھل تو ہو گیا تھا لیکن اس کی موجودگی کسی شک و شبے سے بالاتر تھی۔ میرے تمام حواس بیدار تھے۔ میں چل پھر سکتا تھا' اپنے جسم کو حرکت دے سکتا تھا۔

مجھے اپنی نظروں کے سامنے غائب ہوتے دیکھ کر وہ سب گنگ سے ہو کر رہ گئے تھے۔ شدید حیرت نے انہیں بے جان مجسموں کے مانند بنا دیا تھا۔ ہرچند کہ مجھے اس طمنچے سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا' پھر بھی میں نے آگے بڑھ کے نواب صاحب کے ہاتھ سے طمنچہ چھین لیا۔

نواب صاحب تیورا کر جوکی پر ڈھیر ہو گئے۔ یقیناً ان کے بوڑھے اعصاب جواب دے گئے تھے۔

"ابا حضور!۔۔۔ ابا حضور!" کہتے ہوئے ان کے دونوں بیٹے ان پر جھک گئے۔ میں طمنچہ ہاتھ میں تھامے ان کے قریب ہی کھڑا تھا مگر وہ میری طرف متوجہ نہیں تھے ورنہ شاید طمنچے کو فضا میں معلق دیکھ کر وہ دونوں بھی چیخ اٹھتے۔

اسی وقت مجھے خیال آیا کہ اگر میرے والد کو انہی لوگوں نے قتل کیا ہے تو اس کا علم میرے دونوں ماموؤں کو بھی ہوگا بلکہ ممکن ہے' یہ دونوں ہی میرے والد کے قاتل ہوں۔ میں ابھی اس سلسلے میں ان دونوں سے استفسار کرنے ہی والا تھا کہ مجھے اسی کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی۔ میں چونک اٹھا۔

"طارنوش!" اسی کی سرگوشی ابھری "میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ تمہارے والد کے قاتل یہ لوگ نہیں ہیں۔"

"پھر۔۔۔ پھر کس نے انہیں قتل کیا ہے؟" میں بڑبڑایا۔

"معلوم ہو جائے گا تمہیں! مگر ابھی نہیں۔ ابھی تمہارے یہ جاننے کا وقت نہیں آیا۔"

پھر اس سے پہلے کہ میں اسی سے مزید کوئی سوال کر سکتا اس کی مخصوص خوشبو معدوم ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جا چکی

ہے۔ بہرحال اس کی آمد سے مجھے کم از کم یہ تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ نواب صاحب یا ان کے دونوں صاحب زادے میرے والد کے قتل میں ملوث نہیں ہیں۔ اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ تھا کہ میرے والد کو کس نے اور کیوں قتل کیا ہے؟ اسی کو یقیناً اس سوال کا جواب معلوم تھا مگر کسی سبب ابھی وہ کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔

نواب صاحب اور میرے دونوں ماموں 'میری ماں کے سلسلے میں تو یقیناً مورد الزام ٹھہرائے جاسکتے تھے لیکن میرے والد کے قتل سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے غلط قیاس کیا تھا۔ جو کچھ سوچ کر میں یہاں آیا تھا' وہ غلط ثابت ہونے کی صورت میں میرا غصہ بڑی حد تک کم ہو گیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے مجھے زیبا کا خیال آگیا۔ میں اب یہاں آ ہی گیا تھا تو کم از کم وقتی طور پر اسے بھوک پیاس کے عذاب سے نجات دلا سکتا تھا۔ بہرحال مجھی سے اقرار محبت کے سبب وہ اس عذاب میں گرفتار ہوئی تھی۔ ابھی تک میرے ذہن میں یہ نہیں آیا تھا کہ میں اسے اس کے گھر والوں کے ظلم و ستم سے کس طرح بچا سکتا ہوں!

زیبا کا خیال آتے ہی میں نے اس کے پاس پہنچنے کا فیصلہ کرلیا۔ طمنچہ میں نے چوکی کے قریب ایک طرف ڈال دیا۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اس لیے آواز نہیں ہوئی۔ جب میں کمرے کے بند دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا تو نواب صاحب کو ہوش آگیا۔ میرے چھوٹے ماموں نے ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ میں نے اچانک نواب صاحب کی آواز سنی تو میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

"طارنوش ___ وہ ___ وہ کہاں گیا؟" نواب صاحب پوچھ رہے تھے۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ نواب صاحب کو سہارا دے کر گاؤ تکیے کو ان کی کمر کے پیچھے رکھنے والے میرے بڑے ماموں تھے۔

"ابا حضور! وہ ___ کوئی خبیث روح معلوم ہوتا ہے جو ___ جو کمرا بند ہونے کے باوجود غائب ہو گیا!" بڑے ماموں نے جواب دیا۔

معلوم نہیں مجھے کیا سوجھی کہ میں ایک دم بول اٹھا "جسے آپ خبیث روح کہہ رہے ہیں' وہ اس وقت بھی اسی کمرے میں موجود ہے۔"

میری آواز سن کر وہ تینوں ہی اچھل پڑے۔ ان کے چہروں سے شدید خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

ان کے خوف سے فائدہ اٹھا کر میں نے انہیں دھمکی دی

"سنیے! اگر آپ لوگوں نے زیبا پر ظلم و ستم توڑے تو میں سب کا جینا حرام کردوں گا! آپ سمجھ ہی چکے ہوں گے کہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"مم ___ مگر تم ___ تم کون ہو؟" چھوٹے ماموں نے ... کر کے پوچھا۔

مجھ سے جو سوال کیا گیا تھا' اس کا سبب محض خو... ورنہ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے لیے میری آواز اجنبی تھی۔ میں نے اسی لیے جواب میں کچھ نہیں کہا اور درو... کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دروازے کے قریب پہنچ ... نے اطمینان سے کنڈی کھولی اور پھر باہر نکل گیا۔

"وہ ___ وہ جا رہا ہے ___ وہ چلا گیا!" اچ... مجھے بڑے ماموں کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

دروازے کے باہر ملازم موجود تھا مگر ظاہر ہے اسے نظر نہیں آیا۔ اس کے قریب سے گزر کر میں ... کے ساتھ زیبا کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ راستے ... ایک راہداری سے گزرتی ہوئی رابعہ نظر آئی۔ وہ گلا... سوٹ میں خود بھی ایک شرارہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ... تین کنواروں میں سے ایک تھی جو بہ یک وقت میر... میں نیام ہونے کی آرزومند تھیں۔ رابعہ میرے ... ماموں کی بیٹی تھی۔ میں اس کی طرف کھنچا چلا گیا۔

"سنو رابعہ!" میں نے اس کے قریب پہنچ ک... سے اسے مخاطب کیا۔

"طارنوش!" وہ رک گئی اور پھر چونک کر اد... دیکھنے لگی۔

میں نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور پھر خرا... وصول کرنے لگا۔

"چھوڑ دو مجھے ___ چھوڑ دو!" وہ وحشت زدہ آوا... اور میری گرفت سے نکلنے کے لیے زور لگانے لگی۔

"اچھا جاؤ' پھر کبھی سہی!" یہ کہتے ہوئے میں ... چھوڑ دیا۔

وہ میری گرفت سے نکلتے ہی اس طرح وحشت... ایک طرف بھاگی جیسے موت اس کے تعاقب میں ہو... یہ ہوئی کہ کسی نے اسے یوں بھاگتے ہوئے نہیں... ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ میں نے چند روز پہلے... تصور سے جو حسین منظر دیکھے تھے' انہی میں سے ایک... حقیقت بن گیا تھا۔ میں ایک کیف آگیں تجربے... تھا۔ اسی لذت سے سرشار میں زیبا کے کمرے تک... دروازے پر کنڈے چڑھی ہوئی تھی۔ آس پاس...

نہیں تھا اور اگر کوئی ہوتا بھی تو میرے لیے کچھ فرق نہ پڑتا۔

دروازے کی کنڈی کھول کر میں بلا جھجک کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا معلوم نہیں کیوں کمرے میں قدم رکھتے ہی میرے اعصاب کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ میں نے دائیں جانب بچھی ہوئی مسہری کی طرف نظر دوڑائی۔ زیبا اس پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھ کر مسہری کے قریب پہنچ گیا پھر میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا اسے دیکھ کر میرا دل دہل گیا۔ میں نے یہ تو نہیں چاہا تھا۔

زیبا کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ میں ایک ہی نظر میں سب کچھ سمجھ گیا۔ یقیناً اس نے چوڑیاں پیس کر کھالی تھیں۔ ذلت و رسوائی سے بچنے کے لیے اس نے موت کو گلے لگا لیا تھا' خودکشی کرلی تھی۔ ایک باپ کے ظلم نے ایک بیٹی کی جان لے لی تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ زیبا کے معاملے میں میں نے خود کو بھی مجرم محسوس کیا۔ میری ہی وجہ سے وہ اس حال کو پہنچی تھی میرا دل دکھ سے بھر گیا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہر چند کہ مرنے والی سے مجھے محبت نہیں تھی مگر وہ تو مجھے چاہتی تھی۔ میں تو اس گھر کے افراد سے انتقام لینا چاہتا تھا' انہیں پچھتاووں کی موت مارنے کا ارادہ رکھتا تھا' پھر خود پچھتاوے کا شکار کیسے ہو گیا تھا؟ بازی الٹ کیسے گئی تھی؟ معلوم نہیں کب تک اور کتنی دیر میں انہی سوالوں کے گرداب میں ڈوبتا ابھرتا رہا! مجھے ہوش اس وقت آیا جب اسی گھر کی ایک ملازمہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ کسی کو مخاطب کر کے بلند آواز میں بتا رہی تھی کہ زیبا کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

میں بوجھل قدموں کے ساتھ زیبا کے کمرے سے نکل گیا۔ میری بڑی ممانی' ملازمہ کے ساتھ کمرے کی طرف آرہی تھیں۔ وہاں کچھ ہی دیر بعد کہرام مچنے والا ہے" اس خیال ہی سے میرا دل کٹنے لگا۔ پھر میں وہاں مزید نہیں رکا اور تیزی کے ساتھ کوٹھی کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ابھی اس کوٹھی سے نکل کر میں نے چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ مجھے شدید لغزش کا احساس ہوا۔ اسی کے ساتھ میرا جسم مجھے واپس مل گیا۔ اپنے گھر پہنچنے تک میری آنکھوں میں زیبا کا چہرہ گھومتا رہا' اس کی بھولی باتیں یاد آتی رہیں۔ میں سوچتا رہا کاش اس نے اتنی جلد بازی نہ کی ہوتی! میں نے تو معاملے کو سنبھال ہی لیا تھا۔ میری واضح تلقین کے

بعد یقیناً زیبا پر مزید ظلم و ستم نہ کیے جاتے اور پھر شاید اسے خودکشی کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑتا۔

جو واقعات آج پیش آئے تھے' انہیں مد نظر رکھتے ہوئے مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ زیبا کی بے وقت موت سے مجھ کو بھی آگاہ کیا جائے گا! اب اس کوٹھی والوں سے میرے ملنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ میرے وجود کو وہ لوگ بھلا کس طرح برداشت کرسکتے تھے! میں نے تو ان کی عزت و وقار کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ انہیں خود انہی کی نظر میں گرا دیا تھا' ان کے اصل چہرے بے نقاب کردیے تھے۔

پھر وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ زیبا کی ناوقت موت کی اطلاع مجھے نہیں دی گئی۔ دوسرے دن صبح اس کا جنازہ اٹھا۔ گھر کے باہر میں پہلے ہی سے اس کا منتظر تھا۔ زیبا کا جنازہ قبرستان لے جایا جا رہا تھا۔ آگے بڑھ کر میں بھی اس میں شریک ہو گیا۔ جس وقت میں اس مظلوم و بے گناہ لڑکی کے جنازے کو کاندھا دے رہا تھا' دل ہی دل میں کہہ رہا تھا' زیبا! مجھے معاف کردینا کہ تم میرے انتقام کی زد میں آگئیں۔

اسی دوران میں میری نظر عظمت علی اور خاندان کے دوسرے افراد پر بھی پڑی۔ مجھے جنازے میں شریک دیکھ کر ان کے چہروں پر کھچاؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ دور تک جنازے کے ساتھ جا کر میں لوٹ آیا۔ زیبا کے جنازے کو کاندھا دے کر اور اپنی دانست میں اس سے معافی مانگ کر میرے دل کو بڑی حد تک سکون حاصل ہو گیا تھا۔ اس روز مجھے اپنی محبوبہ گلونت کور سے بھی ملنا تھا۔ اس کے عشق میں اب بڑی شدت آگئی

تھی۔ ہماری ملاقاتیں حسب دستور ہفتے میں کم سے کم دو دن اس کی سہیلی شانتی کے گھر ہوجاتی تھیں۔ شانتی ہم دونوں کے عشق کی رازداری ہوئی تھی۔

وقت مقررہ پر میں پہاڑ گنج پہنچ گیا۔ کلونت کور مجھ سے پہلے اپنی ہندو سہیلی شانتی کے گھر پہنچ چکی تھی۔ مجھے اور کلونت کور کو بیٹھک میں چھوڑ کر شانتی اندر گھر میں چلی گئی۔ میرے چہرے سے یقیناً اداسی کا اظہار ہو رہا تھا جو کلونت کور سے بھی چھپا نہ رہ سکا۔

"کیا بات ہے طارنوش، تم کچھ اداس اداس سے لگ رہے ہو؟" وہ بولی۔

کلونت کور کو میں زیبا کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا اس لیے زبردستی مسکرا کر کہنے لگا "نہیں تو! میں کیوں اداس ہوتا؟ ہاں رات کو کوشش کے باوجود سو نہیں سکا جس کی وجہ سے طبیعت کچھ نڈھال ہے۔ شاید اسی لیے میں اداس اداس لگ رہا ہوں۔"

"کیوں، سوئے کیوں نہیں؟ کوئی خاص بات تھی کیا؟" وہ فکرمند لہجے میں پوچھنے لگی۔

"دراصل تمہاری طرف دھیان چلا گیا تھا" میں نے بہانہ بنایا "مجھے یہ خیال آگیا تھا کہ ہم ایک کس طرح ہوں گے!"

"کبھی کبھی میں بھی یہ سوچنے لگتی ہوں تو میری نیند اڑ جاتی ہے۔ کوئی راہ نکالو طارنوش! ہم اس طرح کب تک بچھڑے رہیں گے؟ یونہی کب تک چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے؟ جب سے ماں کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے، وہ میری شادی کی باتیں کرنے لگی ہے۔ مجھے تو یہ باتیں سن سن کر ڈر لگنے لگا ہے۔ اگر سچ مچ انہوں نے کسی اور سے میری شادی کردی تو کیا ہوگا؟" یہ کہتے ہوئے کلونت کور میرے قریب آگئی۔

ہرچند کہ شانتی کے گھر میں کلونت کور اور میں ہر طرح محفوظ رہتے تھے اور ملاقات کے دوران میں وہ نہیں آتی تھی پھر بھی ہم محتاط رہتے تھے۔ وہ بہرحال دوسرے کا گھر تھا، مگر وہ لمحات بڑے جذباتی تھے۔ میں نے کلونت کور کو خود سے قریب تر کرلیا اور جذبات سے بوجھل آواز میں بولا "تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا! تم ۔۔۔ تم میری ہو، صرف اور صرف میری ہو ۔۔۔ میری ہی رہو گی۔"

جذبات کا دریا چڑھتا رہا اور دو محبت کرنے والے دلوں کی دھڑکنیں ایک ہوتی رہیں۔ حالانکہ میرے ذہن میں اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا مگر میں اسے دلاسے دیتا رہا۔ مجھ پر لیکن اس پر بھی خود فریبی کی کیفیت طاری تھی۔ خوش گمانیاں عارضی طور پر ہی سہی، سکون تو پہنچا دیتی ہیں۔ یہی حال اس وقت ہم دونوں کا تھا۔

میں اس دن پہاڑ گنج سے لوٹ رہا تھا تو میرے ذہن پر ایک بوجھ یہ بھی تھا۔ اگر کلونت کور کے گھر والوں نے واقعی اس کی شادی کسی سے کردی تو؟ اس سے زیادہ سوچنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں تو اس سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اسی روز شام کے وقت ڈیڈی کو دفتر سے آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ نواب فرقان علی کی کوٹھی کا ایک ملازم ان سے ملنے آگیا۔ وہ ڈیڈی کے لیے نواب صاحب کا کوئی پیغام لے کر آیا تھا۔ ہمارے ایک ملازم نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ پھر جب ڈیڈی اس سے ملنے ڈرائنگ روم میں گئے تو میں بھی تجسس سے مجبور ہو کر ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

نواب صاحب کا ملازم، ڈیڈی کو یہ پیغام دینے آیا تھا کہ نواب صاحب ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ ملازم کے جانے سے پہلے میں کھڑکی سے ہٹ گیا۔

ڈیڈی کے لیے یہ بلاوا غیر متوقع تھا۔ ان کے علم میں تھا کہ میں نواب صاحب کے یہاں آتا جاتا ہوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نواب صاحب سے میرا کیا رشتہ ہے؟ محلے داری کے ناتے نواب صاحب سے ڈیڈی کی رسمی سی سلام دعا تھی، مگر میل ملاپ یا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا نہیں تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں نواب صاحب نے بلوایا تھا۔ میں نے اسے بھی نواب صاحب کا تمکنت و غرور ہی تصور کیا۔ انہیں اگر ڈیڈی سے ملنا ہی تھا تو خود بھی آسکتے تھے۔

اس خلاف توقع بلاوے کا پس منظر جاننے یا پھر کچھ اور سوچ کر ڈیڈی میرے کمرے میں آگئے۔ انہوں نے مجھے نواب صاحب کے پیغام سے آگاہ کیا، پھر کہنے لگے "طارنوش بیٹے! تمہارے خیال میں نواب صاحب نے مجھے کیوں بلایا ہوگا؟"

نواب صاحب کے بلاوے کا مقصد کسی حد تک میری سمجھ میں آگیا تھا، مگر میں نے لاعلمی کا اظہار ہی کیا، پھر بولا "ڈیڈی! وہ نواب ہوں گے تو اپنے گھر کے! آپ کوئی ان کی عملداری میں نہیں بستے کہ وہ آپ کو اپنے حضور طلب فرمائیں" میرے لہجے میں تلخی تھی۔

"مت بھولو طارنوش کہ وہ تمہارے بزرگ ہیں۔ تمہیں ان کے لیے ایسے الفاظ ادا نہیں کرنا چاہئیں۔ جہاں

تک مجھے بلانے کا تعلق ہے تو وہ بہرحال عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ میں اگر ان کے بلانے پہ چلا جاؤں گا تو اس سے میری عزت کم نہیں ہوجائے گی۔ محلے داری اور اخلاق کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ویسے تم ان کی طرف سے کچھ برگشتہ سے معلوم دیتے ہو، تم سے تو ان کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوگئی؟" ڈیڈی نے مجھے کریدنا چاہا۔

"ان سے مل کر آپ کو خود ہی معلوم ہوجائے گا کہ کیا بات ہے؟" میں نے کوئی قطعی بات نہیں کی، پھر کچھ سوچ کر بولا "ویسے میرا اندازہ یہی ہے کہ وہ میرے ہی متعلق آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہوں گے۔ اخلاقی تقاضے سے مجبور ہو کر اگر آپ خود ہی ان سے ملنے جارہے ہیں تو میری تجویز یہ ہے کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔ اس سے میرا مقصد یہ ہے ڈیڈی کہ اگر نواب صاحب میرے بارے میں کوئی غلط بیانی کریں تو میں ان کے منہ پر اس کی تردید کرسکوں۔"

ڈیڈی میری بات سن کر کچھ دیر کو سوچ میں پڑ گئے اور پھر مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہوگئے۔ ڈیڈی لباس تبدیل کرنے اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں بھی جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔

ذرا ہی دیر کے بعد میں ڈیڈی کے ساتھ نواب صاحب کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ کوٹھی پر عجیب سی سوگواری طاری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ زیبا کی اچانک موت ہی تھی۔ مجھے اور ڈیڈی کو کوٹھی کے مردانہ حصے کی نشست گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ آج میں اس کوٹھی میں بالکل اجنبیوں کی طرح آیا تھا۔

غالباً نواب صاحب کو ملازم نے بتادیا تھا کہ میرے ڈیڈی اکیلے نہیں آئے ہیں اور ان کے ساتھ میں بھی ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ نشست گاہ میں آئے تو مجھے وہاں دیکھ کر چونکے تو نہیں البتہ ان کے چہرے پر میں نے تناؤ سا ضرور محسوس کیا۔ میرے ڈیڈی انہیں آتے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہوگئے اور مجبوراً مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا حالانکہ میں ذہنی طور پر اس کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

"تشریف رکھیے!" نواب صاحب نے ڈیڈی کے سلام کا جواب دے کر ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ پھر جب ہم دونوں بیٹھ گئے اور نواب صاحب نے بھی گاؤ تکیے سے ٹیک لگالی تو بولے "ڈیسوزا صاحب! ہرچند کہ ہم آپ سے خلوت میں گفتگو کرنے کے متمنی تھے مگر یہ صاحبزادے بھی ساتھ آگئے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمیں پہلے انہی کے متعلق گفتگو کرنا تھی" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے نواب صاحب نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

ڈیڈی سنبھل کر بیٹھ گئے، پھر بولے "جی ارشاد ہو نواب صاحب! میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"ہمارے علم و اطلاع کے مطابق یہ صاحب زادے آپ کے فرزند ہیں۔ ہم آپ سے اس کی تصدیق چاہتے ہیں۔" نواب صاحب نے کہا۔

ڈیڈی، نواب صاحب کی اس بات پر چونکے، پھر چند لمحے بعد بولے "میں کچھ سمجھ نہیں سکا نواب صاحب کہ اس میں تصدیق کی کیا بات ہے؟"

"کوئی تو بات لازماً ایسی ہے ڈیسوزا صاحب جو ہم تصدیق چاہتے ہیں" نواب صاحب اپنی بات پر قائم رہے، پھر کہنے لگے "ہم یہ تصدیق کیوں چاہتے ہیں، اس کی وجہ بھی آپ سے بیان کردیں گے۔ پہلے آپ ہمارے سوال کا جواب دے دیں۔"

"یہ تو سبھی کو علم ہے ۔۔ نواب صاحب کہ طارنوش میری ہی اولاد ہے" ڈیڈی نے بالآخر جواب دیا۔

"مگر طارنوش کا دعویٰ ہے کہ ہماری گمشدہ صاحب زادی سعدیہ بیگم اس کی ماں ہیں" نواب صاحب نے تیز لہجے میں کہا "کیا آپ اس دعوے کے باوجود اپنے گزشتہ بیان پر قائم رہیں گے ڈیسوزا صاحب؟"

اسی دوران میں ڈیڈی نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا اور میں نے نظریں جھکالی تھیں۔

"نواب صاحب! اگر صرف خون ہی کے رشتے سب کچھ ہوتے ہیں تو ۔۔۔ تو پھر طارنوش سے میرا کوئی رشتہ نہیں" ڈیڈی کی آواز میں دکھ تھا۔ وہ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید بولے "میں بس اتنا کہوں گا کہ طارنوش کی ماں کو میں نے اپنی بہن کی طرح سمجھا تھا اور اس رشتے سے بہن کی اولاد اپنی ہی اولاد کے برابر ہوتی ہے۔ طارنوش کو میں اپنی اولاد ہی کی طرح چاہتا ہوں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ طارنوش عیسائی نہیں، مسلمان ہے!" نواب صاحب کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"جی ہاں طارنوش مسلمان ہے اور میں نے اس سے یہ بات بھی نہیں چھپائی" ڈیڈی بولے "خداوند خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نے طارنوش کی ماں سے جو عہد کیا تھا، اسے پورا کرنے میں کامیاب رہا۔"

میں نے نواب صاحب کو چونکتے ہوئے دیکھا۔ ڈیڈی کی بات سن کر وہ مضطرب سے ہوگئے تھے۔ وہ فوراً ہی بول اٹھے "عہد کیا تھا، اس سے کیا مراد ہے آپ کی؟ کیا یہ بات ماضی کی

ہے؟"

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ گفتگو اب کس مرحلے میں داخل ہونے والی ہے! اب گفتگو میں میرا مداخلت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں اسی لیے ڈیڈی کے ساتھ آیا بھی تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈیڈی جواب میں کچھ کہتے' میں نے نواب صاحب کو مخاطب کیا "ضروری نہیں نواب صاحب کہ آپ کے ہر سوال کا جواب دیا جائے" میرے لہجے میں کڑواہٹ گھلی ہوئی تھی "میں جانتا ہوں کہ آپ ڈیڈی سے میری ماں کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں اور ڈیڈی یا میں آپ کو کچھ بھی نہیں بتائیں گے!"

"طارنوش!" ڈیڈی مجھ سے بولے "بچے بزرگوں سے اس طرح کلام نہیں کیا کرتے بیٹے!" ان کی آواز میں نرمی تھی۔

"مگر ڈیڈی' میں ——— میں انہیں اپنا بزرگ نہیں سمجھتا!" میرے لہجے کی چبھن برقرار رہی "انہیں میری ماں کے بارے میں کچھ پوچھنے کا کوئی حق نہیں!"

"نہیں طارنوش بیٹے' نہیں! ——— یہ ظلم ہے اور ——— اور میں ایک باپ پر یہ ظلم نہیں کر سکتا" ڈیڈی نے جذباتی ہو کر کہا۔

"تو پھر انہوں نے میری ماں پر ظلم کیا' اس کا حساب ان [illegible] میں تلخی سے بولا۔

"اس کا حساب ان سے خداوند لے گا اور وہی سب سے بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ جب تک یہ قصہ دبا ہوا تھا' دبا رہا' مگر اب خود تم ہی نے اس قصے کو چھیڑ کر اخلاقی طور پر مجھے اس کے لیے مجبور کر دیا ہے کہ میں نواب صاحب کو ان کی صاحبزادی سعدیہ بیگم کے بارے میں حقائق سے آگاہ کروں۔"

میرے اندر اتنی ہمت و جرأت نہیں تھی کہ ڈیڈی کی نافرمانی کر سکتا اس لیے خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"پوچھیں نواب صاحب! آپ سعدیہ بیگم کے بارے میں کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" ڈیڈی' نواب صاحب سے مخاطب ہوئے۔

"وہ سب کچھ جو آپ اس کے متعلق جانتے ہیں" نواب صاحب بھاری آواز میں بولے۔

پھر ڈیڈی نے از اول تا آخر نواب صاحب کو وہ سب کچھ بتا دیا جو ان کے علم میں تھا اور جس سے میں بھی واقف تھا۔

میں نے اس دوران میں نواب صاحب کی آنکھوں میں آنسو دیکھے جنہیں منہ پھیر کر انہوں نے چھپانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ڈیڈی جب وہ دکھ بھری داستان سنا چکے تو نواب صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ڈیسوزا صاحب' بہ خدا آپ عظیم انسان ہیں۔ یقیناً آپ نے ہم پر احسان عظیم کیا ہے' ایسا احسان جو ہم چاہیں بھی تو زندگی بھر نہیں اتار سکتے۔ کاش! ——— کاش سعدیہ مرحومہ نے خاندانی روایات کی پاسداری کی ہوتی! ——— کاش اس نے ہمارے علم و اطلاع میں لا کر شادی کی ہوتی تو ——— تو شاید وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔ اب ہمیں یقین آ گیا کہ طارنوش' ہماری سعدیہ ہی کا فرزند ہے اور ہم یہ بھی سمجھ گئے کہ اس کے انداز و اطوار میں باغیانہ پن' تلخی اور خودسری کیوں ہے؟ ——— یہ سب حالات کا تقاضا ہے۔ ہماری دولت و جائداد میں مرحومہ کا جو حصہ تھا' وہ ہم طارنوش کے نام ———"

"نہیں!" میں نواب صاحب کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھا "مجھے کچھ نہیں چاہیے! ——— کچھ بھی نہیں! میں نے اس غرض سے آپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں سعدیہ بیگم کا بیٹا ہوں۔ میں ——— میں تو آپ لوگوں کو آپ کے ظلم کا احساس دلانا چاہتا تھا' اس کے سوا میرا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔"

"تمہارا جو بھی مقصد رہا ہو' اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں' مگر جو تمہارا حق ہے وہ ہم ضرور ادا کریں گے ——— ہم تمہاری حق تلفی کرنا نہیں چاہتے" نواب صاحب نے کہا "ناوانستگی میں تمہاری ماں پر جو ظلم ہوا ہم ——— ہم اس پر شرمندہ ہیں" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے شدت جذبات سے نواب صاحب کی آواز بوجھل ہو گئی۔

ان کے اس طرح اظہار شرمندگی کا یقیناً میرے دل پر اثر ہوا' مگر فوراً ہی مجھے زیبا یاد آ گئی اور میں بولا "ظلم تو آپ کے خاندان کے خمیر میں شامل ہے نواب صاحب! اس ظلم کا تازہ شکار زیبا ہے' جس کا کفن بھی ابھی میلا نہیں ہوا ہو گا۔"

"ہمارے زخموں کو نہ چھیڑو کہ اب ہمارے اندر کچھ سہنے کا حوصلہ نہیں اور ——— اور اب تو کم از کم ہمیں اجنبیوں کی طرح مخاطب نہ کرو! ہم ——— ہم تمہارے لیے نواب صاحب نہیں بلکہ نانا ——— نانا حضور ہیں۔ میرے بچے! ہمیں ——— ہمیں نانا حضور کہو!" نواب صاحب کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔

میرے اندر انتقام کا دہکتا ہوا الاؤ سرد پڑتا جا رہا تھا۔ شاید یہ اس خاندان کے لہو کا اثر تھا جو میری رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ میرا سر جھکتا چلا گیا اور پھر میں نے مزید نشتر زنی نہیں کی۔

"طارنوش بیٹے!" نواب صاحب پھر بولے "یہ گھر اب

تمہارا ہے۔ اس کے دروازے تمہارے لیے کھلے رہیں گے۔ تم چاہو تو یہاں رہ بھی سکتے ہو۔ ہم تمہارے لیے کوٹھی کا ایک حصہ مخصوص کر دیں گے" انہوں نے پیش کش کی۔

"نہیں!" میں نے انکار کر دیا "میں ڈیڈی ہی کے ساتھ رہوں گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی" وہ بولے "مگر ہم تم سے یہ ضرور کہیں گے کہ یہاں آتے جاتے رہنا۔ تمہاری صورت کو ہماری آنکھیں ترستی رہیں گی۔ آؤ! ——— آؤ اب ہمارے سینے سے لگ جاؤ! ——— اٹھو میرے بچے!" انہوں نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔

میں نے لاکھ چاہا کہ اپنی جگہ بیٹھا رہوں مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کسی نادیدہ قوت نے مجھے اٹھ کر کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا اور پھر میں نواب صاحب یعنی اپنے نانا کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سما گیا۔ انہوں نے میری پیشانی اور رخساروں پر بوسوں کی بارش کر دی پھر مجھے سینے سے لگا لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے تپتی ہوئی دھوپ میں سایہ مل گیا ہو۔ زندگی میں پہلی بار مجھے عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ پھر خود بہ خود میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور ان آنسوؤں میں دل کا سارا غبار بہہ گیا۔ میرے نانا بھی رو رہے تھے اور میں بھی رو رہا تھا۔

"میرے بچے!" میرے نانا میری پشت تھپک کر مجھے تسلیاں دینے لگے "چپ ہو جاؤ! نہ روؤ ورنہ ہمارا کلیجہ پھٹ جائے گا۔"

"نانا حضور!" میرے منہ سے جیسے خود بہ خود نکلا۔

انہوں نے ایک بار پھر میری پیشانی چوم لی' پھر آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگے "آؤ ہمارے ساتھ! ہم تمہاری نانی اور ماموؤں کو یہ خوش خبری سنائیں" پھر انہیں ڈیڈی کا خیال آ گیا اور بولے "آپ تشریف رکھیے! ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں اور آپ کے لیے چائے بھجواتے ہیں۔"

"اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں نواب صاحب! میرا خیال ہے کہ میں چلتا ہوں" ڈیڈی نے کہا۔

"نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے! آپ پہلی بار تو غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ ابھی تو ہمیں آپ کا منہ بھی میٹھا کرانا ہے' طارنوش کے ملنے کی خوشی میں!"

مجبوراً ڈیڈی کو رکنا پڑا۔ میں اپنے نانا نواب فرقان علی کے ساتھ گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔

یہ دنیا واقعی دکھ سکھ کا میلا ہے' اس کا عملی تجربہ مجھے اس روز ہوا۔ وہ گھر جس میں گزشتہ روز سے صفِ ماتم بچھی

ہوئی تھی' وہاں جشن کا سا سماں تھا۔ اس گھر کا کوئی فرد بھی ایسا نہیں تھا جو میرے لیے اجنبی رہا ہو۔ وہ مجھ سے اور میں ان سب سے واقف تھا' مگر اب یہ واقفیت لہو کے رشتوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ میرے نانا نے گھر کے تمام افراد کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ پھر ایک ملازم مٹھائی لے آیا اور سب کا منہ میٹھا کرایا گیا۔

میرے دوست اور ماموں زاد حشمت علی کو شاید یہ گمان بھی نہ ہو گا کہ میں پھر کبھی اس گھر میں قدم رکھ سکوں گا۔ وہ اپنی جوان بہن کی موت پر اداس تو تھا مگر مجھ سے بڑی خوش دلی اور محبت کے ساتھ ملا۔ زیبا سے بڑی بہن زاہدہ اور چھوٹے ماموں کی بیٹی رابعہ کے چہرے بھی اترے ہوئے تھے' مگر میرے متعلق انکشاف سے ان کے چہروں پر بھی رونق آ گئی۔

اس رات جب میں ڈیڈی کے ساتھ اپنے نانا کی کوٹھی سے واپس آ رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری روح سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ میں نے اپنے اندر ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی تھی۔ گھر پہنچ کر ڈیڈی نے ممی کو یہ خوش خبری سنائی تو وہ بھی کھل اٹھیں۔ پھر ممی اچانک فکر مند سی ہو کر بولیں "مگر ——— مگر ڈیسوزا' وہ ——— وہ لوگ ہمارے بیٹے کو ہم سے چھین تو نہیں لیں گے؟"

"نہیں ایلن! ایسی کوئی بات نہیں" ڈیڈی نے پُراعتماد آواز میں جواب دیا "ہمارا بیٹا ہمارے ہی پاس رہے گا۔"

ممی اس طرح خوش نظر آنے لگیں جیسے انہیں سارے جہان کی دولت مل گئی ہو۔ محبت سے بڑی دولت دنیا میں کوئی نہیں' یقیناً وہ شخص خوش نصیب ہے جسے یہ دولت حاصل

ہے۔ میں نے اپنے کھوئے ہوئے رشتوں کے دوبارہ استوار ہو جانے کے باوجود ممی اور ڈیڈی کو ترجیح دی تھی اور یہ محبت ہی کا تقاضا تھا۔

اس روز کے بعد سے میری زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی۔ بڑی حد تک اب میرا انداز فکر مثبت رخ اختیار کر گیا تھا۔ مجھے اپنی ننھیال والوں سے وہ محبت ملی جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ساری محبت جو شاید ان کے دلوں میں میری ماں کے لیے تھی، میرے حصے میں آگئی تھی۔ مجھے صرف ایک معاملے میں کچھ خجالت اور کچھ پریشانی کا شکار ضرور ہونا پڑا۔ یہ معاملہ رابعہ اور زاہدہ کا تھا۔ وہ دونوں ہی مجھے چاہتی تھیں اور اس میں میری شہ کو بڑا دخل رہا تھا لیکن وہ منہ اور بات تھی اس وقت میں انتقام میں اندھا ہو رہا تھا۔ ان دنوں میرے پیش نظر صرف یہ تھا کہ کس طرح بھی ممکن ہو میں اپنے ننھیال والوں کو اذیت میں مبتلا کروں اور یہی وجہ تھی کہ میں نے رابعہ اور زاہدہ کو اپنا اسیر بنالیا تھا۔ اب جب سے صورت حال میں تبدیلی آئی تھی مجھے اپنے اس فعل سے گھن سی آنے لگی تھی۔ میں اکثر حیران ہو کر سوچتا کہ مجھے یہ کیا ہو گیا تھا۔ کیا نفرت انسان سے تمام اخلاقی اقدار چھین لیتی ہے؟ میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ رابعہ اور زاہدہ سے میرا رویہ سگے بھائی جیسا ہی ہو گا کیونکہ بہرحال وہ میری بہنیں ہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ اتنا آسان نہ ہو گا لیکن یہ تو مجھے کرنا ہی تھا چاہے اس کے لیے مجھے سختی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

ایک روز زاہدہ نے مجھے تنہا پا کر گھیر لیا۔ وہ زیبا مرحومہ کی بڑی بہن تھی۔

"میں نے محسوس کیا ہے کہ تم مجھ سے کچھ کچھے کچھے رہنے لگے ہو" زاہدہ نے کہا "میں تم سے اس سلسلے میں کچھ ضروری بات کرنا چاہتی ہوں، میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟" میں نے دریافت کیا۔

"میرے کمرے میں" اس نے جواب دیا "تم سے گفتگو کے لیے تنہائی ضروری ہے اور یہاں کوئی بھی آسکتا ہے۔"

"پھر بھی سہی" میں نے اسے ٹالنا چاہا "عظمت علی کی اور میری بازی جمنے والی ہے۔ وہ بس نہا کر آنے ہی والا ہو گا۔"

"نہیں! تمہیں چلنا پڑے گا میرے ساتھ" وہ اپنی ضد پر اڑ گئی "بازی پھر جمالینا۔"

مجبوراً مجھے زاہدہ کی بات ماننا پڑی اور میں نشست گاہ سے اٹھ کر اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

"ہاں کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے بیٹھتے ہی کہا۔

"تمہارے رویے میں تبدیلی کیوں آگئی ہے؟ اب تو تم تنہائی ملنے کے باوجود بھی قریب نہیں آتے" اس کا لہجہ شکایتی تھا "حالانکہ پہلے ایسا نہیں تھا۔"

"پہلے کی بات اور تھی۔ اب ــــ اب یہ سب مناسب نہیں ہے" میں نے اسے سمجھایا۔

"پہلے اور اب میں آخر کیا فرق پڑ گیا ہے؟" وہ بولی اور مجھ سے مزید لگ کر بیٹھ گئی۔

"پہلے مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے اور میرے درمیان کیا رشتہ ہے! اس رشتے سے تم میری بہن لگتی ہو اور ــــ اور میں اب تمہیں بہن ہی سمجھتا ہوں۔ یوں بھی تم مجھ سے ڈیڑھ دو سال بڑی ہو اور اس اعتبار سے اگر میں عظمت علی کی طرح تمہیں باجی بھی کہوں تو غلط نہیں۔"

میرے الفاظ اس پر جیسے بجلی بن کر گرے اور وہ مجھے پھیلی ہوئی آنکھوں سے یوں دیکھنے لگی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ خاصی دیر کے بعد اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی "طارنوش! تم ــــ تم شاید زیبا کو چاہتے تھے اور ــــ اور شاید اسی لیے ــــ اسی لیے مجھے ــــ" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"زاہدہ! بھول جاؤ پچھلی باتوں کو! جو کچھ ہوا، وہ نادانستگی میں ہوا۔ اب ــــ اب اسے دہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔"

"بھول جاؤں!" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور پلکیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں "کاش! میں ــــ میں بھول سکوں۔"

میں نے اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھ دیئے اور دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ سمجھی یا نہیں، لیکن میں نے بہرحال اپنا فرض پورا کر دیا۔ اس دن کے بعد سے کم از کم زاہدہ میرے لیے مسئلہ نہیں بنی۔ اس نے شاید اپنے سینے پر صبر کا پتھر رکھ لیا تھا۔ اب صرف رابعہ کا معاملہ رہ گیا تھا جس کے انداز و ادا اور مجھ سے بے تکلفی دن بہ دن خطرناک حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ میری طرف سے کسی قسم کی پیش قدمی نہ ہونے کے باوجود اس کی وارفتگی میں کمی نہیں تھی۔ اس کا انداز نو عمر عاشقوں کا سا تھا۔ تنہائی ملتے ہی وہ میرے قریب آجاتی اور پھر بے باکی کا اظہار کرنے لگتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے وہ میری عاشق ہے اور میں اس کا معشوق! بہ حیثیت عاشق جو سلوک اس کے ساتھ میرا ہونا چاہیے تھا، وہ اس کا میرے ساتھ تھا۔ اس نے اب تک میری سرد مہری کی

بھی شکایت نہیں کی تھی۔ وہ اگر زاہدہ کی طرح حرف شکایت زبان پر لاتی تو شاید میں اسے بھی زاہدہ کی طرح سمجھانے کی کوشش کرتا۔ پھر جب اس کی دراز دستیاں حد سے تجاوز کرنے لگیں تو آخر کار خود مجھے ہی زبان کھولنا پڑی۔ اس شام وہ زبردستی مجھے باغ میں گھسیٹ لے گئی تھی۔ میں اور وہ ایک گھنے درخت کے نیچے نیم دراز تھے۔ حسب معمول اس نے پہل شروع کر دی۔ میری طرف کروٹ لے کر وہ کہنی کے بل اٹھی اور پھر میرے چہرے پر جھکنے لگی۔ اس کی سانسوں کی گرمی میں نے اپنے چہرے پر محسوس کی۔

میں نے اپنے اور اس کے درمیان کلائی حائل کر دی۔ وہ درمیان سے میری کلائی ہٹانے کے لیے زور لگانے لگی۔

"بس کرو رابعہ! مجھے تمہاری یہ حرکتیں قطعی پسند نہیں" میرے لہجے میں سختی بھی تھی اور ناگواری بھی۔

"کیوں بھئی کیوں پسند نہیں؟" اس نے اٹھلا کر کہا۔

"بتاتا ہوں۔ پہلے تمیز اور شرافت سے اٹھ کر بیٹھ جاؤ" میں سنجیدگی سے بولا۔

"مگر پہلے ــــ" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر پھر جھکنے کے لیے زور لگایا۔

"ہرگز نہیں!" میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ پھر میں خود ہی اسے ایک طرف دھکیلنے کے بعد اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"آج یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے طارنوش!" اس کی آواز میں حیرت اور قدرے خفگی تھی۔ میں نے اسے دھکیلتے ہوئے بہرحال اس کی نازکی کو ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ شاید خفگی کی وجہ یہی تھی۔ میری کلائی اس کی گردن پر تھی۔ غالباً پیچھے ہٹاتے ہوئے اس کی گردن پر بھی میری کلائی کا دباؤ پڑا تھا۔ میں نے یہ اندازہ اس سے لگایا کہ وہ ایک طرف گرتے ہی اپنی گردن سہلانے لگی تھی۔

"رابعہ! کیا تمہیں یہ احساس ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان کیا رشتہ ہے؟" میں نے بات شروع کی۔

"ہاں معلوم ہے مجھے" وہ بلا جھجک بولی "میرے اور تمہارے درمیان محبت کا رشتہ ہے اور اس رشتے سے بڑا کوئی رشتہ نہیں!"

"مگر یہ رشتہ تمہارے اور میرے درمیان اس وقت پیدا ہوا تھا جب ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم بہن بھائی ہیں" میں نے دانستہ "بہن بھائی" پر زور دیا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا طارنوش!" اس کے لہجے کی بے باکی برقرار تھی "میں بہرحال تمہاری سگی بہن تو نہیں ہوں!"

"لیکن میں ــــ میں تمہیں اب اپنی بہن ہی سمجھتا ہوں" میں نے وہ حربہ آزمایا جو پہلے زاہدہ پر آزما چکا تھا۔

"اگر تم ایسا سمجھنے لگے ہو تو یہ تمہاری حماقت ہے اور کم از کم میں احمق نہیں ہوں" وہ بے کھٹکے بولے جا رہی تھی "تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ ماموں زاد، خالہ زاد، چچا زاد اور پھوپی زاد جتنے بھی اس طرح کے رشتے ہیں، ایسے بہن بھائی ہیں، ان کے درمیان ایک نیا رشتہ بھی پیدا ہو سکتا ہے یعنی وہ ایک دوسرے کو اپنا سکتے ہیں۔ شرعاً اسے جائز قرار دیا گیا ہے۔ یہی معاملہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہم ایک دوسرے کے لیے حلال ہیں، جائز ہیں، حرام یا ناجائز نہیں۔ اس سلسلے میں تمہیں خواہ مخواہ کے وہم اور وسوسے کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں تو کسی سے پوچھ کر دیکھ لو۔"

"تم مجھے اتنا بے وقوف اور نافہم کیوں سمجھ رہی ہو! میں بھی یہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم بتا رہی ہو" میں جھنجلا کر بولا۔

"اگر تم سب کچھ جانتے ہو تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں" اس نے اطمینان سے کہا۔

"تمہارے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہو گا رابعہ، مگر میرے لیے مسئلہ ہے! میں تمہیں بہن کے سوا کچھ اور سمجھنے کو تیار نہیں ہوں" میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"یہ کیا تم نے بہن بہن کی رٹ لگا رکھی ہے! تم جو چاہے سمجھتے رہو لیکن میں تمہیں جو سمجھتی رہی ہوں، وہی سمجھوں گی۔"

"تو سمجھتی رہنا!" میں اٹھ کھڑا ہوا "مگر یہ خیال رہے کہ آج کے بعد مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرنا!"

"سنو طارنوش!" اس کی آواز ایک دم نرم پڑ گئی "کیا مصالحت کی کوئی راہ نہیں نکل سکتی؟"

"قطعی نہیں!" میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔ پھر میں وہاں مزید نہیں رکا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا عمارت کی طرف چل دیا۔

جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں عموماً رابعہ جیسی لڑکیاں نہیں ہوتی تھیں۔ رابعہ الگ ہی مزاج اور کینڈے کی لڑکی تھی جس کا پورا اندازہ مجھے پہلے نہیں تھا۔ اس کے بعد کئی بار رابعہ نے میری گھیرا گھاری کی مگر میرا رویہ نہیں بدلا۔ میں نے اسے اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ رفتہ رفتہ وہ میری طرف سے مایوس ہوتی چلی گئی اور یہی میں چاہتا بھی تھا۔

دن کا خاصا حصہ میں اپنے ٹیوٹرز سے تعلیم حاصل کرنے

میں صرف کر رہا تھا۔ میں نے چند ہی ماہ میں حیرت انگیز تیزی کے ساتھ عربی' فارسی اور اردو' تینوں زبانوں پر عبور حاصل کرلیا تھا' اس کے ساتھ ساتھ قرآن شریف بھی ختم کرچکا تھا۔ میرے ٹیوٹرز بھی میری تیز رفتاری پر حیران تھے۔ کچھ عرصے سے اسلامی تاریخ میرے زیرِ مطالعہ تھی۔ مجھے اس سے پہلے یہ علم نہیں تھا کہ تاریخ اتنا دلچسپ مضمون ہے۔ مشہور مؤرخ علامہ ابن خلدون کی لکھی ہوئی "تاریخ ابن خلدون" کی اب چند ہی آخری جلدیں پڑھنے کو رہ گئی تھیں۔ ٹیوٹرز کے جانے کے بعد رات کو بھی میں تاریخ کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ حصولِ تعلیم اور مطالعے سے جو وقت بھی بچتا تھا' وہ عموماً میں اپنی ننھیال ہی میں گزارتا تھا۔ روز ہی میں وہاں جاتا تھا اور پھر رات کا کھانا وہیں کھا کر لوٹتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد اچانک ایک دن میرے نانا نواب فرقان علی مجھے اپنے ساتھ خلوت میں لے گئے۔ خلافِ توقع انہوں نے جب اپنی خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کرلیا تو مجھے کچھ حیرانی سی ہوئی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں ان سے کچھ پوچھ سکتا' وہ خود ہی مجھ سے بیٹھنے کے لیے کہہ کر بولے "طارنوش بیٹے! ہمیں تم سے کچھ اہم گفتگو کرنا ہے اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ اس دوران میں کوئی مداخلت کرے۔ ہم تم سے کچھ باتیں دریافت کرنا چاہتے ہیں جو کافی عرصے سے ہمارے لیے الجھن کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ کچھ پوچھنے سے قبل ہم یہ یقین دہانی چاہتے ہیں کہ تم دروغ گوئی یا اخفائے راز کی کوشش نہیں کرو گے" وہ میرے سامنے ہی آبیٹھے تھے اور آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں نانا حضور کہ نہ تو جھوٹ بولوں گا اور نہ آپ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش کروں گا" میں نے انہیں یقین دلایا۔

"ہمارا پہلا سوال تم سے یہ ہے کہ جس روز تم نے پہلی بار یہ انکشاف کیا تھا کہ تم سعدیہ بیگم کے بیٹے ہو تو اس روز نظروں سے اوجھل کس طرح ہوگئے تھے؟" انہوں نے پوچھا' پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے خود ہی مزید بولے "خرقِ عادت کا ایسا مظاہرہ چند بزرگانِ دین سے منسوب تو ضرور سنا گیا ہے کہ وہ بیٹھے بیٹھے نظروں سے اوجھل ہوگئے مگر کسی عام آدمی میں یہ وصف دیکھنے میں نہیں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کسی قطب' ولی یا ابدال سے بیعت ہو اور انہی کے طفیل تمہارے اندر یہ وصف پیدا ہوگیا ہے؟ یہ وصف کسی پہنچے ہوئے مردِ خدا کی عطا تو نہیں؟"

نانا جان نے مجھ سے جو کچھ معلوم کیا تھا' اس کے بارے میں مجھے بھی یہ اندازہ تھا کہ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی مرحلے پر وہ یہ استفسار ضرور کریں گے۔ میں انہیں اب دل سے قبول کرچکا تھا' اس کے علاوہ یہ یقین بھی دلا چکا تھا کہ نہ جھوٹ بولوں گا' نہ کچھ چھپاؤں گا۔ میں نے اسی لیے بلا جھجک کہہ دیا "نانا حضور! قدرت نے مجھے کچھ ایسی پُراسرار قوتیں عطا کی ہیں جو عام انسانوں میں نہیں ہیں۔ یہ پُراسرار قوتیں اس وقت خود بہ خود متحرک ہوجاتی ہیں جب مجھے کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ یہ قوتیں ارادی نہیں غیر ارادی ہیں' یعنی میرے ارادے کو ان میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یقین کریں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہا ہوں۔ میں کسی قطب' ولی یا ابدال کا مرید نہیں ہوں۔ اس روز بھی کیوں کہ میری زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی اس لیے میرے اندر چھپی ہوئی پُراسرار قوتیں بیدار ہوگئی تھیں اور میں آپ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا اور یوں ایک یقینی موت سے بچ گیا تھا۔"

"تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہرچند کہ ناقابلِ یقین ہے مگر تمہارا لہجہ اس امر کی غمازی کررہا ہے کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے۔ ہم بہرحال جھوٹ اور سچ کے درمیان تمیز کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہی ہے جیسا کہ تم نے بیان کیا ہے تو بڑی حیرت انگیز بات ہے" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہے' پھر ایک اور اہم سوال کیا "یہ بتاؤ طارنوش بیٹے کہ تم اپنے والد کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"صرف اس قدر نانا حضور کہ انہیں قتل کیا جاچکا ہے" میں نے بتایا۔ مجھے علم تھا کہ وہ میرے صرف اس جواب سے مطمئن نہیں ہوں گے اس لیے میں نے انہیں بچپن سے اب تک سنائی دینے والی پُراسرار سرگوشیوں کے متعلق بھی بتادیا' مگر کچھ سوچ کر اسی کا نام نہیں بتایا۔ اپنی معلومات کا ذریعہ میں نے انہی پُراسرار سرگوشیوں کو بتایا تھا۔ آخر میں انہیں میں نے یہ بھی بتادیا کہ اب تک مجھ سے جو سرگوشیاں کی جاتی رہی ہیں' وہ غلط ثابت نہیں ہوئیں اس لیے اپنے والد کے قتل ہونے کا بھی مجھے پورا یقین ہے۔

"تم نے بڑی عجیب اور پُراسرار باتیں بتائی ہیں طارنوش بیٹے! اگر خود ہم نے اپنی آنکھوں سے تمہیں نظروں سے اوجھل ہوتے نہ دیکھا ہوتا تو شاید ہمیں ان باتوں پر ہرگز یقین نہ آتا۔ ہماری دعا ہے کہ تمہاری عمر دراز ہو اور خدا تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی انہوں نے میری طرف جھک کر میری پیشانی چوم لی۔

اسی روز انہوں نے کچھ کاغذات میرے حوالے کیے۔ ان کاغذات کی رو سے میں ان کی جائداد کے ایک حصے کا مالک بن گیا تھا۔ اس جائداد میں ایک باغ بھی تھا' اس کے علاوہ چار مکانات تھے جو باڑہ ہندو راؤ میں کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔ اب اس کرائے کا حق دار بھی میں ہی تھا۔ جائداد کے ساتھ ہی ایک لاکھ نقد روپیا بھی میرے حصے میں آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے بینک اکاؤنٹ کھولنے کو کہا تھا۔ اگلے ہی روز ان کی ہدایت اور تاکید پر میں نے بینک اکاؤنٹ کھول لیا اور پھر اسی دن میرے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ روپیا منتقل ہوگیا۔ اس زمانے میں ایک لاکھ روپیا بہت بڑا سرمایا ہوتا تھا' گویا اب میں لکھ پتی بن گیا تھا۔

اس عرصے میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میری والدہ سے بڑی ایک بہن اور ہیں جن کی شادی علی گڑھ کے ایک نواب خاندان میں ہوئی تھی۔ میری بڑی خالہ کا نام سعیدہ بیگم تھا۔ اب تک میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔

گردشِ روز و شب اسی طرح جاری رہی۔ تاریخ کے مطالعے کے بعد میں نے اب عہدِ حاضر کے سیاسی حالات کا مطالعہ شروع کردیا تھا۔ یہ مطالعہ بین الاقوامی نوعیت کا حامل تھا۔ اس سے میرے ذہن میں متعدد سوالات پیدا ہونے لگے جن کا تعلق اقوامِ عالم میں مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال اور ان کے مستقبل سے تھا۔

پھر گرمی کا موسم شروع ہوگیا۔ چند ہی ماہ بعد درس گاہوں میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئیں۔ حشمت علی کے بڑے بھائی رحمت علی جو علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے دہلی آگئے۔ انہی کے ساتھ میری خالہ کے بیٹے نواب زادہ عطا اللہ خاں بھی تھے۔ بھائی جان رحمت علی اپنے چھوٹے بھائی حشمت علی کے قطعی برعکس تھے۔ وہ بی اے کے آخری سال میں تھے۔ وہ نہایت متین' سنجیدہ اور بردبار تھے۔ کچھ ایسی ہی شخصیت کے حامل میرے خالہ زاد عطا اللہ خاں تھے۔ ان دونوں ہی کی شخصیتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ بھائی رحمت علی اور بھائی عطا اللہ خاں ہم جماعت تھے۔ دونوں ہی حضرات کو سیاست سے خصوصی شغف تھا۔ اس کا اندازہ مجھے ان دونوں کی گفتگو سے ہوا۔ حشمت علی ان دونوں کی صحبت سے بھاگتا تھا مگر میرا معاملہ مختلف تھا۔ میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ان دونوں کی صحبت میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکوں۔ میرے لیے ان دونوں ہی کی شخصیتوں میں عجیب سی کشش تھی۔ عموماً میں ان دونوں کی گفتگو کے دوران میں کچھ بولنے سے گریز ہی کیا کرتا تھا' لیکن ایک روز بھائی عطا اللہ خاں نے جب تحریکِ خلافت کی مخالفت میں بولنا شروع کیا تو میں خاموش نہ رہ سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا محمد علی جوہر کو میں اپنا آئیڈیل تصور کرتا تھا۔ ہرچند کہ ڈیڈی کی نصیحت اور ان سے سیاسی جلسوں میں شرکت نہ کرنے کا وعدہ میں اب تک نبھا رہا تھا لیکن میرے خیالات وہی تھے۔ ان خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو طارنوش!" بھائی عطا اللہ خاں میری بات سن کر بولے "میرے نزدیک بھی مولانا محمد علی جوہر قابلِ تعظیم رہنما ہیں' مگر میں انہیں ہرگز قابلِ تقلید نہیں سمجھتا۔ قابلِ تعظیم اور قابلِ تقلید ہونا بالکل الگ الگ باتیں ہیں۔ مولانا جوہر کیوں میرے لیے قابلِ تقلید نہیں ہیں؟ اس سوال کے جواب میں میرے پاس بڑی مضبوط دلیلیں ہیں مگر شاید تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔ اس کے لیے موجودہ بین الاقوامی سیاست اور اس کا پس منظر جاننا بہت ضروری ہے۔"

"آپ فرمائیں تو سہی' ممکن ہے کہ میں اس پس منظر و پیش منظر سے واقفیت رکھتا ہوں" میں نے بغیر کسی بڑے دعوے کے بات شروع کی۔

بھائی عطا اللہ خاں میری بات سن کر چونکے اور پھر معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگے' پھر انہوں نے مجھ سے کہا "تم اسے کوئی امتحان خیال نہ کرنا' میں صرف یہ جاننے کے لیے سوال کررہا ہوں کہ واقعی موجودہ بین الاقوامی سیاست پر تمہاری نظر ہے۔ یہ بتاؤ کہ انگریزوں نے ترک سلطنت کے عرب علاقوں کے بارے میں فرانسیسیوں اور روسیوں سے کیا معاہدہ کیا ہے؟"

"اس معاہدے کے تحت وہ ترک سلطنت کے عرب علاقوں کو آپس میں بانٹ لیں گے" میں نے فوراً جواب دیا۔

بھائی عطا اللہ خاں اور بھائی جان رحمت علی دونوں ہی میرا جواب سن کر حیران سے رہ گئے۔ انہیں یقیناً مجھ سے درست جواب کی توقع نہیں رہی ہوگی۔

ابھی وہ دونوں خاموش ہی تھے کہ میں بول اٹھا "تحریکِ خلافت اور اس کے رہنما ایسی ہی سازشوں کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آج سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے لبوں پر کیا الفاظ مچل رہے ہیں! بولیں اماں محمد علی کی' جان بیٹا خلافت پہ دے دو! بی اماں کے دل سے اٹھتی ہوئی یہ صدا کیا آپ نے نہیں سنی؟" میرا لہجہ جذباتی ہوگیا۔

"طارنوش! بلاشبہ تم نے مجھے حیران کردیا ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے باخبر ہوگے! لیکن اس کے باوجود

میں پھر وہی کہوں گا جو پہلے کہہ چکا ہوں کہ موجودہ سیاسی حالات میں تحریک خلافت لاحاصل ہے' قطعی لاحاصل!"

میں گم صم ہو کے رہ گیا تھا۔ اسی وقت بھائی رحمت علی کی آواز ایک تیز نشتر کی طرح میرے دل میں اترنے لگی' وہ کہہ رہے تھے "آج مسلمانوں کے لیے آسمان سے آگ برس رہی ہے اور وہ جلتے سورج کے نیچے سفر کر رہے ہیں۔ دور تک ان کے لیے تپتا ہوا صحرا ہے۔ جس میں کوئی شجر سایہ دار نہیں کہ وہ اس کے نیچے بیٹھ کر گھڑی بھر کو بھی دم لے لیں۔ کوئی مہربان ہاتھ ایسا نہیں کہ جو ان کے سروں پر ہو اور جو ان کے زخموں پر مرہم رکھ سکے۔ کوئی آواز انہیں دلاسا دینے والی نہیں۔ ان کے پیروں میں غلامی کی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کا مقدر ذلت و رسوائی ٹھہرا ہے۔ تو پھر ایسے میں کوئی محمد علی کیوں جان دے دے؟ اگر جان دے بھی دے تو اس سے حاصل کیا ہے؟ یہ قربانیاں رائگاں جائیں گی طارنوش! ترک عثمانی خلافت کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ اس وقت عرب صرف عرب بن گئے ہیں اور ترک محض ترک! معاف کرنا' میرے نزدیک اپنی اپنی قومیتوں کے مفاد اور خود غرضی کے تحت وہ مسلمان نہیں رہے۔ یہاں ہندوستان میں جو کچھ ہوا' کیا تم نہیں جانتے! انگریز نے جو کھیل یہاں کھیلا تھا' وہی کھیل وہاں کھیل رہا ہے۔ اب وہاں بھی بہت سے میر جعفر اور میر صادق' انگریز کو مل گئے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی سادہ لوحی پر مجھے ہنسی آتی ہے اور ۔۔۔ اور یقین کرو کہ غصہ بھی آتا ہے۔ یہاں کے مسلمان اب بھی اس خلافت کے لیے بے چین ہیں جس کا کوئی وجود باقی نہیں رہا۔ وہ چندے جمع کر کر کے ترکی روانہ کر رہے ہیں' طبی وفد ترکی جا رہے ہیں اور ۔۔۔ اور مولانا محمد علی جوہر ہندوستان کے انگریز وائسرائے کو بار بار تنبیہہ کر رہے تھے کہ ترک خلیفہ اور خلافت کے معاملے میں ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو زخم زخم نہ کیا جائے۔ اس پر لطیفہ یہ کہ وہ اس طرح کی تنبیہیں ان انگریز حکمرانوں کو کر رہے تھے جنہوں نے گزشتہ برسوں میں خلافت ترکیہ کو مختلف ہتھکنڈے استعمال کر کے مفلوج بنا رکھا تھا۔"

بھائی رحمت علی کے طویل مکالمے کے بعد دیر تک ایک بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ پھر بھائی عطا اللہ خاں نے مجھے مخاطب کیا "اب تمہاری سمجھ میں آ رہا ہے طارنوش کہ انگریز ساری دنیا میں ہر مسلمان کا دشمن ہے! ایسے میں کسی محمد علی جوہر یا اس کی آواز پر لبیک کہنے والوں کو خلافت کے لیے جان دینے کی قطعی ضرورت نہیں بلکہ انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ضرورت ہے۔" اس کے بعد بھائی عطا اللہ خاں نے ایک اور ایسی مدلل بات کی کہ میری آنکھیں کھل گئیں "سنو طارنوش! برا نہ ماننا۔ میرے خیال میں ہندوستان کے مسلمان عقل و ہوش سے بیگانہ ہو چکے ہیں' حماقت میں مبتلا ہیں' انہیں نہیں معلوم کہ ایک غلام ملک کے غلام باشندے اپنے آقا کی منشا کے بغیر کسی کی مدد نہیں کر سکتے۔ خلافت پر جان دینے سے پہلے انگریزوں کی غلامی سے نجات پانا ضروری ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے مکمل آزادی کا مطالبہ کر کے صحیح سمت میں ایک قدم اٹھایا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ایک آزاد قوم کی حیثیت سے جب مسلمان خلافت کے تحفظ کی خاطر اپنی فوجیں روانہ کریں گے تو انہیں کوئی نہیں روک سکے گا! اسے خود غرضی نہ سمجھنا طارنوش! مگر کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر کب سے مظالم نہیں ڈھائے جا رہے! پلاسی کی جنگ سے جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون تک ہم پر کیا کیا ستم نہیں توڑے گئے! پھر اس کے بعد سے اب تک ہمیں بھوک اور جہالت کے اندھے غاروں کی طرف دھکیلنے کے لیے کیا کیا نہیں ہوا؟ بولو طارنوش! اس وقت سے آج تک عرب یا ترکی کے کسی محمد علی نے ہماری حمایت میں ایک لفظ بھی کہا؟ کسی بھی عثمانی خلیفہ یا شریف مکہ نے ہماری غمگساری کی' ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا؟ کیا ہم مسلمان نہیں تھے؟ ان کے کلمہ خیر کے مستحق نہیں تھے؟ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام سرد مہری اور بے حسی ایک زوال آمادہ قوم کی فطرت ہے۔ جنگ پلاسی سے اب تک کوئی ایک آواز بھی ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں بلند نہیں ہوئی۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے طارنوش کہ جس سے کسی طرح کوئی بھی ذی شعور اور صاحب بصیرت شخص انکار کر ہی نہیں سکتا۔"

مجھے اعتراف ہے کہ اس روز میرے خالہ زاد اور ماموں زاد' دونوں بڑے بھائیوں نے میری زبان بند کر دی تھی۔ انہوں نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ بین الاقوامی سیاست کے پس منظر میں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جو راہِ نجات طے کی تھی' اس سے انکار ممکن نہیں تھا' یعنی خلافت پر جان دینے کے بجائے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کی جائے۔

انہی چپقلشوں کے درمیان یہ طے پایا کہ میں بھی بھائی راحت علی کی طرح علی گڑھ میں اپنی خالہ سعیدہ بیگم کے یہاں رہوں گا۔ میں اس لیے بھی آمادہ ہو گیا کہ یوں مجھے بھائی رحمت علی اور بھائی عطا اللہ خاں کی صحبت میسر رہے گی۔ اب مجھے بہرحال اپنی تعلیم پوری کرنے کے لیے علی گڑھ جانا تھا۔

حصول تعلیم کے لیے علی گڑھ جانے میں صرف اور صرف ایک رکاوٹ تھی اور وہ رکاوٹ تھی کلونت کور! میں اسے دہلی میں چھوڑ کر علی گڑھ جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کہ کہیں میری غیر موجودگی میں اس کے والدین اسے کسی کے پلے نہ باندھ دیں؟ مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی میرے پیش نظر تھی کہ میں کلونت کور کی خاطر اپنا تعلیمی مستقبل تباہ نہیں کر سکتا تھا۔ ان دنوں میں سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا کیوں کہ میرے علی گڑھ جانے میں صرف چند روز رہ گئے تھے۔ اس عرصے میں کلونت کور سے میری ملاقاتیں جاری تھیں لیکن اب تک مجھ میں اتنی ہمت پیدا نہیں ہو سکی تھی کہ اسے دہلی چھوڑ کر جانے کے متعلق بتا سکتا۔ بالآخر ایک دن مجھے یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑا۔ اسی روز شام کو مجھے اپنے ماموں زاد اور خالہ زاد کے ہمراہ علی گڑھ روانہ ہونا تھا۔

میں کلونت کور سے الوداعی ملاقات کرنے حسب معمول شانتی کے گھر چلا آیا۔ کلونت کی سہیلی کا گھر ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہم وارفتگانِ شوق ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ جانِ وفا میری منتظر تھی۔

"طارنوش! بہت راہ دکھاتے ہو" وہ اک ادائے دلبری سے بولی۔

"ہاں کلونت مجھے پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی" میں نے محبت پاش نظروں سے اس کے حسین سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ یہ سوچ کر میرا دل خون ہو گیا کہ جلد ہی مجھے کلونت کو چھوڑ جانا ہے۔ جانے پھر کب ہماری ملاقات ہو؟ میں اس ملاقات کو یادگار بنانا چاہتا تھا۔

"تم نے کس آسانی سے کہہ دیا کہ کچھ دیر ہو گئی اور ادھر میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے پتھر ہو گئیں" اس نے بڑے ناز بھرے لہجے میں شکایت کی۔

"میری جان" میں وارفتگی کے عالم میں آگے بڑھا۔

"ہٹیئے۔ ہم نہیں بولتے بھلا آپ کو ہماری کیا پروا۔"

"ایسا نہ کہو کلونت۔ تم تو ہر لمحے' ہر آن میرے اندر زندہ رہتی ہو۔ بھلا میں تم سے بے پروا کیسے رہ سکتا ہوں؟" میں نے محبت سے اسے یقین دلایا۔

میری بات سن کر وہ بھی میرے قریب ہو گئی "طارنوش! تم میری زندگی ہو۔ جس دن تم نہ رہے میں بھی زندہ نہ رہوں گی۔ جب تم نہیں ہوتے تو میرے لیے ہر چیز اپنی دلکشی کھو دیتی ہے۔ میں ۔۔۔ میں اب مزید تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتی" اس نے مدہوش سے لہجے میں سرگوشی کی۔

کلونت کور کی بات سن کر میں سہم سا گیا۔ کلونت تو اس چند روزہ فرقت کی روادار نہ تھی جب کہ میں آج اسے اپنی روانگی کی خبر دینے آیا تھا۔

"کلونت سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی تمہاری جدائی گوارا نہیں لیکن کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ ہمارے سامنے ایک طویل زندگی پڑی ہے۔ مجھے اپنے آپ کو کسی قابل بنانا ہے۔ اس کے لیے مجھے علم حاصل کرنا ہوگا۔ اچھا ہوا یہ ذکر تم نے خود چھیڑ دیا۔ آج میں تمہیں یہی بتانا چاہتا تھا کہ میں پڑھنے کے لیے علی گڑھ جا رہا ہوں۔ یہ کچھ عرصے کی علیحدگی کا دکھ تو ہمیں سہنا ہی پڑے گا" میں نے جلدی جلدی کلونت سے وہ مشکل بات کہہ ڈالی جسے کہنے کے خیال سے میں پریشان تھا۔

"نہیں ۔۔۔ نہیں طارنوش۔ مذاق نہ کرو" کلونت کور نے پریشان ہو کر کہا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا کلونت۔ آج شام کی گاڑی سے میں علی گڑھ روانہ ہو جاؤں گا" میں نے دکھی دل سے اسے بتایا۔

"تم ۔۔۔ تم چلے گئے طارنوش تو ۔۔۔ تو پھر میرا کیا ہوگا؟" کلونت کور آبدیدہ ہو کر بولی۔

"تم ہی تو بتا رہی تھیں کہ اب تمہاری ماتا جی پوری طرح صحت یاب ہو چکی ہیں" میں نے کہا۔

"تو ۔۔۔ تو اس سے تمہارے جانے کا کیا تعلق؟" وہ حیران سی ہو کر کہنے لگی۔

"ظاہر ہے کہ اب وہ پہلے کی طرح تمہاری شادی کرنے میں جلد بازی نہیں کریں گی" میں نے دلیل دی۔

پھر میں نے اسے لاکھ دلیلیں دیں' بہت سمجھانا چاہا مگر کون محبت کرنے والا ایسا ہے جو بہ خوشی فراقِ یار پر آمادہ ہو جائے! بھلا پھر کلونت کور کیسے راضی ہو جاتی۔ اس نے یقیناً اوپری دل سے میرے مستقبل کی خاطر مجھے علی گڑھ جانے کی اجازت دے دی۔ میرے لیے یہی بہت تھا۔

طویل جدائی کے خیال سے اس روز میں اور کلونت کور' دونوں ہی کچھ زیادہ جذباتی ہو گئے۔ دیر تک ہم ایک دوسرے کے وجود میں خود کو تلاش کرتے رہے۔ میرے دل پر وصلِ یار کی شبنم قطرہ قطرہ گرتی رہی اور میں نہال ہوتا رہا۔ میرا سارا وجود ایک تیز نشے کی لہر میں ڈھلا جا رہا تھا۔ میں نے اسی عالم میں دور کہیں سے آتی ہوئی ایک آشنا آواز سنی مگر فوری طور پر مجھے یاد نہ آ سکا کہ وہ آواز کس کی ہے نہ ہی مجھے خطرے کا احساس ہو سکا۔

"یہی گھر ہے۔ وہ اس وقت بھی یہاں موجود ہیں" اسی

آشنا آواز میں کسی نے کہا تھا۔

"دیکھ اگر تیری اطلاع غلط ہوئی فرید تو ہم تیرے ٹکڑے کردیں گے" جواباً کوئی غرّایا تھا۔

فرید؟۔ کون فرید؟ میرے ذہن کے کسی گوشے میں سوال ابھرا۔ کون لوگ ہیں یہ اور کیا باتیں کررہے ہیں؟ ممکن ہے کہ مجھے ان سوالوں کے جواب مل جاتے مگر اسی لیے کلونت کور کے انفاس کی خوشبو مجھ پر محیط ہوگئی۔ میرا ذہن پھر قرب کی لذت میں حل ہو ہوش سے بیگانہ ہوگیا۔

اچانک بیٹھک کا دروازہ بہت زوردار آواز سے کھلا اور چار پانچ سکھ اندر آگئے۔ میں اچھل پڑا۔ سب سے آگے کلونت کور کا بڑا بھائی تھا جس کی آنکھوں میں خون سا اترا ہوا لگ رہا تھا۔ ان سبھی نے اپنی اپنی کرپانیں نکال لی تھیں۔

وہ سب سخت طیش میں تھے۔ ان کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں جب کہ غصے کی زیادتی سے ان کے چہرے تَنت رہے تھے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اپنے حواس کھوچکے ہیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ کوئی بڑا واقعہ ہوکر رہے گا۔ میں نے ایک نظر کلونت پر ڈالی وہ مارے خوف کے زرد پڑی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے اس کے بدن میں خون کا ایک قطرہ نہ ہو۔ اس کے چہرے پر دہشت برس رہی تھی اور آنکھوں میں بلا کی بے بسی تھی۔

"بے غیرت" کلونت کور کا بڑا بھائی اتنی زور سے گرجا کہ اس کی آواز پھٹ گئی تھی "میں تیرے اور تیرے اس مُسلے عاشق کے ٹکڑے کردوں گا" وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

"ٹھہرو" میں نے مضبوط آواز میں زور سے کہا "کیا بات ہے؟ کیا تم سب پاگل ہوگئے ہو۔ رسانیت سے بات کرو" میں نے سارے معاملے کو سمجھتے ہوئے بھی کچھ مہلت حاصل کرنے کے لیے کہا۔

"رسانیت سے بات کریں" ایک تلخ آواز ابھری "دیکھو سالا پوچھ رہا ہے کہ کیا بات ہے" ایک اور غضب ناک آواز نے تبصرہ کیا۔ کلونت کور کا بھائی میری للکار پر کچھ دیر کو تھم گیا تھا۔ وہ اپنی انگارہ آنکھوں سے ہمیں گھور رہا تھا۔ کلونت کور اس کے تیور دیکھ کر کچھ اور سہم گئی۔

"یہ بے غیرت عورت جو تجھ سے لپٹی کھڑی ہے اور آج ۔ آج میں کلنک کے اس ٹیکے کو ہمیشہ کے لیے مٹادوں گا اور اسی کے ساتھ تیرے ناپاک وجود کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔" کلونت کے بھائی نے تپی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

"ان دونوں کے ٹکڑے ٹکڑے کردو" کوئی پوری قوت سے چیخا۔

"دیکھو۔ دیکھو جذباتی نہ بنو۔ یہ معاملہ بات چیت سے بھی طے ہوسکتا ہے" میں نے ایک آخری کوشش کرڈالی۔

"بات چیت کے بچے" اچانک ہی ضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے اور وہ سب انتہائی اشتعال کے عالم میں ہماری طرف جھپٹ پڑے۔ میں جان گیا کہ اب کچھ بھی ممکن نہ تھا۔

کلونت کور کا بھائی اور اس کے ساتھی مجھ سے چند ہی قدم کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ موت میرے سر پر آپہنچی تھی۔ عین اسی لیے مجھے انتہائی شدید گرمی لگی اور میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا۔ اسی کے ساتھ دل اس تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے سینے سے باہر آجائے گا۔ تکلیف واذیت اور گھبراہٹ کے وہ صرف چند ہی لمحات تھے جن کے دوران میں کلونت کور کو ایک طرف ہٹا کر میں اس سے الگ ہوگیا تھا۔ انہی لمحات میں مجھے کلونت کور کی تیز چیخیں سنائی دی تھیں اور پھر میرا وجود نادیدہ ہوگیا تھا۔ میں کلونت کور کے قریب ہی کھڑا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے بڑا روح فرسا منظر تھا۔ کلونت کور کا بھائی جنونی انداز میں اپنی بہن کے سینے میں کرپان اتار رہا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں پوری طرح اپنے حواس میں آتا اس نے پے درپے اپنی بہن کے سینے گردن اور جسم کے دوسرے حصّوں کو گود ڈالا۔

"ارے وہ مُسلا کہاں بھاگ گیا؟" کوئی چیخ کر بولا۔

اسی کے ساتھ میں اپنے حواس میں آگیا اور تیزی کے ساتھ جھک کر کلونت کور کے بھائی کے ہاتھ سے خون آلود کرپان چھین لی مگر مجھے دیر ہوچکی تھی۔ کھلونا ٹوٹ چکا تھا۔ کلونت کور ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر جاچکی تھی۔ اس کا خون چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

یہ درندہ چاہے کلونت کور کا بھائی ہی سہی مگر اس نے میری کلونت کور کو قتل کیا ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے سوچا اور اس پر وار کرنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ اسی لمحے مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری کلائی پکڑلی ہو۔ اسی کے ساتھ استی کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی اور پھر اس کی پُراسرار سرگوشی میری سماعت میں گونجنے لگی "طارنوش! تم اسے قتل نہیں کروگے۔ اپنی بہن کو قتل کرکے یہ شخص تو خود اپنی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال چکا ہے تم کیوں اس کا خون اپنی گردن پر لیتے ہو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ جلد از جلد یہاں سے فرار ہوجاؤ! یہ شخص اور اس کے ساتھی

...ں سے بچنے کے لیے تمہارا نام زبان پر نہیں لائیں گے۔ ...انہوں نے یہ کوشش کی بھی تو میں ایسا نہیں ہونے دوں ...کرپان پھینک دو!"

میرا ذہن یقیناً استی کی پُراسرار قوتوں کے زیر اثر آچکا ... میں نے اسی لیے وہی کیا جو استی نے کہا تھا۔ جب میں ...کرپان پھینکی تو کلونت کور کا بھائی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "میں ...اپنی بہن کو قتل کردیا۔ میں قاتل ہوں۔ قاتل ہوں! ...اپنی بہن کا قاتل!"

کلونت کور کے بھائی کے ساتھیوں کو بھی اب ہوش آچکا ...کہ کیا ہولناک واقعہ پیش آچکا ہے! وہ مجھے بھول کر کلونت ...کی لاش کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھے جارہے تھے۔ میں ...ی کے ساتھ بیٹھک سے نکلا اور پھر راہداری عبور کرکے ...ری سے گزرتا ہوا گھر کے صدر دروازے سے باہر نکل ...گیا۔

...گلی کے نکڑ پر مجھے فرید احمد کھڑا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر ...ری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں سب کچھ سمجھ چکا تھا کہ ...سب فرید احمد ہی کا کیا دھرا ہے۔ وہ یقیناً کچھ روز سے ...ونت کور اور میری نقل وحرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور ...اسی نے کلونت کور کے بھائی کو مطلع کیا ہوگا۔

میرا وجود اب تک نادیدہ تھا۔ اسی سے فائدہ اٹھاتے ...ہوئے میں لپک کر فرید احمد کے قریب پہنچ گیا۔ پھر میرا زنّاٹے ...دار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور وہ چیخ اٹھا۔ جو لوگ ادھر سے ...گزر رہے تھے فرید احمد کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اسی وقت ...میرا گھونسہ اس کے منہ پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر کچھ دور جاگرا۔

"بچاؤ بچاؤ!" وہ کسی چابی بھرے ہوئے کھلونے کی طرح ...چیخنے لگا اور اس کے گرد بھیڑ لگ گئی۔

"کیا ہوا؟۔ کیا ہوا؟" لوگ اس سے پوچھے جارہے تھے ..."تم کیوں چیخ رہے ہو؟"

وہ کہنی کے بل اٹھنے کی کوشش کررہا تھا کہ میری بھرپور ...ٹھوکر اس کی کنپٹی پر پڑی اور وہ چیخ کر بے سدھ ہوگیا۔ ابھی ...میرا غصہ کم نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے اس کے دائیں پنجر ...پر اپنا پیر رکھ دیا اور پھر جھک کر اس کا پیر پوری قوت سے اوپر ...اٹھالیا۔ پنڈلی کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی اور پھر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے کسی ذبح ہوتے بکرے کی طرح ڈکرایا۔ میں فرید احمد کی دوسری ٹانگ توڑنے والا تھا کہ اسی وقت گلی میں شور بلند ہوا۔ کلونت کور کا بھائی چیختا ہوا چلا آرہا تھا "میں قاتل ہوں۔ قاتل ہوں۔ میں نے اپنی بہن کو قتل کردیا ہے۔ قتل کردیا ہے اسے!"

بھیڑ ادھر متوجہ ہوگئی اور مجھے استی کی تاکید یاد آئی کہ جلد از جلد یہاں سے فرار ہوجاؤ۔ فرید احمد کے لیے اتنی سزا بھی کافی تھی۔ میں تیزی کے ساتھ گلی سے نکل کر اس سڑک پر آگیا جو مجھے قریبی تانگا اسٹینڈ تک پہنچا سکتی تھی۔

تانگا اسٹینڈ تک پہنچتے پہنچتے راستے میں مجھے سخت سردی لگی اور اسی کے ساتھ مجھے میرا جسم واپس مل گیا۔ سامنے ہی ایک پیڑ کے نیچے خالی تانگا کھڑا تھا۔ میں اس میں بیٹھ کر قرول باغ کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس وقت میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور میری آنکھوں میں اپنی محبوبہ کلونت کور کے قتل کا منظر گھوم رہا تھا۔

گھر پہنچ کر میں اپنے کمرے میں بند ہوگیا اور کافی دیر تک میری حالت اعتدال پر نہیں آسکی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو ممی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"طارنوش بیٹے!" ممی نے مجھے مخاطب کیا "کیا کھانا نہیں کھاؤ گے؟ تمہاری وجہ سے آج تمہارے ڈیڈی بھی دوپہری کو دفتر سے آگئے ہیں تاکہ ہم سب ایک ساتھ دوپہر کا کھانا کھاسکیں۔ شام کو تو تم چلے ہی جاؤ گے۔ پھر۔ پھر کیا خبر کتنے دن بعد ہم ساتھ کھانا کھاسکیں۔" آخری الفاظ کے ساتھ ہی ممی کی آواز بھاری ہوگئی۔ میری جدائی کا خیال ان کے لیے یقیناً تکلیف دہ تھا۔

کچھ کھانے پینے کو میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن ممی ڈیڈی کی دل دہی کی خاطر مجھے ڈائننگ ٹیبل تک جانا ہی پڑا۔

"یہ پہلا موقع ہے بیٹے کہ تم اتنے طویل عرصے کے لیے ہم سے جدا ہو رہے ہو مگر ظاہر ہے کہ یہ تمہارے مستقبل کے لیے ضروری ہے ورنہ ہم کبھی یہ گوارا نہ کرتے" ڈیڈی کہنے لگے "اس لیے میرے بچے اداس ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میری اداسی کو ڈیڈی نے محسوس کرلیا تھا اور وہ اس کا سبب کچھ اور ہی سمجھ رہے تھے۔ میں اسی لیے نعدتی

مسکرا کر بولا "میں اداس تو نہیں ہوں ڈیڈی!"

"تم زبان سے کچھ بھی کہو مگر تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم اداس ہو۔ خیر یہ ایک فطری بات ہے" انہوں نے ڈش سے میری پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے کہا "داخلوں میں ابھی تقریباً ایک مہینا ہے۔ ویسے تو تمہارے اپنے بہت عزیز وہاں ہیں لیکن اگر میری ضرورت ہوگی تو میں بھی آجاؤں گا۔ کوشش یہی کرنا کہ سیکنڈ ائر میں داخلہ مل جائے! اور ہاں خط پابندی سے ضرور لکھتے رہنا تاکہ ہمیں تمہاری خیریت ملتی رہے۔"

"بہتر ہے ڈیڈی!" میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

پھر اسی شام کو میں زخمی دل لیے اپنے دونوں ماموں زاد اور خالہ زاد کے ہمراہ دہلی سے علی گڑھ روانہ ہوگیا۔

کلونت کور کے شہر کو چھوڑتے ہوئے میرے دل پر عجب قیامت گزر رہی تھی۔ وہ میری پہلی محبت تھی اور اسے میری آنکھوں کے سامنے بے دردی سے قتل کردیا گیا تھا۔ مجھے یاد آیا "اس نے آخری ملاقات میں کہا تھا کہ اگر میں اسے چھوڑ کر چلا گیا تو وہ زندہ نہ رہ سکے گی۔ اس نے اپنی بات سچ کر دکھائی تھی۔ میں اس کے لیے کچھ بھی تو نہ کرسکا تھا۔ کاش ــ کاش! میری آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

سارے راستے میں خاموش بیٹھا کلونت کور کے تصور میں گم رہا۔ میرے دونوں بھائی میری حالت سے بے خبر اپنی باتوں میں مگن تھے۔ میں کلونت کور کے لیے بے حد دکھی تھا مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ وہ مرچکی تھی اور مجھے ابھی زندہ رہنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے اسے بھولنا ہوگا کیونکہ اب کچھ بھی تو ممکن نہ تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو شاید میں اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا۔ حالانکہ یہ بھی کچھ ایسا آسان نہ تھا۔ اس کی زندگی میں بھی اکثر میں یہ سوچ کر پریشان ہوجایا کرتا تھا کہ وہ اور میں دونوں الگ الگ عقیدے اور مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں ہم کیسے ایک ہوسکیں گے۔ مگر اب تو سب کچھ ختم ہی ہوگیا تھا۔ اب مجھے اسے فراموش ہی کرنا تھا۔ میں ان ہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ گاڑی علی گڑھ پہنچ گئی۔

میرے خالو جان خان بہادر نواب ثناء اللہ خان کی کوٹھی شہر کی ایک مضافاتی آبادی دودھ پور میں تھی۔ اس وقت سورج غروب ہوچکا تھا جب ہم ٹرین کے ذریعے علی گڑھ پہنچے اسٹیشن سے نکل کر ہم نے دودھ پور کے لیے تانگا کرلیا۔

دہلی کے مقابلے میں مجھے علی گڑھ بہت پُرفضا اور پُرسکون شہر معلوم ہوا۔ یہ میرے لیے پہلا موقع تھا کہ میں دہلی سے باہر نکلا تھا۔

خالو جان کی کوٹھی بھی میرے نانا کی کوٹھی سے چھوٹی نہیں تھی بلکہ کچھ بڑی ہی ہوگی۔ بھائی عطاء اللہ خان دہلی میں دوران قیام ہی میرے متعلق اپنے والدین کو وہ سب کچھ اپنے خط میں لکھ چکے تھے جو انہیں میرے بارے میں معلوم تھا۔ میری خالہ جان اور میری والدہ بس دو ہی بہنیں تھیں اور دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتی تھیں۔ میں جب خالہ جان کے سامنے پہنچا اور بھائی عطاء اللہ خان نے ان سے کہا "امی! ذرا پہچانیے تو یہ کون ہے؟" تو خالہ جان نے "میری سعدیہ کا بیٹا" کہہ کر مجھے اپنے سینے سے لگالیا اور رونے لگیں۔

خالو جان کے علاوہ گھر کے دوسرے تمام افراد بھی مجھ سے بڑی محبت سے ملے۔ بھائی عطاء اللہ خان کے علاوہ خالہ جان کی بس ایک بیٹی اور تھی جو میری ہم عمری ہوگی۔ اس کا نام شگفتہ تھا اور وہ نام ہی کی طرح شگفتہ لگتی بھی تھی۔ وہ گرلز کالج میں فرسٹ ائر کی طالبہ تھی اور اب سیکنڈ ائر میں جانے والی تھی۔ خالہ جان نے ابھی اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادی نہیں کی تھی۔ میری ننھیال کی نسبت یہ خاندان ذرا چھوٹا تھا۔

میرے لیے پہلے ہی سے الگ کمرے کا بندوبست کردیا گیا تھا اور یہ کمرا بھائی عطاء اللہ خان کے کمرے کے برابر ہی تھا۔ میں نے اپنا سامان اس کمرے میں رکھوادیا۔

اس رات کھانا کھا کر ہم کوٹھی ہی کے باغ میں ٹہلنے نکل گئے۔ باغ میں ہر طرف خوب صورت گلابوں کے تختے مہک رہے تھے۔

"طارنوش!" ٹہلتے ٹہلتے بھائی عطاء اللہ خان نے مجھے مخاطب کیا "تمہیں ایک بات بتادوں کہ ابا حضور قبلہ کی باتوں پر کبھی دھیان نہ دینا! اور نہ یہاں آنے والے مہمانوں کی بات کبھی توجہ سے سننا! ہرچند کہ وہ میرے والد ہیں مگر یہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ ہے کہ وہ انگریزوں کے وفادار ہیں۔ تم ایسے ذہین نوجوان کو غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ انگریز ہمیشہ اپنے کاسہ لیسوں ہی کو خطابات سے نوازتے ہیں۔ میرے والد بھی ایسے ہی خطاب یافتہ افراد میں سے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں یہ بھی سوچنے لگتا ہوں کہ کاش میں ان کا بیٹا نہ ہوتا!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے بھائی عطاء اللہ خان کی آواز سے دکھ کا اظہار ہورہا تھا۔

یہ موضوع کیونکہ بھائی عطاء اللہ خان کے لیے تکلیف دہ تھا اس لیے میں نے بات کا رخ بدلنے کی خاطر سیاست پر گفتگو شروع کردی میں بولا "بھائی جان! آج میں آپ سے ایک بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے آپ کے خیالات

…یاسی نظریات سے صدفی صد اتفاق ہے۔ واقعی ہندوستانی …مسلمانوں کو اس وقت تحریک خلافت کے بجائے تحریک …آزادی کی ضرورت ہے۔"

"طارنوش! مجھے تم سے یہی توقع تھی میرے بھائی!" …بھائی عطاء اللہ خان کی آواز سے خوشی جھلک رہی تھی۔ میں …بات کا رخ بدلنے میں کامیاب رہا تھا۔

"لیکن آزادی کے حصول کی راہ کیا ہو بھائی جان؟" میں …نے سوال کیا۔

"طارنوش کے سوال کا جواب تم دو برادر عزیز!" بھائی …عطاء اللہ خان نے میرے ماموں زاد رحمت علی کی طرف دیکھتے …ہوئے کہا۔

"ہم طویل عرصے تک تبادلۂ خیالات کرنے اور اچھی …طرح غور و فکر کے بعد ایک ہی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ آزادی کے …حصول کی صرف اور صرف ایک ہی راہ ہے۔" یہ کہہ کر بھائی …رحمت علی چند لمحے خاموش رہے پھر بولے "اور طارنوش وہ …ہے انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد ہے۔"

"مسلح جدوجہد!" میں چونک کر کہنے لگا۔

پھر چند ہی روز میں میرے دونوں بڑے بھائیوں نے مجھے …اس معاملے میں بھی اپنا ہم خیال بنا ہی لیا۔ وہ انگریزوں کے …خلاف خفیہ اور مسلح جدوجہد کے قائل تھے۔ وہ چھاپا مار جنگ …کے حق میں تھے "ایسی جنگ جو سرکاری نظم و نسق کو تہ و بالا …کردے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں افراتفری …پھیلا دے تاکہ انگریز جلد از جلد ہندوستان چھوڑنے کے لیے …یہاں کے رہنماؤں کی شرائط ماننے پر مجبور ہوجائیں۔ ان کے …نزدیک یہ راہ بڑی طویل اور صبر آزما تھی، اس کے ساتھ …قربانیاں چاہتی تھی۔

اب تک میں نے اندازہ لگایا تھا کہ میرے دونوں …بھائیوں کے خیالات اس وقت کے عام ہندوستانی مسلمانوں …سے قطعی مختلف تھے جو خلافت پر جان دینے کے عملی …مظاہرے کررہے تھے۔ یہ خیالات ان مسلمانوں سے بھی …مختلف تھے جنہوں نے ریشمی رومال کی تحریک چلائی تھی اور ان …مسلمانوں سے تو بالکل ہی مختلف جو انگریزوں ہی کو اپنا آقا …تسلیم کرچکے تھے۔ ان خیالات کا کوئی علاقہ ان نوابوں سے …بھی نہیں تھا جن میں سے ایک یعنی ملتان کے نواب نے …انتہائی عیاری کا ثبوت دیتے ہوئے ریشمی رومال تحریک کے …سارے راز افشا کردیے تھے اور یوں خود کو انگریزوں کا نمک …حلال ثابت کردیا تھا۔

اپنے دونوں بھائیوں کی باتوں میں سے میں نے ایک نتیجہ اور بھی اخذ کیا تھا کہ وہ مجھے ذہنی طور پر ایک نیک مقصد کے لیے تیار کررہے ہیں مگر میں نے زبان سے اس کا اظہار نہیں کیا۔ ابھی مجھے علی گڑھ آئے تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ میرے دونوں بھائی کچھ دن کے لیے علی گڑھ ہی کی ایک تحصیل اترولی جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ خالو جان کے چھوٹے بھائی نواب بقا اللہ خان کی وہاں جاگیر تھی۔ بظاہر وہ دونوں محض سیر و تفریح کے لیے جارہے تھے لیکن میرا ذہن اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میں جو اب تک ان سے بہت گھل مل گیا تھا انہوں نے ایک مرتبہ جھوٹے منہ کو بھی یا اخلاقاً بھی مجھ سے اپنے ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا۔ اگر واقعی وہ محض سیر و تفریح کے لیے اترولی جارہے ہوتے تو مجھ سے بھی ساتھ چلنے کے لیے ضرور کہتے۔ میرے ذہن میں تجسس پیدا ہونے لگا اور اسی کے زیر اثر میں نے آخر خود ہی ان دونوں کے ساتھ چلنے کو کہہ دیا۔

حالانکہ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس پر وہ دونوں فکر مند ہوجاتے مگر ہوا یہی!

"اچھا ٹھہرو!" وہ دونوں یہ کہہ کر کمرے کے ایک گوشے میں چلے گئے اور دھیمی آواز میں گفتگو کرنے لگے۔ میں نے کوشش کی کہ ان کی باتیں سن سکوں مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ پھر ان کی گفتگو طویل ہوتی گئی۔ معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے وہ کسی اہم مسئلے پر بحث کررہے ہوں۔ خدا خدا کرکے ان کی بحث ختم ہوئی۔ وہ یقیناً کسی نتیجے تک پہنچ چکے تھے۔ میں اس دوران میں بے چینی سے ان کی بحث ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔

"طارنوش! تم ہمارے ساتھ نہ چلو تو بہتر ہے" بھائی عطاء اللہ خان نے میرے قریب آکر کہا "ہم وہاں ایک خاص مقصد کے تحت جارہے ہیں اور جس کے حکم پر جارہے ہیں اس کی اجازت کے بغیر کسی کو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ ہاں رحمت علی کا یہ کہنا درست ہے کہ ہم جس کے حکم پر اترولی جارہے ہیں اس سے تمہیں بھی اپنے ساتھ لے چلنے کی اجازت حاصل کرلیں۔ ایسی صورت میں ہمیں کل تک رکنا پڑے گا۔"

"مگر وہ شخص ہے کون جس سے آپ میرے ساتھ چلنے کے لیے اجازت لینا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اگر تمہیں ساتھ لے جانے کی اجازت مل گئی تو ہم اس کے بارے میں بتادیں گے ورنہ نہیں" بھائی رحمت علی نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"آپ اسی وقت جاکر اس شخص سے اجازت کیوں نہ لے آئیں!" میں نے تجویز پیش کی۔
"نہیں' یہ ممکن نہیں ہے" بھائی عطاءاللہ خاں نے بتایا "ہم آج شام چار بجے سے پہلے اجازت حاصل نہیں کرسکتے۔ وہ شخص ہم سے چار بجے ہی ملے گا۔"
"پھر تو یہ مجبوری ہے" میں نے مایوسی سے سرہلایا' پھر بولا "اچھا ٹھیک ہے میں شام تک انتظار کرلوں گا۔"
میرا یہ قیاس درست ہی ثابت ہوا تھا کہ وہ دونوں محض سیرو تفریح کی خاطر اتروٹی نہیں جارہے تھے' ان کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ کیا؟ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا' لیکن اسی روز مجھے اس سوال کا جواب مل گیا۔ وہ دونوں سائیکل پر ساڑھے تین بجے کہیں گئے تھے اور پانچ بجے کے قریب لوٹ آئے تھے۔ میں نے ان کے چہروں سے ایک دبے دبے سے جوش کا اندازہ لگایا۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے اندر سے دروازہ بند کرکے اس میں کنڈی ڈال دی تھی۔ اس پر میں کچھ حیران تو ہوا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔
"طارنوش! مبارک ہو تمہیں کہ تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو" بھائی عطاءاللہ خاں نے میرے قریب بیٹھتے ہی پُرجوش آواز میں کہا۔
میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ اس میں مبارک باد دینے کی کیا بات تھی!
"معلوم ہے ہم وہاں کس لیے جارہے ہیں؟" اس مرتبہ بھائی رحمت علی مجھ سے مخاطب ہوئے۔
"ٹھہرو رحمت علی! ابھی مزید کچھ کہنے یا بتانے کی ضرورت نہیں۔ جوش میں ہم سے ایک بڑی غلطی ہونے والی تھی۔ ہم نے مجاہد اول کی تاکید کو نظرانداز کردیا تھا۔ پہلے طارنوش سے ہم یہ تو معلوم کرلیں کہ یہ ہمارا ساتھی بننے پر آمادہ بھی ہے یا نہیں؟" بھائی عطاءاللہ خاں بول اٹھے۔
اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی کچھ کہتا میں بولا "میں بغیر یہ جانے کہ آپ کے مقاصد کیا ہیں' آپ کا ساتھی بننے پر آمادہ ہوں۔ مجھے آپ دونوں پر پورا پورا بھروسا ہے۔ میں آپ دونوں کو جان چکا ہوں' یہی میرے لیے کافی ہے۔"
"نہیں طارنوش' صرف یہی کافی نہیں ہے" بھائی عطا اللہ خاں نے کہا "یہ زندگی کا سودا ہے' زندگی بھر کا سودا! قربانی کا سودا' سب کچھ ایک مقصد کے حصول کی خاطر تج دینے کا سودا! ہمیں نہیں معلوم کہ تم یہ مہنگا سودا کرنے پر راضی ہوجاؤ گے اس لیے پہلے یہ سن لو کہ ہم دونوں نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے' اس کی منزل موت بھی ہوسکتی ہے! یہ بڑا پُرخطر راستہ ہے اور ایک ایسا طارنوش کہ جس سے واپسی ممکن نہیں۔"
"مجھے منظور ہے بھائی جان منظور ہے!" میں نے بلاجھجک کہہ دیا۔
"تو پھر سنو طارنوش کہ ہم دونوں ایک خفیہ وطن پرست تنظیم کے رکن ہیں۔ یہ تنظیم کفن بردوشوں اور سرفروشوں پر مشتمل ہے۔ ہم تمہیں بھی اس وطن پرست تنظیم کا رکن بنانا چاہتے ہیں کیونکہ تم ذہنی طور پر ہمارے خیالات و نظریات سے اتفاق کرچکے ہو" بھائی عطاءاللہ خاں مجھے بتانے لگے "میں اس تنظیم کا مقصد تمہارے سامنے بیان کررہا ہوں۔ اگر تم اس مقصد سے متفق نہیں ہوگے تو تمہیں تنظیم کا رکن بننے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ سنو! اس تنظیم کا مقصد خواب غفلت میں پڑی ہوئی قوم اور اس کے رہنماؤں کو عملی طور پر یہ بتانا ہے کہ آزادی کی راہ میں لہو کے چراغ جلانا پڑتے ہیں۔ آزادی کے لیے بھیک نہیں مانگی جاتی بلکہ ہتھیار اٹھانا پڑتے ہیں۔ تحفے میں آزادی نہیں ملتی بلکہ زوربازو سے حاصل کی جاتی ہے۔ ہمارے رہنما سیاسی محاذ پر جنگ لڑرہے ہیں' ہم ان کے لیے اپنے لہو سے راہ ہموار کریں گے۔ محدود پیمانے پر ہم چھاپا مار کارروائیاں فی الحال شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم ان کارروائیوں کے ذریعے عوام کے دلوں میں دبی ہوئی آزادی کی چنگاریوں کو بھڑکتے شعلوں میں تبدیل کردیں گے۔ بہ طور خاص ہم مسلمان رہنماؤں کو مجبور کریں گے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک الگ قوم کی حیثیت سے تسلیم کرائیں۔ جیسا کہ میرے علم میں ہے طارنوش تم ماضی اور موجودہ بین الاقوامی سیاست کے ساتھ اس خطے کی سیاست پر بھی تمہاری گہری نظر ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ اب سے چند برس پہلے میثاق لکھنؤ میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کرالیا گیا تھا' مگر بعد میں ہندوؤں نے اسے تسلیم نہیں کیا جس کا ثبوت نہرو رپورٹ ہے۔ نہرو رپورٹ کے جواب اور رد میں مسلم لیگ کے قائد محمد علی جناح نے چودہ نکات پیش کیے جنہیں ہندوؤں نے مسترد کردیا اور یہ معاملہ ابھی تک التوا میں پڑا ہوا ہے۔ سو سیاسی رہنما جن کا منصب ہے' انہیں لڑنے دو' ہمارا میدان اور ہمارا راستہ' ان سے مختلف ہے' ہرچند کہ مقصد ہم دونوں کا ایک ہے! ہمارا راستہ قربانیوں کا راستہ ہے۔ اس راستے میں ہمیں صرف جان دینا ہے۔ اس کے عوض نہ ہمیں کسی

تمنا ہے اور نہ ہم کسی ستائش کے طلبگار ہیں۔ اور سنو طارنوش! ہماری یہ جنگ صرف انگریزوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ قوم فروشوں کے خلاف بھی ہے' ان میر جعفروں اور میر صادقوں کے خلاف بھی ہم اعلان جنگ کررہے ہیں جنہیں ملت فروشی کے بدلے خطابات' القابات اور جاگیریں ملتی ہیں! بولو طارنوش' صدق دل سے بتاؤ کیا تم تنظیم کے ان مقاصد سے پوری طرح متفق ہو؟" آخر میں بھائی عطا اللہ خاں نے مجھ سے دریافت کیا۔
"بھائی جان! میں سلام کرتا ہوں ان سرفروشوں کو جنہوں نے اپنے لہو سے آزادی کے چراغ روشن کرنے کا عہد کیا ہے اور سلام کرتا ہوں اسے کہ جس نے اس تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کا رکن بننا میرے لیے باعثِ صد افتخار ہوگا" میں نے واقعی سچے دل سے کہا۔
"تو پھر آج ہی رات تمہیں ہمارے ساتھ تنظیم کے سربراہ سے ملنے کے لیے چلنا پڑے گا کیوں کہ وہ کل صبح اس شہر سے چلا جائے گا" بھائی رحمت علی نے بتایا۔
"کہاں چلا جائے گا؟ کیا وہ علی گڑھ میں نہیں رہتا؟" میں نے پوچھا۔
"وہ یہاں سے کہاں جائے گا' کچھ نہیں کہا جاسکتا" اس مرتبہ بھائی عطاءاللہ خاں بولے "ہاں اس کے بارے میں ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ وہ علی گڑھ میں نہیں رہتا۔ ہم سب اسے مجاہد اول کہتے ہیں۔"
پھر مجھے اس خفیہ تنظیم کے سربراہ کے بارے میں اپنے دونوں بھائیوں سے جو کچھ معلوم ہوا' وہ یہ تھا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ سیاہ نقاب میں اپنا چہرہ چھپائے رہتا ہے۔ وہ ایک سچا مومن ہے۔ وہ نہ صرف انگریزوں اور ہندوؤں کا دشمن ہے بلکہ مسلمانوں کے ہر دشمن کا دشمن ہے۔ وہ سراپا آگ ہے' آتش فشاں ہے! انقلاب اور بغاوت کے شعلے اس کی نس نس میں کوندتے ہیں۔ آزادی کے شہیدوں کی روحیں اس میں حلول کرگئی ہیں۔ وہ ہندوستان کے مسلم رہنماؤں کی حکمت عملی اور ان کی سیاست کو مسلمانوں کے لیے زہر تصور کرتا ہے۔ بہ حیثیت مسلمان اسے تحریک خلافت سے ہمدردی ضرور ہے مگر وہ اس تحریک کو ہندوستانی مسلمانوں کی قوت اور وقت کا زیاں خیال کرتا ہے اس کے سیاسی تجزیے دوسرے مسلم رہنماؤں سے قطعی مختلف ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اس وقت عرب انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں اور اپنی عصبیت کے ساتھ ساتھ لالچ' اقتدار کے لالچ میں خلافت کے گلے پر چھری
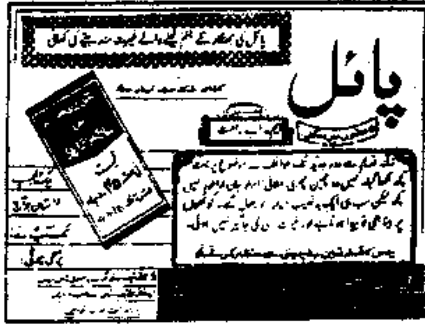
پھیر رہے ہیں۔ ایسے میں ہندوستانی مسلمانوں کو خلافت کے مسئلے پر قربان کرنا لاحاصل ہے۔ تنظیم کے مجاہد اول کے متعلق مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ وسط ہند کا باشندہ ہے۔ وہ مشرق وسطیٰ میں انگریزوں اور عربوں کے خلاف ایک زیر زمین خفیہ تنظیم کے گوریلوں کی قیادت کررہا تھا۔ انگریزوں اور عربوں کا بڑا مقصد ترک خلافت کا خاتمہ تھا جو وہ حاصل کرچکے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کے ساتھ ہی ترکوں کو میسوپوٹامیہ اور عرب علاقوں سے پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی کیوں کہ انگریزوں اور عرب بدوؤں کی فوج نے ان پر جو یلغار کی تھی' اسے وہ نہیں روک سکے تھے۔ اس تنظیم کے سربراہ نے عملی طور پر عثمانی خلافت کے حق میں جنگ کی تھی۔ اسے چھاپا مار جنگوں کا بڑا تجربہ تھا۔ اب وہ مشرق وسطیٰ میں انگریزوں کی کامیابی کے بعد ہندوستان آگیا تھا اور یہاں اس نے انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے کا عہد کیا تھا۔ وہ اسی عظیم مقصد کے لیے اپنے اردگرد جاں نثاروں اور سرفروشوں کو جمع کررہا تھا۔ یہ سب کچھ انتہائی رازداری کے ساتھ ہورہا تھا۔ تنظیم کی رکنیت اختیار کرنے والے مسلمانوں سے قرآن حکیم پر ہاتھ رکھوا کر وفاداری اور رازداری کا عہد لیا جاتا تھا۔ یہی عہد آج شب مجھے بھی کرنا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے بڑا عجیب' دلچسپ اور پُرکشش معلوم ہورہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کا رخ متعین کرلیا تھا۔
رات کے گیارہ بجنے والے تھے کہ میرے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی مگر میں جاگ رہا تھا۔ بستر سے اٹھ کر میں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ دستک دینے والے حسب توقع بھائی عطاءاللہ خاں ہی تھے۔ انہوں نے کچھ کہے بغیر میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے اب تک ان سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ جانا کہاں ہے! مجھے ان پر مکمل اعتماد تھا۔
عمارت سے نکل کر وہ مجھے ساتھ لیے ہوئے کوٹھی کے

حتمی باغ کی طرف بڑھے۔ باغ سے گزر کر وہ حتمی پھاٹک پر چڑھے۔ میں نے بھی ان کی تقلید میں ایسا ہی کیا اور کوٹھی کے عقب میں پہنچ گیا۔

"کیا ہمیں پیدل ہی چلنا پڑے گا؟" پہلی بار کوٹھی سے نکل کر میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں۔" بھائی عطااللہ خاں نے بھی آہستگی سے جواب دیا "ہمیں زیادہ دور نہیں چلنا۔ کالج کے صدر دروازے کے سامنے جو چھوٹا سا باغ ہے وہیں ہماری ملاقات مجاہدِ اول سے ہوگی۔ اس نے مجھے بتادیا ہے کہ وہ باغ کے کس حصّے میں ہوگا؟"

اس کے بعد میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بھائی عطااللہ خاں کے ساتھ چلتا رہا۔ میرے دل میں عجیب سی کھدبد ہو رہی تھی۔ آج رات میں بہرحال ایک پُراسرار شخصیت سے ملنے والا تھا۔

ہم شمالی سمت سے اس باغ میں داخل ہوئے جو اب نقوی پارک کہلاتا ہے۔ دائیں جانب کچھ فاصلہ طے کرکے ہم جیسے ہی بائیں طرف مڑے ہمیں اپنے قریب ہی سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ "خوش آمدید میرے بچو! جو سال بھی گزرتا ہے سروں کے مینار بناتا ہوا گزرتا ہے۔"

"اور یہی سروں کے مینار ہماری منزل کا نشان ہیں۔" جواب میں بھائی عطااللہ خاں بولے وہ رک چکے تھے اور ان کے ساتھ میرے قدم بھی ٹھہر گئے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ یقیناً یہ شناختی جملے ہیں کیوں کہ باغ میں تاریکی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ مجاہدِ اول آواز بدل کر بول رہا تھا۔

"تم دونوں بیٹھ جاؤ!" میں نے مجاہدِ اول کی آواز سنی جو کچھ ہی فاصلے پر مجھے ایک ہیولے کے مانند نظر آرہا تھا۔

بھائی عطااللہ خاں کے ساتھ میں بھی گھاس پر بیٹھ گیا۔

"میں مجاہدِ اول کے حکم پر طارنوش کو لے آیا ہوں۔ یہ میری خالہ کا بیٹا ہے۔" بھائی عطااللہ خاں نے کہا۔

"مگر آج کے بعد طارنوش سے تمہارا صرف اور صرف ایک رشتہ ہے۔ آج سے یہ تمہارا بھائی نہیں بلکہ تنظیمی ساتھی ہے اور یہ رشتہ ہر رشتے سے افضل ہے۔" یہ کہہ کر مجاہدِ اول براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوا "طارنوش! کیا تم نے ہماری تنظیم کے اغراض و مقاصد جان لیے؟"

"ہاں اے مجاہدِ اول! مجھے میرے تنظیمی ساتھی نے سب کچھ بتادیا ہے اور میں ان اغراض و مقاصد سے پوری طرح متفق ہوں۔" میں نے بلا جھجک کہا۔

"مجھے خوشی ہوئی طارنوش کہ تم نے میری پہلی ہی تاکید پر فوراً عمل کیا اور اپنے خالہ زاد کو بھائی نہیں تنظیمی ساتھی کہا۔" مجاہدِ اول اپنے مخصوص لہجے اور بھاری آواز میں بولا۔ "تمہیں معلوم ہے طارنوش کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟ سنو کہ ان کے گھر شام غریباں کے منظر پیش کرتے ہیں۔ ان کی تمام آرزوئیں اور امنگیں قتل کی جاچکی ہیں اور یہ مقتل انگریزوں کے تعاون سے خود انہوں نے اپنے لیے سجائے ہیں۔ اب ہر طرف تمناؤں کی خاک اڑ رہی ہے اور دور تک امیدوں کے بے کفن لاشے لہولہان پڑے ہیں۔ خیموں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ تہذیب و معاشرت کی بستیوں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ انگریز وزیراعظم لائیڈ جارج خوش ہے کہ اس نے ترک حکومت کے عرب حصوں کو پانچ ٹکڑوں میں تقسیم کردیا ہے۔ اس نے مسلم مرکزیت کی سب سے بڑی علامت کو ختم کردیا ہے۔ کیسا بھیانک ہے یہ انجام اور کتنا مایوس کن ہے یہ ماحول! اس کے باوجود میں پُریقین ہوں کہ دکھ بھری غلامی کی یہ رات جلد ختم ہوجائے گی اور آزادی کا سورج طلوع ہوگا۔ پھر کوئی شریف حسین کوئی عرب شیخ کوئی مسلمان لارنس آف عربیا کی پُرفریب چالوں میں نہیں آئے گا۔ میرے بچو! کیا تم بھی اس یقین میں میرے شریک ہو؟"

"ہاں اے مجاہدِ اول!" میں اور بھائی عطااللہ خاں ایک ساتھ بولے۔

"طارنوش۔ ہماری صفوں میں تم پہلے مجاہد ہو جسے اتنی آسانی سے ہم نے اپنے درمیان قبول کرلیا ہے۔ جانتے ہو ایسا کیوں ہے؟"

"نہیں۔ مجاہدِ اول بھلا میں کیسے جان سکتا ہوں؟"

"طارنوش! تمہارے جن دو تنظیمی ساتھیوں نے تنظیم میں شمولیت کے لیے تمہارا نام پیش کیا تھا وہ ہمارے نہایت جاں نثار اور قابلِ اعتماد ساتھی ہیں اس لیے ہم نے تمہیں اپنا ساتھی بنانے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہارے سرپرست انگریز کی خفیہ پولیس کے اہم عہدے دار ہیں۔ اس کے باوجود ہم تمہیں اپنے درمیان خوش آمدید کہتے ہیں لیکن یاد رکھنا، ہم غداروں کو دوسری سانس کی مہلت نہیں دیا کرتے۔ ہمارے سامنے ایک عظیم تر مقصد ہے اور اس کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کرنا ہم اپنے ایمان کا حصّہ سمجھتے ہیں۔" مجاہدِ اول ایک لمحے کو خاموش ہوئے پھر بولے "تمہیں قبول کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تم ایک غیر معمولی نوجوان ہو اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہمیں ایسے

نوجوانوں کی اشد ضرورت ہے۔ سنو کہ دو طاقت ور جذبے ایسے ہیں جو انسان کو عزم اور حوصلے کی روشنی بخشتے ہیں محبت اور نفرت! ہمیں مسلمانوں کے ہر دشمن سے نفرت ہے اور ہر مسلمان سے اور اپنے نصب العین سے محبت ہے۔ سنو میرے بچو! نفرت اور محبت کے ان جذبوں کی عزت کرو ان کی لو اتنی تیز کرو کہ تمہارا دشمن جل کر راکھ ہوجائے اور یہی آگ تمہارے دوستوں کے لیے گلزار بن جائے۔ آؤ طارنوش! اللہ کی اس مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر ہم عہد کریں کہ اپنی تنظیم اور نصب العین کے وفادار رہیں گے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی مجاہدِ اول کا ہیولا آگے بڑھ آیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں کچھ دیکھا جو یقیناً قرآن شریف ہی تھا۔ مجاہدِ اول ہی اپنے ساتھ قرآن شریف لایا تھا۔

پھر مجاہدِ اول سمیت ہم نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر تنظیم سے وفاداری کا عہد کیا۔ اس کے بعد مجاہدِ اول مجھے تنظیم کے لائحہ عمل اور طریقہ کار کے بارے میں مختلف ہدایات دیتا رہا اور اسی کے ساتھ ساتھ معلومات فراہم کرتا رہا۔ اس نے یہ بھی بتادیا کہ پورے ملک کے مختلف گوشوں میں تنظیم کے ارکان محدود پیمانے پر چھاپا مار سرگرمیوں کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ میرے دونوں بھائی بھی تربیت حاصل کرنے اتروئی جارہے تھے اور ان کے ساتھ میں بھی جارہا تھا۔

مجاہدِ اول نے رخصت ہونے سے پہلے جو آخری بات کی اس نے مجھے مضطرب کردیا۔ میرے لیے یہ ایک انکشاف ہی تھا۔

"عطااللہ خاں! کیا تم اپنے تنظیمی ساتھی طارنوش کے نام کی حقیقت جانتے ہو کہ اس سے کیا مراد ہے؟" مجاہدِ اول نے کہا تھا۔

"نہیں اے مجاہدِ اول! مجھے نہیں معلوم۔" بھائی عطااللہ خاں نے جواب دیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

"کاش جیسا کہ اس کا نام ہے یہ ویسا ہی تنظیم کے لیے ثابت ہو" مجاہدِ اول بولا پھر اس نے انکشاف کیا "طارنوش ابوالجن کا نام تھا۔ تمہیں علم ہی ہوگا کہ کرۂ ارض پر انسانوں سے پہلے جنات ہی آباد تھے۔ سو کرۂ ارض پر جس طرح پہلے انسان حضرت آدمؑ تھے اسی طرح حضرت آدمؑ سے قبل پہلے جن حضرت طارنوش تھے جن سے جنات کی نسل بڑھی۔ طارنوش ہی کو کچھ کتب میں سوما لکھا گیا ہے اور ان کا لقب جان بتایا گیا ہے مگر حضرت آدمؑ پر جو صحیفے اترے ان میں طارنوش ہی ہے اس لیے ہم اس کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ طارنوش کے والدین نے یہ نام کیوں پسند کیا مگر کسی انسان کا یہ نام رکھنا عجیب سی بات ہے۔"

اس کے بعد مجاہدِ اول اور بہت کچھ کہتا رہا مگر میں سن کر بھی کچھ نہیں سن رہا تھا۔ میری سماعت میں تو اس وقت اسیٰ کے کہے ہوئے یہ الفاظ گونج رہے تھے کہ تمہارے وجود کا بھید تمہارے نام میں چھپا ہوا ہے۔ یہ نام ایک پردہ ہے اور جس دن یہ پردہ اٹھ گیا یا خود تم نے اس پردے کو اٹھادیا تم پر تمہارے وجود کی بہت سی حقیقتیں منکشف ہوجائیں گی اور آج اس نام کا پردہ اٹھ گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میری والدہ نے میرے والد کی خواہش پر میرا یہ نام رکھا تھا۔ مجاہدِ اول یقیناً کوئی صاحبِ علم شخص تھا کہ جو معمّا آج تک کسی سے حل نہیں ہوسکا تھا اس نے حل کردیا تھا مگر یہ انکشاف مجھے کچھ اور بے چین کرگیا تھا۔ میرے والد نے آخر میرا یہی نام کیوں تجویز کیا تھا؟ کیا سبب تھا اس کا؟ جنات سے آخر میرا کیا تعلق؟ انہی سوالوں کے گرداب میں معلوم نہیں کب میں بھائی عطااللہ خاں کے ساتھ مجاہدِ اول سے رخصت ہوکر باغ سے نکلا اور جانے کب کوٹھی پہنچا! مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔

دوسرے دن صبح مجھے اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ اتروئی جانا تھا اس لیے بھائی عطااللہ خاں مجھے جلد سوجانے کی تاکید کرکے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ میں جس عالم میں تھا اس میں نیند آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ میں بے چینی کے ساتھ اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ نام سے پردہ اٹھ جانے کے باوجود ابھی تک مجھ پر میرے وجود کی کوئی بھی حقیقت منکشف نہیں ہوئی تھی اور میں یہ بھی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اسیٰ نے مجھ سے غلط بیانی کی ہوگی۔

اچانک میرا کمرا خوشبو سے بھر گیا۔ اس کے ساتھ اسیٰ کی پُراسرار سرگوشی سنائی دی "یقیناً تمہاری اسیٰ نے تم سے کبھی غلط بیانی نہیں کی۔ سنو کہ جب آج تمہارے نام کا پردہ اٹھ ہی گیا ہے تو کچھ حقیقتوں کا انکشاف کیا جاسکتا ہے۔ تم یہی جاننا چاہتے تھے ناکہ آخر تمہارا وجود ہے کیا معمّا جو خود تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟ تمہارے ہی اندر حیرت انگیز پُراسرار قوتیں کیوں ہیں؟ تمہیں ایسی نعمتوں سے کیوں نوازا گیا ہے جو روئے زمین پر بسنے والے کسی انسان کو عطا نہیں کی گئیں؟ تم عام انسانوں سے مختلف کیوں ہو؟ مجھ سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ اور اب ۔۔۔ اب تمہارے ذہن میں کچھ اور نئے سوالات پیدا ہوئے ہیں۔ یہ کہ تمہارے والد نے تمہارا یہی نام کیوں تجویز کیا؟ اس کا کیا سبب تھا؟ جنات سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ میں آج تمہارے ان تمام سوالوں کے جواب

دے دوں گی۔ ان سوالوں کے علاوہ بھی تم نے جو پوچھا اور میں نے اس کا جواب دینا ضروری سمجھا تو ضرور ان سوالوں کے جواب دوں گی۔"

میں پوری توجہ سے اسیٰ کی باتیں سننے لگی۔ وہ میرے وجود کے اسرار کھول رہی تھی۔

○☆○

"سنو طارنوش! تمہارا وجود یقیناً حیرت انگیز ہے لیکن کوئی معما نہیں بلکہ جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ میں ابتدا سے تمہیں ساری بات بتاتی ہوں۔

روئے زمین پر حضرت آدمؑ کی آمد سے قبل اللہ تعالیٰ کی ایک اور مخلوق آباد تھی۔ انہیں ہم جنات کہتے ہیں اور ان کے وجود کی گواہی قرآن حکیم نے بھی دی ہے۔ مجاہد اول نے طارنوش کے متعلق تمہیں سچ ہی بتایا ہے۔ تو جس طرح انسانوں میں یہ رواج ہے کہ وہ اپنے جدِ امجد کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھتے ہیں اس طرح جنات میں بھی یہ رواج ہے۔ سو اسی لیے تمہارے والد نے تمہارا نام اپنے جدِ اعلیٰ کے نام پر طارنوش تجویز کیا۔ درمیان میں سوال نہ کرو اور میری باتیں توجہ سے سنو! قادرِ مطلق نے آگ اور ہوا سے جنات کو تخلیق کیا۔ یہ ایسی آگ تھی جس میں نور بھی تھا اور ظلمت بھی' ایسی آگ کہ جس میں دھواں نہ تھا۔ جنات کے وجود کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن حکیم میں ملا ئکہ اور جنات کا ذکر ایک سو اٹھارہ جگہ موجود ہے۔ جنات کے بابت پوری تفصیل سے میں تمہیں پھر کبھی آگاہ کروں گی۔ فی الحال وہ باتیں جان لو جو تم سے متعلق ہیں اور جن کا جاننا تمہارے لیے ضروری ہے۔ انسانوں ہی کی طرح جنات بھی مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں ۔ جنات میں یہودی' عیسائی' ہندو' آتش پرست' ستارہ پرست اور مسلمان بھی شامل ہیں۔ مذہبی اعتبار سے جنات کو پانچ بڑے فرقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا فرقہ کافر ہے' کھلا کافر! اور یہ فرقہ کفار انسانوں کی مدد بھی کرتا ہے۔ ہندو انہیں مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ دوسرا فرقہ منافق کہلاتا ہے۔ یہ بہ ظاہر اہل ایمان میں سے لگتا ہے اور خود کو مسلمان بھی کہتا ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ ان کی بھی جنات میں خاصی بڑی تعداد ہے۔ تیسرا فرقہ فاسق ہے جو خود فسق و فجور میں مبتلا رہتا ہے اور انسانوں کو بھی اس طرف مائل کرتا ہے۔ مغربی اقوام کو بے غیرتی و بے حیائی کی طرف اسی فرقے نے راغب کیا ہے۔ یہ وہاں مختلف خون آشام بلاؤں کے نام سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ چوتھا فرقہ بد خلق ہے۔ یہ فرقہ انسانوں کے دل و دماغ میں اور ان کی روحوں میں غرور' کینہ اور حسد ڈالتا ہے۔ یہی انسانوں کو نجاست کی طرف کھینچتا ہے۔ پانچواں یقینی آخری فرقہ اہل ایمان کا ہے۔ یہ وہ جنات ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔ حضور سرور کائناتؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے سات جن تھے۔ اس واقعے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کی آیت میں بھی کیا ہے۔ جنات کے حضور اکرمؐ پر ایمان لانے کا واقعہ یہ ہے۔ رسول کریمؐ طائف سے واپسی میں ایک مقام نخلہ میں ٹھہرے۔ نصف شب کے قریب حضورؐ نماز پڑھ رہے تھے کہ نصیبین کے سات جن حسا' مسا' شاصرہ' ناصرہ' ابن الارب' امین اور اخضم آ گئے۔ انہوں نے نماز میں حضورؐ کی قرأت سنی اور اسلام لے آئے۔ انہی ساتوں نے جنات کے مختلف قبائل میں تبلیغ کی۔ اس تبلیغ کے نتیجے میں ہاموس کے جدِ امجد یوسف بن یاسف ایمان لائے۔ انہی کی نسل میں ہاموس پیدا ہوا جو اہل ایمان میں سے تھا۔ ہاموس بڑا نیک اور فسق و فجور سے دور رہنے والا تھا۔ اسی ہاموس کو ایک واقعہ پیش آیا اور وہ پریشان ہو گیا۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ ہاموس پرواز کرتا ہوا ایک شہر کے اوپر سے گزر رہا تھا کہ اس کی نگاہ ایک آدم زادی پر پڑی جو اپنی عالی شان حویلی کی چھت پر اپنے بال سکھا رہی تھی۔ وہ اتنی حسین اور پر کشش تھی کہ اسے دیکھنے کے لیے چھت پر اتر گیا۔ پہلی ہی نظر میں ہاموس اس پاہوش پر عاشق ہو گیا تھا۔ معلوم ہے تمہیں طارنوش' وہ کون تھی؟ اس کا نام سعدیہ بیگم تھا اور وہ دہلی کے ایک نواب فرقان علی کی صاحب زادی تھی۔ پہلی بار تو ہاموس کی ہمت نہیں ہوئی کہ سعدیہ بیگم کو مخاطب کر سکتا مگر کئی روز بعد جب ایک بار پھر سرِ شام سعدیہ بیگم اسے چھت پر تنہا نظر آئی تو ہاموس ایک انسانی قالب اختیار کر کے اس سے ملا' ہاموس نے ایسا وجیہہ اور دل آویز انسانی قالب اختیار کیا تھا کہ سعدیہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر یہ ملاقاتیں حویلی کی چھت اور باغ میں روزانہ ہی ہونے لگیں۔ سعدیہ نے بھی ہاموس کو پسند کر لیا تھا۔ چند ہی روز کے بعد ہاموس نے سعدیہ کو اپنی حقیقت سے آگاہ کر دیا کہ وہ جنات کی نسل سے ہے' اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ وہ مسلمان ہے۔

ایک جن اور آدم زادی کا عشق پروان چڑھتا رہا' یہاں تک کہ یہ راز عالمِ جنات میں افشا ہو گیا کہ ہاموس کے بہت سے دشمن بھی تھے۔ انہی دشمنوں میں سے ایک جنیہ طرطبہ بھی تھی۔ طرطبہ کافرہ تھی اور وہ ہاموس کو چاہتی بھی تھی۔ ہاموس کو اپنانے کی خاطر وہ مسلمان ہونے پر بھی آمادہ تھی' لیکن ہاموس نے اسے ٹھکرا دیا۔ اس کافرہ نے اسی لیے قبیلے کے سردار ملیقا کے پاس جا کر ہاموس کی شکایت کی کہ وہ ایک آدم زادی کے عشق میں مبتلا ہے اور اس سے ملتا بھی ہے۔ طرطبہ نے ہاموس پر یہ الزام بھی لگایا کہ ہاموس اپنی محبوبہ سے ناجائز تعلقات بھی استوار کر چکا ہے۔ یہ ہاموس پر بہتان تھا جس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ بہ حیثیت مسلمان ہاموس بہ قول طرطبہ زنا کا مرتکب ہوا تھا۔ ملیقا نے اسے طلب کر لیا اور اس سلسلے میں استفسار کیا۔ ہاموس نے یہ اقرار تو کر لیا کہ ایک آدم زادی سعدیہ سے عشق کرتا ہے اور اس سے ملتا بھی ہے' مگر زنا کے بہتان کو رد کر دیا۔ سردار قبیلہ نے حکم سنایا کہ اب ہاموس اس آدم زادی سے نہیں ملے گا۔ پھر الزام کی تحقیق ہوئی اور ہاموس بے گناہ قرار پایا' وہ سعدیہ سے زنا کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔

سعدیہ کی جدائی نے ہاموس کا برا حال کر دیا۔ وہ اپنے قبیلے کے اکابرین اور علما سے ملا۔ عالموں نے فتویٰ دیا کہ بہ حیثیت مسلمان ہاموس اپنی آدم زاد محبوبہ سے شادی کر سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ شرط بھی رکھ دی گئی کہ اس شادی کا علم کہ ایک آدم زادی نے ایک جن کی زوجیت قبول کر لی ہے' آدم زادوں کو نہیں ہونا چاہیے۔ اس شرط کی دلیل اور سبب یہ تھا کہ جنات بہرحال آدمی سے کمتر مخلوق ہیں۔ اگر آدم زادوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ایک جن نے ایک آدم زادی کو اپنی بیوی بنا لیا ہے تو وہ جنات کے دشمن ہو جائیں گے۔ آدم زادے بہرحال اشرف المخلوقات ہیں اور جنات کو نقصان پہنچانے کے اہل ہیں۔

ہاموس نے اپنے عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ شرط قبول کر لی اور اسی کے ساتھ صرف ایک بار شادی سے پہلے سعدیہ سے ملنے کی اجازت طلب کی تاکہ اس سے معلوم ہو سکے کہ آیا وہ بھی اس شرط کو قبول کرنے پر آمادہ ہے کہ نہیں!

سردارِ قبیلہ ملیقا نے ہاموس کو صرف ایک بار سعدیہ سے ملنے کی اجازت دے دی۔

ہاموس کے فراق میں سعدیہ کا بھی برا حال تھا۔ ہاموس اس سے ملا تو سعدیہ نے کہا کہ اب میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

ہاموس بولا کہ اس کی صرف ایک صورت ہے' تم مجھ سے شادی کر لو! پھر اس نے سعدیہ کو سب کچھ بتا دیا۔ سعدیہ نے شرط قبول کر لی اور ہاموس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی' مگر اس کی بھی ایک شرط تھی۔

"ہاموس! تم مجھے میرے ماں باپ کے گھر سے کہیں اور نہیں لے جاؤ گے۔ میں یہیں رہوں گی۔" سعدیہ نے کہا تھا۔

سعدیہ کی یہ شرط ہاموس نے مان لی اور پھر ایک جمعرات کو جنات کی کثیر تعداد کی موجودگی میں ہاموس اور سعدیہ کا نکاح ایک عالم جن علیا کیش نے پڑھایا۔ سردار قبیلہ ملیقا دلہن' یعنی سعدیہ بیگم کی طرف سے اس کا سرپرست ٹھہرایا گیا۔

ہاموس سے سعدیہ کی شادی کے بعد طرطبہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے ہاموس سے معافی مانگ لی اور پھر اپنے عمل سے ہاموس کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے اس نے وہ بات عام کر دی جو صرف ہاموس اور اس کے درمیان تھی۔ عالمِ جنات میں اس کا بڑا چرچا ہوا کہ ایک کافرہ' مسلمان ہونا چاہتی ہے۔ اس کی شرط اب بھی یہی تھی کہ وہ اسی وقت مسلمان ہوگی جب ہاموس اس سے شادی کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔ طرطبہ بے حد حسین تھی۔ بہت سے کافر جن اس کے شیدائی تھے اور اسے اپنانا چاہتے تھے۔ یوں بھی وہ کافر قبیلے کے ایک سردار کی بیٹی تھی۔

ملیقا کا خیال یہ تھا کہ اگر طرطبہ مسلمان ہو گئی اور اس نے ہاموس سے شادی کر لی تو اس کا خوش گوار اثر مرتب ہوگا۔ اس طرح کافر جنات بھی اسلام کی طرف راغب ہونے لگیں گے۔ یہی سوچ کر اس نے ایک روز ہاموس کو بلوایا اور بولا "اے ہاموس! تو طرطبہ سے شادی کر لے اس طرح تجھے بڑا ثواب ملے گا کہ تو نے ایک کافرہ کو دینِ اسلام میں داخل کیا اور یوں دوسروں کے لیے بھی راہ کھل جائے گی۔ پھر کافروں کے فرقے سے جو ہماری دشمنی چلی آ رہی ہے' وہ بھی شدید نہ رہے گی کہ خود ان کی بیٹی ہمارے گھر میں ہوگی۔"

اس پر ہاموس نے کہا "اے میرے سردار ملیقا! تو جانتا ہے کہ میں پہلے ہی سے شادی شدہ ہوں اور ایک آدم زادی سے نکاح پڑھوا چکا ہوں۔"

"ایک سے زیادہ شادیاں کرنا سنتِ رسولؐ ہے۔ شرع میں اس پر کوئی پابندی نہیں بلکہ تو طرطبہ سے شادی کر کے دہرے ثواب کا حق دار بن جائے گا' اول تو تجھے اس کا ثواب ملے گا کہ تیری وجہ سے ایک کافرہ' مسلمان ہوئی' دوم سنت پر عمل پیرا ہونے کا ثواب حاصل کرے گا۔ میں سردارِ قبیلہ ہونے کی حیثیت سے تجھے طرطبہ سے شادی کا حکم بھی دے سکتا تھا مگر ہمارا دین اس جبر کی اجازت نہیں دیتا۔ شادی تیری اور طرطبہ کی باہمی رضامندی ہی سے ہونا چاہیے۔ میں تجھے تین دن کی مہلت دیتا ہوں' تو سوچ لے کہ اسی میں ہماری

بھلائی ہے اور دین کا بھی فائدہ ہے۔"

پھر ہاموس نے بڑی جرح کی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ ہاموس کے والدین اور عزیز اقارب کو جب ملیقا سے ہونے والی گفتگو کا علم ہوا تو وہ بھی ہاموس پر طرطبہ سے شادی کر لینے کے لیے دباؤ ڈالنے لگے۔

تین دن کی مہلت ختم ہونے والی تھی، مگر ہاموس اب تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ ہاموس کے گھر والے بھی اس پر خوش نہیں تھے کہ اس نے آدم زادوں سے رشتہ جوڑ لیا ہے اور جنات میں شادی نہیں کی۔ طرطبہ سے شادی کرنے کے بعد ان کی یہ آرزو پوری ہو سکتی تھی۔ ہاموس کی بہن اسنیٰ یعنی خود میں بھی دوسری شادی کے حق میں تھی۔ جب ہاموس خود کسی فیصلے تک نہ پہنچ سکا تو والدین نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ہاموس نے آج تک اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کی تھی اس کے والدین جو ظاہر ہے کہ میرے والدین بھی تھے، انہوں نے طرطبہ سے ہاموس کی دوسری شادی کا فیصلہ کیا تھا۔

میرے بھائی ہاموس کی بابت جنات میں عام خیال یہ تھا کہ اس نے ایک آدم زادی کو اپنے نکاح میں لا کر پوری نسل جنات کی توہین و تذلیل کی ہے۔ میرے والدین اس عام تاثر کو ہاموس کی دوسری شادی جنات ہی میں کر کے ختم کر دینا چاہتے تھے تاکہ عام جنات ہمارے گھرانے سے نفرت نہ کریں ہاموس کی پہلی شادی سے قبل ہمارا گھرانا بڑا معزز سمجھا جاتا تھا۔

ہاموس کو آخرکار طرطبہ سے شادی کرنے پر آمادہ ہونا ہی پڑا۔ سعدیہ کی طرح طرطبہ بھی اس کے نکاح میں آ گئی۔ یوں کافروں سے مسلمانوں کا میل ملاپ شروع ہو گیا۔ طرطبہ شادی سے پہلے ہی مسلمان ہو چکی تھی۔

طرطبہ سے ہاموس کی شادی کو ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ ایک رات پراسرار طور پر اسے قتل کر دیا گیا۔ اس قتل پر بڑا ہنگامہ ہوا، مگر قاتل یا قاتلوں کا سراغ نہ مل سکا۔ اس سے بھی بڑا ہنگامہ اس وقت بپا ہوا جب طرطبہ دین اسلام سے پھر گئی۔ وہ مرتد ہو گئی تھی اور اسلام میں مرتد کی سزا موت ہے۔ مفتی علیا لیش نے طرطبہ کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس حکم کی بجا آوری کے لیے مسلمانوں نے جب عملی قدم اٹھانا چاہا تو کافروں اور ان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں دونوں طرف سے بڑی تعداد میں جنات مارے گئے کافر جنوں نے مسلمانوں کے خلاف یہ کہنا شروع کر دیا کہ طرطبہ نے نوع جنات کی توہین کا بدلہ لینے کے لیے ہاموس سے شادی کی تھی۔ وہ حقیقتاً مسلمان نہیں ہوئی تھی، جس روز ہاموس کا قتل ہوا طرطبہ اپنے باپ کے گھر گئی ہوئی تھی اس لیے یہ کہنا درست نہیں تھا کہ ہاموس کو خود اس نے قتل کیا تھا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہاموس کا قاتل، طرطبہ کے عاشقوں میں سے کوئی رہا ہو یا پھر کسی سازش کے تحت کافروں نے اسے ٹھکانے لگوا دیا ہو۔ بہرحال ابھی تک خود میں بھی پوری طرح اپنے بھائی کے قاتل یا قاتلوں کا سراغ نہیں لگا سکی کہ ان سے انتقام لے سکوں۔ ہاں میری نظر میں چند مشتبہ جنات ضرور ہیں، جن پر ہاموس کے قاتل ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے۔

جب سے کفار اور مسلمانوں کے درمیان جنگ ہوئی ہے اس وقت سے اب تک طرطبہ سخت پہرے میں رہتی ہے۔ کافر جنات کی ایک کثیر تعداد اس کی حفاظت پر مامور ہے۔ مفتی علیا لیش کے فتوے کو انہوں نے اپنے لیے انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہاموس کے قتل کے بعد تمہاری ماں سعدیہ بیگم بے سہارا رہ گئی۔ اس پر جو کچھ گزری وہ واقعات اس عورت کے ذریعے تمہارے علم میں آ چکے ہیں جس نے تمہیں ماں بن کر پالا ہے اور جسے تم ممی کہتے ہو۔

طارنوش! تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے ایک بار تم سے کہا تھا، میں تمہارے اردگرد منڈلاتی رہتی ہوں۔ اس کی بڑی وجہ میں نے یہ بتائی تھی کہ تمہیں کچھ ایسی قوتوں کی طرف سے بھی خطرہ پیش آ سکتا ہے جن سے ابھی تم ناواقف ہو۔ تو سنو کہ تمہارے متوقع دشمن وہی ہو سکتے ہیں جنہوں نے تمہارے والد، یعنی میرے بھائی ہاموس کو قتل کروایا تھا۔ یقیناً یہ بات ان کے علم میں بھی ہے کہ تمہارے والد نے ایک آدم زادی سے شادی کی تھی۔

سنو طارنوش! تمہارا وجود اللہ تعالیٰ کی دو مخلوقات کے ملاپ کا نتیجہ ہے یہی سبب ہے کہ تمہارے اندر انسانی صفات کے ساتھ ساتھ جناتی صفات بھی موجود ہیں جو خود بہ خود حرکت میں آ جاتی ہیں خصوصاً اس وقت جب تمہاری زندگی کو کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ تم اسی لیے روئے زمین پر بسنے والے عام انسانوں سے قطعی مختلف ہو۔ اپنے والد کی طرف سے تمہیں ورثے میں جناتی صفات ملی ہیں اور والدہ کی طرف سے انسانی صفات۔ تم ان دونوں صفات کا مجموعہ ہو اسی لیے عام انسانوں سے افضل و برتر ہو۔ تم ابھی اپنے وجود میں پوشیدہ جناتی صفات کو اپنے ارادے کا پابند بنانے پر قادر نہیں ہو، لیکن جیسا کہ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب یہ تمام تر قوتیں تمہارے ارادے کی پابند ہو جائیں گی۔ اس دن کا انتظار کرو کہ وہ دن ابھی نہیں آیا۔ آج میں تمہیں یہ بھی بتا دینا چاہتی ہوں کہ ان صفات کو اپنے ارادے کا پابند بنانے کے لیے تمہیں بڑی ریاضتوں سے گزرنا پڑے گا۔ یہ روحانی ریاضتیں آسان بہرحال نہیں ہیں یہ مشکل ضرور ہیں مگر ناممکن نہیں۔

میرا خیال ہے طارنوش کہ تمہیں تمہارے سوالوں کے جواب تفصیل سے دے چکی ہوں تمہیں مجھ سے کوئی اور سوال تو نہیں کرنا؟"

***

اسنیٰ نے مجھ پر میرے وجود کے تقریباً تمام ہی اسرار کھول دیے تھے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا ہاں صرف ایک بات معلوم نہیں تھی جو خود یقینی طور پر اسنیٰ کے علم میں بھی نہیں تھی۔ اسنیٰ خاموش ہو گئی تو میں نے اس سے ایک ہی سوال کیا "میں اب صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرے والد کو کس نے قتل کیا تھا؟ میں اپنے والد کے قتل کا انتقام لینا چاہتا ہوں کہ انہیں بے گناہ مارا گیا۔"

"یقیناً میرا بھائی بے گناہ تھا!" اسنیٰ جذبات سے بوجھل آواز میں کہنے لگی "مگر طارنوش بیٹے! میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ابھی قاتل یا قاتلوں کا سراغ مجھے بھی نہیں ملا۔ یہ نہ بھولو کہ خود میں بھی تو انتقام کی آگ میں سلگ رہی ہوں۔ اس سلسلے میں جہاں تک تمہارے کسی عملی اقدام کا تعلق ہے تو ابھی تم اس کے اہل نہیں ہو۔ ہاں اس کے اہل بن سکتے ہو اور شاید مجھ سے زیادہ تم ہی اس کے اہل ثابت ہو گے کیوں کہ جناتی صفات کے ساتھ تمہارے اندر انسانی صفات بھی ہیں اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہرحال اشرف المخلوقات بنایا ہے۔"

"تو پھر میں اس کا اہل کب تک بن سکوں گا؟" میں نے بے چینی کے ساتھ پوچھا۔

"اس وقت جب تم اپنی جناتی صفات کو ہم جنات کی طرح اپنے ارادے کا پابند بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔" اسنیٰ نے جواب دیا۔

"اور اس کے لیے مجھے سخت روحانی ریاضتوں سے گزرنا ہو گا، یہی کہا تھا نا تم نے؟" میں نے کہا "میں ان ریاضتوں سے گزرنے پر تیار ہوں۔"

"ہاں میں نے یہی کہا تھا مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ ابھی تمہارے شعور کو مزید بلوغت کی ضرورت ہے جس میں ایک عرصہ لگے گا۔" وہ بولی، پھر اس نے کہا "آج میں خاصی دیر تمہارے پاس رہی، اب چلتی ہوں خدا حافظ!"

"خدا حافظ!" میں نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

مجھے اس پر ملال تھا کہ ابھی میں روحانی ریاضتوں کا اہل نہیں ہوا۔

اسنیٰ کی مخصوص خوشبو میرے کمرے سے غائب ہو گئی۔

اس رات میں دیر تک اپنے وجود کے اسرار پر غور کرتا رہا اسی کے ساتھ مجھے وہ تمام باتیں یاد آتی رہیں جو اسنیٰ سے معلوم ہوئی تھیں۔ میں واقعی ایک حیرت انگیز وجود کا مالک تھا اور اس میں مزید جلا کی گنجائش باقی تھی۔ میں اس دن کے بارے میں سوچ رہا تھا جب میری جناتی صفات میرے ارادے کی پابند ہو جائیں گی۔ پھر میں اپنے والد کے قاتلوں کا سراغ لگا کر ان سے انتقام لے سکوں گا۔ اسنیٰ نے بتایا تھا کہ اس کے لیے مجھے سخت روحانی ریاضتوں سے گزرنا پڑے گا، مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا اسنیٰ کی اس بات سے میرے دل کو بڑا سکون ملا تھا کہ میں اس سے بھی زیادہ اپنے والد کے انتقام لینے کا اہل ثابت ہو سکتا تھا کیوں کہ میرے اندر جناتی صفات کے ساتھ انسانی صفات بھی تھیں انہی باتوں کو سوچتے سوچتے جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

میں بہت گہری نیند سویا ہوا تھا کہ کمرے کے دروازے پر زور زور کی دستکیں سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ہی بھائی رحمت علی کو کھڑے دیکھا۔ میرے ذہن پر ابھی تک نیند کا غبار چھایا ہوا تھا اس لیے دروازہ کھولنے کے باوجود انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

"اتنی دیر سے دروازے پر دستکیں دے رہا ہوں اور تم ہو کہ دروازہ ہی نہیں کھول رہے تھے۔ بھائی میرے اترولی چلنا ہے کہ نہیں؟" انہوں نے کہا۔

"اترولی!... مگر کس لیے؟" میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم شاید ابھی تک سو رہے ہو! میں عطا اللہ خان کے کمرے میں ہوں، تم تیار ہو کر وہیں آ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑ گئے۔

اسی وقت مجھے گزشتہ شب کے تمام واقعات یاد آ گئے اور میں نے بہ آواز بلند بھائی رحمت اللہ سے کہا "معاف کیجیے گا میں واقعی نیند میں تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" بھائی رحمت علی نے چلتے چلتے مڑ کر مسکراتے ہوئے کہا "میں سمجھ گیا تھا کہ تم سو رہے ہو۔"

دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں لہلہاتی فصلوں اور پھلوں سے لدے ہوئے درختوں کی درمیان بل کھاتی سڑک پر ہمارا یکہ آگے بڑھتا جا رہا تھا میرے علاوہ یکے میں تین افراد

اور تھے۔ میری ہی طرح ان کا تعلق بھی وطن پرست خفیہ تنظیم سے تھا۔ ان تینوں کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھے۔ مجھے ان کے متعلق صرف اتنا علم تھا کہ وہ وسط ہند کے مختلف شہروں سے علی گڑھ پہنچے تھے اور مجاہد اول کے حکم پر میرے ساتھ ایک اہم چھاپا مار کارروائی میں شرکت کرنے جا رہے تھے۔

میں اتروئی جا کر محدود پیمانے پر چھاپا مار تربیت حاصل کر چکا تھا۔ یہ تربیت حاصل کیے بھی اب مجھے دو ماہ سے اوپر ہو رہے تھے۔ تربیت حاصل کرنے والوں کا یہ چھوٹا سا گروہ گیارہ افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں سے تین ہم تھے یعنی میں' بھائی عطا اللہ خان اور بھائی رحمت علی۔ میں نے ایک ماہ کے دوران میں بہترین کارکردگی کا ثبوت دیا تھا تربیت کے آخری مرحلے میں مجاہد اول بھی ایک شب اتروئی پہنچ گیا تھا اور ہم سب سے ملا تھا۔ ہمیں تربیت دینے والے سالار عبد الرحمان نے میری بہت تعریف کی تھی۔

اتروئی میں زیر تربیت گیارہ نوجوانوں میں سے مجھے سالار عبد الرحمان نے اول منتخب کیا تھا۔ میں اس عرصے مختلف قسم کے ہتھیار چلانا بھی سیکھ چکا تھا میرا نشانہ بڑا سچا تھا جس کا عملی مظاہرہ مجھے مجاہد اول کے سامنے بھی کرنا پڑا تھا۔ تربیت حاصل کرنے کے لیے ہم سب نے شکاریوں کا بہروپ بھر لیا تھا۔

ایک ماہ کی اس تربیت کے بعد ہم تینوں اتروئی سے علی گڑھ لوٹ آئے تھے کیوں کہ اب مسلم اورینٹل کالج میں داخلے شروع ہو چکے تھے۔ کچھ تو میرے خالو خان بہادر بقا اللہ خان کی سفارش اور کچھ میری اہلیت کے سبب مجھے سیکنڈ ایئر میں داخلہ مل گیا۔ اس کے لیے مجھے سخت امتحان سے گزرنا پڑا تھا۔ سفارش کے باوجود امتحان لینے میں کوئی نرمی نہیں برتی گئی تھی۔ میں نے خط کے ذریعے ڈیڈی کو اپنے داخلے سے آگاہ کر دیا تھا تاکہ وہ علی گڑھ آنے کی زحمت سے بچ جائیں۔

مجھے کالج جاتے ہوئے ابھی ایک ہی ماہ ہوا تھا کہ مجاہد اول کا پیغام ملا۔ اس نے مجھے فوری طور پر شمالی ہندوستان کے ایک پہاڑی قصبے میں پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ یہ قصبہ نینی تال سے پندرہ میل دور بلندی پر تھا۔ اس قصبے میں پہنچ کر مجھے ایک شخص وہاب سے ملنا تھا جو اس قصبے کی مشہور سیاسی شخصیت تھا۔ یہ علم نہیں تھا کہ مجاہد اول نے مجھے وہاں کیوں طلب کیا تھا! میں بہرحال علی گڑھ سے روانہ ہو گیا۔

میں اس قصبے میں پہنچ کر بس سے اترا ہی تھا کہ ایک شخص میرے قریب آ کر آہستہ سے بولا "جو سال بھی گزرتا ہے سروں کے مینار بناتا ہوا گزرتا ہے۔"

"اور یہی سروں کے مینار ہماری منزل کا نشان ہیں" میں نے شناختی جملے کے جواب میں شناختی الفاظ دہرائے۔

"خوش آمدید!" یہ کہہ کر اس شخص نے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لینا چاہا۔

"شکریہ! میں خود لے کر چلوں گا' زیادہ بھاری نہیں ہے!"

یہی شخص وہاب تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے ایک تانگے میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ قصبے کی وہ مضافاتی بستی جہاں ایک بڑے سے گھر کے ایک کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ اسی رات مجاہد اول مجھ سے ملا اور میری طلبی کا مقصد بیان کیا۔ اس کے چہرے پر بدستور سیاہ نقاب تھی۔ کمرے کی بتی بھی اس نے نہیں جلانے دی تھی۔

دوسرے دن ہی صبح فجر کے وقت اٹھ کر میں اس جگہ گیا جس کی نشان دہی مجاہد اول نے کی تھی۔ یہ ایک چٹان تھی جو اس گھر کی شمالی سمت میں کچھ فاصلے پر دور ہی نظر آتی تھی۔ گھر سے نکلتے ہی شمال کی سمت دیکھ کر چٹان نظر آ گئی تھی۔ مجھے مجاہد اول وہاں اپنا منتظر ملا۔ وہ چٹان کی اوٹ میں تھا اور میرے وہاں پہنچتے ہی اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ وہ ایک ڈھیلے ڈھالے لبادے میں ملبوس تھا اور چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں کینوس کا ایک تھیلا دیکھا اور سمجھ گیا کہ تھیلے میں کیا ہو گا!

مجاہد اول مجھ سے آگے آگے چل رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ کیوں کہ راستہ ناہموار تھا تقریباً ایک گھنٹے تک ہم دونوں چہل قدمی کے ساتھ اس غیر آباد پہاڑی علاقے میں پیدل سفر کرتے رہے پھر ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں وہ رک گیا۔

میں نے پہلی بار مجاہد اول سے براہ راست ڈائنامائٹ استعمال کرنے کے نئے طریقے سیکھے اور پھر اس کی ہدایت کے مطابق غیر آباد پہاڑی علاقے میں ان طریقوں کو آزمایا بھی۔

پہلے ہی روز میں اپنی کوششوں میں کامیاب رہا تھا اور اس پر مجاہد اول کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔

"کمال ہے طارنوش کہ تم نے ایک ہی دن میں مجھ سے سب کچھ سیکھ لیا۔ تمہارے اندر سیکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔" مجاہد اول نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا "میں نے اندازہ لگایا تھا کہ تمہیں عملی تجربے کے لیے تیار ہونے میں کم از کم تین چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔"

"یہ سب آپ کی توجہ اور محبت کا اثر ہے۔" میں نے انکسار کا اظہار کیا۔

اس مختصر سی تربیت کے بعد مجاہد اول نے اسی ملاقات میں مجھے اصل مہم سے آگاہ کیا تھا "طارنوش! تمہاری اس تربیت کا مقصد علی گڑھ کے ایک قصبے جلالی کے قریب ایک عمارت کو تباہ کرنا ہے۔ اس مہم کے سربراہ تم ہو گے طارنوش! یہ خیال رکھنا کہ عمارت کے گرد سخت پہرا ہو گا اور پہرا دینے والے مسلح ہوں گے۔ تمہیں پہلے ان سے نمٹنا ہو گا۔ ان کی تعداد چار ہو گی اور وہ عمارت کی چاروں سمتوں میں متعین ہوں گے اور مجاہدین کی تعداد بھی تم سمیت چار ہی ہو گی۔ تم ان چاروں پر بیک وقت حملہ آور ہو گے۔ تین سرفروش جو تمہارے ساتھ ہوں گے' تمہارے ہر حکم کی پابندی کریں گے اور تمہاری مدد کریں گے۔ یہ مہم سر کرنے کے لیے تم کیا طریقہ اختیار کرو گے' یہ تمہیں خود سوچنا ہے تم کیا حکمت عملی اختیار کرو گے اس سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ صرف اتنا یاد رکھو کہ آج سے پورے ایک ہفتے کے بعد رات کو ٹھیک بارہ بجے وہ عمارت اڑ جانا چاہیے۔" اسی کے ساتھ مجاہد اول نے تاکید کی "تمہیں اس طرح وہ عمارت تباہ کرنا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی پوری طرح محفوظ رہیں! تمام کارروائی اس طرح عمل میں آنا چاہیے کہ تم اور تمہارے ساتھی کسی کی نظر میں نہ آ سکیں۔"

اس مخصوص عمارت کو کیوں تباہ کرنا تھا' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ دشمن پر کب اور کس طرح ضرب لگانا ہے' یہ مجاہد اول کی ذمے داری تھی جو ہمارا سربراہ تھا۔ ہم تو اس کے معمولی سپاہی تھے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے والے!

"طارنوش! تم یہ نہیں معلوم کرو گے کہ اس عمارت کو ہم کیوں تباہ کرنے والے ہیں؟" مجاہد اول نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"اے مجاہد اول! ہتھیار کبھی سوال نہیں کرتے۔ انہیں اس سے بھی کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ نشانے پر کون ہے! ان کا کام تو انگلی کے اشارے پر حرکت کرنا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو طارنوش! تم واقعی قوم کا اسلحہ ہو مگر دل و دماغ کے بھی مالک ہو۔ تمہیں بہرحال یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تم جو قدم اٹھا رہے ہو اس کا مقصد کیا ہے! اس سے متوقع نتائج حاصل کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ تو سنو!" مجاہد اول نے کچھ دیر رک کر کہا "انگریز حکومت نے ایک خاص مقصد کے تحت ہندوستان کے تقریباً ہر ضلع میں اسلحہ اور گولہ بارود کے ڈپوز قائم کرنا شروع کیے ہیں۔ اس کا آغاز اس نے اسی صوبے یعنی یوپی سے کیا ہے۔ یہ اسلحہ ڈپوز ہر ضلع کے کسی دور دراز اور غیر آباد علاقوں میں قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے یوپی کے ابھی صرف چار ہی اضلاع میں یہ خفیہ اسلحہ ڈپوز قائم ہو سکے ہیں۔ ہم اگلے ہفتے ان چاروں اسلحہ ڈپوز کو بیک وقت ایک ہی روز اڑا دینا چاہتے ہیں۔ ہماری اس کارروائی کا مقصد یہ ہے کہ ان چاروں اسلحہ ڈپوز کی تباہی کے بعد حکومت اپنے اس منصوبے کو ترک کر دے۔ ان اسلحہ ڈپوز کے قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر غلام قوم کبھی اور کسی مرحلے پر اپنے آقاؤں کے خلاف اٹھ کھڑی ہو تو اسے بہ آسانی اسلحہ کے زور پر دبایا جا سکے۔ انہی چاروں اسلحہ ڈپوز میں سے ایک کو تباہ کرنے کی ذمہ داری میں نے تمہیں سونپی ہے۔ سنو طارنوش! اب تک سارے ہندوستان میں ہماری سرگرمیاں بہت محدود اور مختصر پیمانے پر تھیں۔ یہ سب ایک بڑے مشن کا حصہ تھا۔ ان چاروں اسلحہ ڈپوز کی تباہی کا مطلب انگریزوں کے خلاف ہماری طرف سے اعلان جنگ ہو گا۔ اس کے بعد توڑ پھوڑ' آتش زنی اور سبوتاژ کی دوسری کارروائیاں شروع کی جائیں گی۔ امن و امان تہ و بالا کر دیا جائے گا۔ شدھی کی تحریک چلانے والے ظالم ہندوؤں سے ہم بھیانک انتقام لیں گے جو زبردستی مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے اپنے منصوبوں پر عمل کرنے والے ہیں۔ انگریز جو مسلمانوں کو ہندوؤں کی بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے انہوں نے جو حقوق نظام مرتب کیا ہے' ہم اس میں رخنے ڈال دیں گے۔ مجھے خوشی ہے طارنوش کہ ہمارے اس بڑے مشن کی افتتاحی مہم میں جو سرفروش حصہ لے رہے ہیں تم بھی انہی میں سے ایک ہو اور اس مہم کے ایک حصے کی سربراہی کر رہے ہو۔" یہ کہہ کر مجاہد اول خاموش ہو گیا غالباً اسے اب مزید کچھ نہیں کہنا تھا۔

"میرے ساتھ اس اہم مہم میں جو تین تنظیمی ساتھی ہوں گے وہ کون ہیں؟" میں نے دریافت کیا "ان کے نام۔۔۔"

"ان کا تعلق وسط ہند کے تین شہروں سے ہیں۔" مجاہد اول نے میری بات کاٹ کر کہا "ان کے نام ٹیپو' حیدر علی اور سراج الدولہ ہوں گے اور تم شاہین اول کے نام سے اس مہم میں شرکت کرو گے۔ چار شاہین' چار ضلعوں میں بیک وقت کارروائی کریں گے' بقیہ سربراہوں کے نام بھی شاہین دوم' سوم اور چہارم ہوں گے۔ تم اپنا اصلی نام کسی تنظیمی ساتھی کو نہیں بتاؤ گے۔" پھر مجاہد اول نے مزید بتایا "تمہارے نام ہی کی طرح تمہارے دوسرے تنظیمی ساتھیوں کے اصل نام

بھی راز ہی میں رہیں گے۔ وہ تینوں جیسا کہ میں نے بتایا مختلف علاقوں سے علی گڑھ پہنچیں گے۔ تم میں سے کوئی کسی کا اصلی نام پتا معلوم نہیں کرے گا۔ تم سب صرف مسلمان ہو، ہم مسلمان ہیں اور ہمارے لیے یہی جاننا کافی ہے کہ ہم ہندوستان کے باشندے ہیں اور مسلمان ہیں۔ سارا ہندوستان اس کے شہر گاؤں اور قصبے سب ہمارے ہیں!"

"لیکن اے مجاہد اول، اس رازداری کا سبب؟" میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"سبب یہ ہے طارنوش کہ ہم ابتدائی مراحل میں ہیں اور ذرا سی بھی بے احتیاطی اور غفلت ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ہرچند کہ ہم اپنے تنظیمی ساتھیوں پر مکمل اعتماد کرتے ہیں پھر بھی محتاط رہنا چاہتے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک بھی میر جعفر سب کے لیے ملک الموت بن سکتا ہے۔ تم سب میرے نزدیک خالص سونا ہو اور وقت کی بھٹی میں پک کر تمہیں کندن بننا ہے۔ تمہیں آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرتے ہوئے ایثار، تعاون، رفاقت اور دوستی کی حدیں طے کرنا ہیں اور اعتماد کی حد تک پہنچنا ہے۔"

"اے مجاہد اول! کیا اس طرح ایک دوسرے کے لیے ہمارے دلوں کو شکوک و شبہات پیدا نہیں ہوں گے؟ اور یوں کیا بے اعتمادی کی فضا پیدا نہیں ہو جائے گی؟"

میرے دل میں جو خدشات پیدا ہوئے تھے انہیں جان کر مجاہد اول نے مجھے سمجھایا "شکوک و شبہات اور بے اعتمادی کی فضا خود غرضی اور شخصی مفادات سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ رازداری ہمارے اجتماعی تحفظ کے لیے لازمی ہے۔ یہ نہ بھولو کہ ہمارے دشمن لامحدود وسائل کے مالک ہیں ہم ایک ظالم و غاصب حکومت سے ٹکر لے رہے ہیں اور ہم ایک ایسی قوم کے لیے نبرد آزما ہیں جس میں ملت فروش بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ذرا غور کرو کہ اس مہم کے دوران میں کسی بھی مرحلے پر تمہارا کوئی ساتھی پکڑا جائے تو وہ اگر چاہے بھی تو جان بچانے کی خاطر اپنے بقیہ ساتھیوں کی نشان دہی کا اہل نہیں ہوگا کیوں کہ تم میں سے کوئی نہ کسی کا اصل نام جانتا ہوگا، نہ اسے یہ معلوم ہوگا کہ کس کا تعلق کون سے شہر سے ہے!"

"اور فرض کریں، ہم چاروں ہی ایک ساتھ زیرِ حراست میں آ گئے؟" میں نے سوال کیا۔

"اس کا کوئی امکان نہیں۔" مجاہد اول نے جواب دیا "تم چاروں مل کر ایک فوج کے برابر ہو۔ تمہیں آخر دم تک مقابلہ کرنے کی تاکید ہے، ساتھ ہی یہ ہدایت بھی ہے کہ جب کوئی مفری راہ نہ ہو اور آخری گولی رہ جائے تو اس گولی سے خود کو نشانہ بنا لیا جائے۔"

"اور اگر کوئی ان ہدایات پر عمل نہ کرے؟" میں نے پوچھا۔

"بولو کیا تم میری ہدایات پر عمل کرنے سے گریز کرو گے؟" مجاہد اول نے کہا۔

"اپنی حد تک میں یقین دلا سکتا ہوں کہ جو کچھ مجھ سے کہا گیا ہے اسی پر عمل کروں گا۔" میں پُرعزم لہجے میں بولا۔

"یہی یقین تمہارے باقی ساتھیوں نے بھی مجھے دلایا ہے۔" مجاہد اول نے بتایا "مگر سنو! ہم بلا سبب کیوں کسی کی نیت پر شبہ کریں! ہم نے جو تنظیم بنائی ہے ایسی تنظیموں میں صرف وہی لوگ شرکت کرتے ہیں جو جان پر کھیلنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ غداری کے امکانات بہ مشکل ایک فیصد کے جا سکتے ہیں اسی ایک فیصد کے لیے یہ ساری احتیاط ہے ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی آستین کے سانپوں سے بھی چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔"

"آپ کا فرمانا قطعی درست ہے۔" میں عقیدت کے ساتھ بولا۔

"تمہیں بہرحال اس عمارت کو تباہ کرنا ہے۔ ہاتھ سے بنا ہوا یہ نقشہ اپنے پاس رکھ لو۔" مجاہد اول نے اپنے تھیلے سے ایک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا "اس نقشے میں اس عمارت کا محل وقوع موجود ہے۔ تمہیں جلالی کی طرف جانے والی عام شاہراہ سے ہٹ کر ایک گاؤں دھنساری کی طرف سے جلالی کی جانب بڑھنا ہوگا۔ راستے ہی میں یہ عمارت پڑے گی۔ تمہیں عمارت تباہ کرنے کے لیے کیا کیا سامان چاہیے، اس کی آج ہی فہرست بنا لو، مگر اس سے پہلے تمہیں اپنے منصوبے کی تمام جزئیات پر اچھی طرح غور کرنا ہوگا۔ اچھا اب رات کو ملاقات ہوگی ملاقات کہاں ہوگی؟ تمہیں شام کو معلوم ہو جائے گا۔"

مجاہد اول کے اشارے پر میں اٹھ کھڑا۔ ایک بار پھر وہ آگے آگے چلنے لگا۔ پھر جب دور سے قصبے کی آبادی نظر آنے لگی تو وہ مجھ سے رخصت ہو گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ٹھہرا تھا اور نہ ہی میں نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی۔ وہ سارا دن میں نے منصوبہ بناتے ہوئے گزارا۔

رات کو میں نے اپنے میزبان وہاب کی ہدایت کے مطابق کمرے کا دروازہ کھلا رکھا۔ وہ شام ہی کو بتا چکا تھا کہ مجاہد اول خود مجھ سے ملنے آئے گا۔ میں اسی کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ وہ آ گیا تو میں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ اس نے میرا منصوبہ سن کر پسندیدگی کا اظہار کیا اور منصوبے کو منظور کر لیا۔ میں نے ضروری سامان کی فہرست اسے دے دی۔ کمرے کے باہر برآمدے میں روشنی تھی۔ اس نے وہاں جا کر میری فراہم کردہ فہرست کا مطالعہ کیا تو پھر سامان کی خریداری کے لیے رقم میرے حوالے کر دی۔ یہ سامان مجھے علی گڑھ جا کر خریدنا تھا۔ اسی ملاقات میں مجاہد اول نے مجھے بتایا کہ جس روز عمارت تباہ کرنا ہے، اس سے ایک دن قبل بعد نماز عصر علی گڑھ شہر کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے میرے تینوں تنظیمی ساتھی پہنچ جائیں گے۔ ان کی پہچان اس نے یہ بتائی تھی کہ وہ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے ہوں گے اور کالی شیروانیاں ان کے جسموں پر ہوں گی۔

نینی تال کے اس پہاڑی قصبے سے میں دوسرے دن صبح ہی علی گڑھ روانہ ہو گیا۔ دوسرے ہی روز علی گڑھ آ کر میں نے ضروری سامان خرید لیا تھا۔

مقررہ دن عصر کی نماز میں نے شہر کی جامع مسجد میں پڑھی اور نماز پڑھ کر صدر دروازے سے باہر نکلا۔ سامنے ہی کوتوالی نظر آ رہی تھی جلد ہی وہ تینوں مجھے نظر آ گئے۔ شناختی جملوں کا تبادلہ کرنے کے بعد میں ان کے ساتھ چل دیا۔ وہ تینوں ریلوے اسٹیشن کے سامنے ایک مسافر خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دوسرے ہی دن صبح ہم چاروں ایک یکے میں بیٹھ کر جلالی کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

ہمیں سفر کرتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ آسمان پر کالی کالی گھٹائیں نظر آنے لگیں۔ مجاہد اول کی ہدایت کے مطابق ہم جلالی جانے والے عام راستے سے ہٹ کر چل رہے تھے۔ ہمارا سفر جاری رہا اور ہم دوپہر ہونے سے کچھ پہلے اس گاؤں کے نواح میں پہنچ گئے جس کا نام دھنساری تھا۔ کھیتوں کے سلسلے شروع ہو گئے تھے اور کسان کھیتوں میں کام کرتے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ کچھ دیر سستانے کے لیے ہم نے ایک کھیت کے کنارے جھاڑی کے پاس یکے کو روک لیا اور ہم اتر کر پیپل کے ایک گھنے پیڑ کے نیچے آ بیٹھے۔ ہم نے اس سے پہلے گھوڑے کے سامنے پانی میں دانہ رکھ دیا تھا۔ وقت یکا بھی چلا رہا تھا۔

اس درخت کے نیچے ہمیں بیٹھے دیکھ کر آس پاس کھیتوں میں کام کرنے والے کسان بھی آ گئے۔ یوں بھی دوپہر ہو رہی تھی اور کھانے کا وقت تھا۔ ہم کھانا اور پانی ساتھ لے کر چلے تھے۔ حیدر علی نے گھاس پر کپڑا بچھا کر توشہ دان کھول لیا تھا کچھ کسان بھی اسی پیڑ کے نیچے اپنا اپنا کھانا لے کر آ بیٹھے تھے۔

قریب ہی بیٹھے ہوئے دو کسانوں میں سے ایک نے ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟

"جلالی" جواب میں نے دیا۔

پھر پوچھا گیا کہ کہاں سے آ رہے ہو تو میں نے یہ بھی بتا دیا اور بولا "آئیں آپ لوگ بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائیں۔"

وہ دونوں بھولے بھالے کسان اپنا اپنا کھانا لے کر ہمارے پاس آ گئے اور پھر اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے دوسرے کسان بھی میرے کہنے پر ساتھ آ بیٹھے اور ہم سب مل کر کھانا کھانے لگے۔ مجھے اس میں بڑا مزہ آیا۔ کسانوں نے زبردستی ہمیں مکھن چپڑی میٹھی روٹیوں سے میٹھے رسیلے آم کھلائے۔ قریب ہی رہٹ کا جلترنگ سنائی دے رہا تھا۔

آس پاس کا منظر مجھے بہت حسین معلوم ہو رہا تھا۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی چہکار بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔ نرم ہوا لہلہاتی فصلوں کے پودوں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ اس تمام ماحول میں امن و سکون تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے کسان ہم سے شہر کی خبریں پوچھ رہے تھے۔ خلافت تحریک کی گونج اس گاؤں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ ان بے چاروں تک خبریں بہت دیر میں پہنچتی تھیں۔ ان کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ تحریک خلافت کے سارے اہم رہنما گرفتار کیے جا چکے ہیں۔ ایک کسان خیر محمد خلافت کے بارے میں مسلسل مجھ سے سوالات کیے جا رہا تھا۔ اس غریب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ترک عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید اب محض نام کا خلیفہ رہ گیا تھا۔ اس کی باگیں اب انگریزوں نے تھام رکھی تھیں۔ وہ اب مسلمانوں کا خلیفہ ہونے کی بجائے انگریزوں کا کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کی قوت کو منتشر کر دیا تھا۔ خیر محمد کو تو بس یہ خبر تھی کہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی، خلیفہ کی مدد کے لیے جہاد کر رہے ہیں اور لوگوں کو اس جہاد میں شریک ہونے پر آمادہ کر رہے ہیں۔ اس جہاد میں کامیابی کے بعد مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ پھر ہندوستان میں ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی ہوگی۔

خیر محمد کا بیٹا کرم دین بھی اس کے ساتھ تھا اور وہ بڑی دلچسپی سے ساری باتیں سن رہا تھا۔ ایک موقع پر وہ بول پڑا "بابو جی! انگریجن سے کیسے حکومت لیو گے؟"

"ہم انگریزوں سے ان کے ہتھیار چھین کر انہیں ہندوستان سے نکال دیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"جانت ہو بابو فر ہم کا کریں گے؟" کرم دین کے اس طفلانہ انداز پر میں نے انکار میں سر ہلا دیا تو وہ راز افشا کرنے

والے انداز میں کہنے لگا "پھر میں تو بابو تالہ مرلی دھر سسرے کو مار دوں گا جان سے!" کرم دین نے دانت کچکچا کر اپنے عزم کا اظہار کیا۔

میں بھی اور میرے ساتھی بھی اس نوعمر بچے کی بات سن کر چونک اٹھے۔

"بک بک نا کرائے کرمو!۔ خاموش رہو!" خیر محمد نے بیٹے کو جھڑک دیا۔

"کیا بات ہے خیر محمد؟" سراج الدولہ نے پوچھا "یہ لالہ مرلی دھر کون ہے؟"

"کوئی نا بابو جی!" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

ہم لوگوں کے اصرار و استفسار پر بہ مشکل خیر محمد نے بتایا کہ لالہ مرلی دھر کون تھا اور اس کا بیٹا لاالہ کو کیوں مار ڈالنا چاہتا تھا۔

لالہ مرلی دھر قصبہ جلالی کا ایک بڑا زمیندار تھا۔ وہ خیر محمد کی بہن پر بری نظر رکھتا تھا۔ اس نے خیر محمد کو لالچ دیا تھا کہ اگر وہ اپنی بہن کی شادی اس سے کر دے تو تمام قرض معاف کر دے گا۔ خیر محمد نے اس کی پیشکش ٹھکرا دی تھی کہ وہ مسلمان ہے اور ہرگز اپنی بہن کی شادی ایک ہندو بنیئے سے نہیں کرے گا۔ لالہ مرلی دھر نے اس کا حل خیر محمد کو یہ بتایا تھا کہ وہ اپنے تمام خاندان کے ساتھ شدھی ہو جائے۔ شدھی ان مسلمانوں کو کہا جاتا تھا جنہیں روپے پیسے کا لالچ دے کر یا پھر دھونس دھمکی سے ہندو بنا لیا جاتا تھا۔ سارے ہندوستان میں سوامی شردھانند کی چلائی ہوئی شدھی تحریک کے تحت مسلمانوں پر یہ ظلم شروع ہو گیا تھا۔ خیر محمد اس پر بھی آمادہ نہ ہوا تو لالہ مرلی دھر نے ایک اور راہ نکالی۔ وہ خیر محمد سے بولا کہ اگر تم شدھی نہیں ہوتے تو میں اس پر بھی راضی ہوں کہ صرف تمہاری بہن کو شدھی بنا کر اس سے شادی کر لوں کیوں کہ میں اپنا دھرم "مذہب" نہیں چھوڑ سکتا۔ خیر محمد یہ سن کر غصے میں آ گیا اور لالہ مرلی دھر سے کہا ہم مسلمان ہیں جان دے سکتے ہیں یہ پاپ ہم نہ کریں گے! پھر خاصی گرما گرمی کے بعد لالہ مرلی دھر، خیر محمد کو دھمکیاں دے کر چلا گیا تھا۔

چند ہی روز بعد لالہ مرلی دھر نے غنڈوں کے ذریعے خیر محمد کی بہن کو اغوا کرا لیا۔ خیر محمد نے بڑی کوشش کی مگر اس کی بہن کا کہیں پتا نہ چلا۔ کئی روز کے بعد لالہ ہی کے ایک آدمی سے خیر محمد کو ایک اندوہناک خبر ملی۔ اس آدمی نے بتایا کہ غنڈے خیر محمد کی بہن کو اغوا کر کے جلالی میں لالہ مرلی دھر کی حویلی میں لے گئے تھے مگر اس سے پہلے کہ لالہ مرلی دھر اپنا دست ہوس دراز کرتا خیر محمد کی بہن نے حویلی کے کنویں میں کود کر خودکشی کر لی تھی۔

غریب خیر محمد کسان کی ساری دکھ بھری داستان سننے کے بعد میں نے اسے تسلی دی "تم پروانہ کرو! ہو سکتا ہے کہ تمہاری مدد کر سکیں۔ لالہ کا پتا بتاؤ!"

خیر محمد اپنا انتقام خود لینا چاہتا تھا مگر میرے اصرار پر اسے پتا بتانا ہی پڑا۔ شام تک ہم نے وہیں آرام کیا اور پھر چل پڑے۔

فضا میں خاصا حبس بڑھ گیا تھا اور آسمان پر اب بادل گھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ذرا ہی دیر میں بجلی چمکنے لگی اور بادل گرجنے لگے پھر نم آلود ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ موسم کے تیور دیکھ کر نیپو فکر مند ہو گیا۔

"شاہین! بارش آ گئی تو؟" نیپو مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ہمارا سفر پھر بھی جاری رہے گا۔ یہ موسم ہمارا راستہ نہیں روک سکتا۔ ہمیں ہر حال میں وقت مقررہ سے پہلے اپنی منزل تک پہنچنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں شاہین!" نیپو نے کہا "میرا مطلب محض یہ تھا کہ بارش کی وجہ سے ہمیں دیر ہو سکتی ہے۔"

"ہماری منزل یہاں سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ انشاء اللہ وقت سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ اگر دیر ہونے کا خدشہ ہوا تو ہم رفتار بڑھا دیں گے۔"

کچھ ہی دیر کے بعد آسمان پر چھائے ہوئے سیاہ بادلوں میں اضافہ ہو گیا اور رہ رہ کر بجلی کوندنے لگی۔ سورج بالکل چھپ گیا اور ہر طرف اندھیرا سا پھیل گیا۔ ہوا کے جھکڑوں میں بھی شدت آ گئی۔ پھر موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہو گئیں اور چند لمحوں بعد ہی موسلادھار بارش ہونے لگی۔ گٹھڑیوں میں بندھے ہوئے تھیلوں کو میں نے ایک بار پھر احتیاط سے لپیٹا اور ان پر ترپال ڈال دیا۔

خدا خدا کر کے ہم وقت سے پہلے اپنی منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئے کیوں کہ ہمیں اطراف کا جائزہ بھی لینا تھا۔ وہ جگہ بہرحال ہمارے لیے بالکل نئی تھی۔ ہم سے کچھ ہی فاصلے پر وہ مطلوبہ عمارت تھی جسے تباہ کرنا تھا۔

اگرچہ بارش نے ہماری راہ میں کافی مشکلات پیدا کر دی تھیں مگر ہم ہمت نہیں ہارے تھے۔ کچی سڑک کو بارش نے کیچڑ اور گارے میں تبدیل کر دیا تھا اور آدھے کوس کا فاصلہ بہت تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ یکے کے پہیے کیچڑ میں پھنس جاتے تھے ہمیں یہ فاصلہ اسی سبب پا پیادہ ہی طے کرنا پڑا تھا۔ یکے کی رفتار بہت کم رہ گئی تھی۔ گھوڑا بھی تھک گیا تھا۔ جہاں بھی یکے کے پہیے کیچڑ میں دھنس جاتے ہم زور لگا کر یکے کو آگے بڑھاتے۔ آدھے کوس سفر کرنے کے بعد یکے کو ہم نے کچی سڑک پر ڈال دیا تھا۔ ہم نے احتیاط کے پیش نظر یہ کچا راستہ اختیار کیا تھا جو کچا بھی تھا اور بارش کی وجہ سے دشوار گزار بھی ہو گیا تھا۔ اس احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی اور تلاشیاں لے رہی تھی۔ پرنس آف ویلز ہندوستان آنے والا تھا اس لیے حکومت کچھ زیادہ ہی چوکنا ہو گئی تھی۔ حالانکہ ابھی یہ طے نہیں ہوا تھا کہ وہ کب آئے گا! ظاہر ہے کہ ہم ممکنہ تلاشی سے بچنا چاہتے تھے ہمارے پاس جو سامان تھا اس کی موجودگی میں ہم بہ آسانی پولیس کی گرفت میں آ سکتے تھے۔

نیپو نے میرے کہنے پر اسلحہ ڈپو سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے یکا روک لیا تھا۔ بارش تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جب بجلی چمکتی تو اس اندھیرے میں شگاف پڑ جاتا۔ نقشے کے مطابق ہمیں اسی پیڑ کے نیچے ٹھہر کر اپنے ایک ساتھی کا انتظار کرنا تھا وہ یکا لے کر چلا جاتا اور پھر ہم اپنی کارروائی کا آغاز کرتے۔

ہمیں وہاں ٹھہرے ہوئے تقریباً نصف گھنٹا ہوا تھا کہ اندھیرے کی چادر میں ایک متحرک ہیولا سا نظر پڑا۔ ذرا ہی دیر کے بعد ایک نوجوان یکے کے قریب آ گیا۔ ہمارے قریب پہنچتے ہی اس نے کہا "رات کتنی ہی تاریک کیوں نہ ہو صبح ضرور ہوتی ہے۔"

یہ یقیناً ہمارا ساتھی تھا ہم جس کے منتظر تھے۔ اس نے جو جملہ ادا کیا تھا اس سے ہم نے اسے شناخت کر لیا تھا۔

"تو پھر اسے ساتھی یکا لے جاؤ! یہ تمہیں منزل پر پہنچا دے گا۔" میں نے جواباً اپنی شناخت کے الفاظ ادا کیے۔

اس نوجوان نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور یکے پر چڑھنے لگا۔ ہم نے یکے میں رکھی ہوئی چاروں گٹھریاں اٹھا لیں۔ ان گٹھریوں میں کینوس کے بڑے بڑے تھیلے بندھے ہوئے تھے۔ آنے والے ساتھی کو یکا لے کر چلے جانا تھا۔ اس نوجوان کو کہاں جانا تھا؟ اس سے ہمیں کوئی غرض نہ تھی۔ ہمیں تو اپنی مہم سر کرنے کے بعد آگے جانا تھا۔ مجاہد اول نے جاں نثاروں کے اس گروہ کو اس طرح منظم کیا تھا کہ ہر فرد کو صرف اتنی ہی بات کا علم ہوتا تھا جتنی اس کے سبب سے متعلق ہوتی تھی۔ ہر مہم میں ساتھی بدل جاتے تھے۔ یہ بات مجھے خود مجاہد اول ہی نے بتائی تھی۔

وہ نوجوان یکا لے کر چلا گیا تو ہم گٹھریاں اپنے سروں پر رکھ کر درختوں کے جھنڈ میں گھس گئے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم کچھ دیر اسی جھنڈ میں رہے ابھی ہمارے پاس خاصا وقت تھا۔

بارش اور بھی تیز ہو گئی تھی اور ایسے میں کوئی بھی باہر نکلنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ وہی موسم جو دن کے وقت اور شام کو ہمارے لیے پریشان کن تھا اس وقت حلوہ ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے ایک ساتھی سراج الدولہ کو مخاطب کیا "ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔ قدرت ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ ایسے میں پہرے داروں کو ٹھکانے لگانے کا خطرہ بھی مول لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ اس موسلادھار بارش میں وہ پہرا دینے باہر نہیں نکلیں گے اور عمارت کے اندر ہی رہیں گے۔"

"اور عمارت کے ساتھ ہی وہ بھی جہنم رسید ہو جائیں گے۔" حیدر علی بولا۔

"انشاء اللہ!" میں نے کہا۔ پھر نیپو سے بولا کہ وہ ڈائنامائٹ اور اوزاروں کو تھیلوں سے نکال لے۔ اس عمارت کو اڑانے کے لیے اس کی چاروں دیواروں میں ڈائنامائٹ لگانا ضروری تھا۔ اپنے ساتھیوں کو میں نے ہدایت دی کہ وہ سڑک پر نظر رکھیں اور کوئی شخص ادھر آتا دکھائی دے تو منہ سے الو کی آواز نکال کر خطرے کا اشارہ کریں تاکہ ہم اپنی حفاظت کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہم سب نے بھرے ہوئے لمبی نال والے جرمن ریوالور بھی اپنے لباس میں چھپا لیے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو یہ تاکید بھی کی تھی کہ اگر چاروں پہرے داروں میں سے کوئی بھی باہر آ جائے تو اسے فوراً گولی مار دیں۔

ہم سب ایک ایک کر کے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر عمارت کی طرف بڑھے۔ اسی وقت بارش ہلکی ہو گئی۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ بارش جلد ہی رک جائے گی اور یہ ہمارے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ بارش رکنے کی صورت میں ظاہر ہے کہ پہرے دار اس عمارت سے باہر آ جاتے۔

اب تو ہم درختوں کے جھنڈ سے باہر آ ہی گئے تھے اس لیے جو بھی ہونا ہو بھگتنا پڑتا۔ ہم چاروں عمارت کی چاروں سمتوں میں پھیل گئے۔ عمارت کے سامنے والے رخ پر کیوں کہ زیادہ خطرہ تھا میں اسی لیے اس سمت بڑھا۔ اسی طرف عمارت کا صدر دروازہ تھا جس سے نکل کر پہرے دار باہر آ سکتے تھے اس مہم کی بنیادی کام میں نے اپنے ذمے رکھا تھا۔ مجھے ہی اس عمارت کو ڈائنامائٹ کرنے کے لیے سوراخ بنانے کی مناسب جگہیں منتخب کرنا تھیں اور یہ ایک کام تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے عمارت کی چاروں سمتوں میں صرف [illegible] کوشش کام کرنا تھا۔

سامنے کے رخ آ کر میں نے چند سیڑھیوں کے بعد ایک برآمدہ دیکھا' پھر میری نگاہ صدر دروازے پر پڑی۔ اس کے اوپری حصے میں شیشے لگے ہوئے تھے جن میں بجلی کی روشنی نظر آرہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ یہ دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ معاً مجھے ایک خیال آیا اور پھر میں جلدی جلدی پیٹ کے بل رینگتا ہوا پہلے برآمدے میں پہنچا اس کے بعد دروازے تک پہنچ گیا۔ میں نے باہر سے دروازے کی بھاری کنڈی لگادی اب اس عمارت میں موجود پہریدار باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اس اطمینان کے بعد میں نے اپنا کام شروع کردیا۔

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تک میں اپنا کام ختم کرچکا تھا۔ صدر دروازے کے قریب بھی میں نے ڈائنامائٹ رکھ دیے تھے۔ اب صرف اتنا کام باقی تھا کہ فیتے کے تاروں کی لمبائی اس طرح رکھی جائے کہ تمام ڈائنامائٹ ایک ساتھ پھٹیں اور یہ کام زیادہ مشکل نہ تھا۔

تمام کام ختم کرنے کے بعد جب میں اپنے ساتھیوں کو لے کر قریبی درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ رہا تھا تو بارش بالکل رک چکی تھی۔ ابھی ہم چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ عقب سے اس طرح کی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا ہو۔ ہم سبھی چونک اٹھے۔ میں سمجھ گیا کہ عمارت میں موجود پہریدار اب باہر نکلنا چاہتے ہیں۔

"یہ آوازیں کیسی ہیں؟" سراج الدولہ نے مجھ سے پوچھا۔

"پہریدار اپنے مشترکہ حجرے سے باہر نکلنے کے لیے عمارت کا صدر دروازہ پیٹ رہے ہیں جسے میں باہر سے بند کر آیا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"اور اگر وہ عمارت کے تباہ ہونے سے پہلے دروازہ توڑ کر باہر آگئے تو؟" ٹیپو فکر مند لہجے میں بولا۔

"اول تو میں دیکھ چکا ہوں کہ دروازہ بہت مضبوط ہے' آسانی سے نہیں ٹوٹے گا' پھر بھی اگر ایسا ہوا تو وہ ہماری گولیوں کا نشانہ بن جائیں گے انہیں زندہ چھوڑ دینا بہرحال ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔

مجاہد اول کی ہدایت کے مطابق اپنا کام ختم کرکے ہم سب کو الگ الگ ہوکر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہونا تھا۔ مجھے علی گڑھ واپس پہنچنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ کام ختم ہونے کے بعد ہمیں ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جانا تھا' لیکن میں نے کچھ اور فیصلہ کیا تھا۔ مجھے دھنساری گاؤں کے کسان خیر محمد سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا۔ میں اسی لیے یہاں سے جلدی جانا چاہتا تھا۔ نقشے کے مطابق قصبہ جلالی وہاں سے صرف ڈھائی تین میل کے فاصلے پر تھا اور میں پیدل چل کر بہ آسانی یہ فاصلہ طے کرسکتا تھا۔ جلالی پہنچ کر میں لالہ علی دھر سے خیر محمد کی معصوم و بے گناہ بہن کی موت کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ ابھی میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ لالہ علی دھر سے کس طرح اور کیا انتقام لوں گا۔

"مجھے اب تم لوگوں کی مدد کی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا "تم لوگ اب اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہوسکتے ہو۔"

"اور آپ؟" ٹیپو نے سوال کیا۔

"میں یہاں سے جلالی جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

میرے تینوں ساتھی بھی شاید میری ہی طرح سوچ رہے تھے۔ ان تینوں ہی کے منہ سے بیک وقت لالہ علی دھر کا نام نکلا۔

"ہاں' میں اسی کی خاطر جلالی جانا چاہتا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"تو پھر ہم بھی آپ ہی کے ساتھ چلیں گے۔" ٹیپو نے کہا۔

"نہیں' تم لوگ میرے ساتھ نہ چلو۔" میں بولا "مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کیا قدم اٹھاؤں گا! اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ کیا کیا خطرات حو[illegible]

وہ لوگ نہیں مانے اور مجھے ان کی بات ماننا ہی پڑی۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ میرا ساتھ دیں گے۔

"شاہین! لالہ علی دھر کا معاملہ نمٹنے کے بعد ہی ہم اپنی اپنی منزلوں کی طرف واپس جائیں گے' اس سے پہلے نہیں۔" ٹیپو نے اپنے [illegible]

اب میرے لیے بحث کی گنجائش نہیں تھی "ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "معلوم نہیں کہ اس مہم کے بعد پھر کبھی ملاقات ہوسکے یا نہیں' مگر میں یہ مختصری رفاقت کبھی نہیں بھول سکوں گا۔" میں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔

عمارت کا صدر دروازہ دھڑ دھڑانے کی آوازوں میں اب شدت آگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اب عمارت میں موجود افراد دروازے کو توڑ دینا چاہتے ہوں۔ میں سوچنے لگا کہ وہ لوگ بھی کتنے بدنصیب ہیں! انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کچھ ہی دیر بعد ان کے جسم چیتھڑے بن کر فضا میں بکھر جائیں گے ہم اس طرح چوکنا بیٹھے ہوئے تھے کہ عمارت کا صدر دروازہ ہماری نظر میں رہے۔ خدانخواستہ اگر وہ پہریدار دروازہ توڑ کر باہر آجائیں تو ہم انہیں گولیوں سے چھلنی کردیں۔

میں نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں چھوٹی سی ٹارچ جلا کر وقت دیکھا۔ ابھی بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ ہم نے اس دوران میں تھوڑے فاصلے پر ایک گڑھا کھودا اور اس میں کینیس کے تین تھیلے دبا دیے۔ ہمارے پاس اب صرف ایک تھیلا تھا جس میں ہم سب کا ضروری سامان اور کپڑے تھے۔ برے کا سوراخ کرنے والا حصہ نکال کر میں نے بھی ایک جھاڑی کے پیچھے مٹی میں دبا دیا۔ سوراخ کرنے والا حصہ میں نے تھیلے میں ڈال دیا تھا۔ سن کی موٹی رسی کے تین لچھے بھی جو باقی بچے تھے میں نے رکھ لیے۔

بارہ بجنے میں اب صرف دس منٹ رہ گئے تھے۔ ڈائنامائٹ کا فیتہ تین منٹ کا تھا یعنی فیتے کے آگ پکڑنے کے ٹھیک تین منٹ بعد ڈائنامائٹ پھٹ جاتے۔ یوں اب سات منٹ باقی تھے' مگر یہ سات منٹ مجھے صدیوں پر محیط معلوم ہوئے۔ وقت جیسے رک گیا تھا۔ میری نظریں عمارت کے صدر دروازے پر جمی ہوئی تھیں کہ کہیں دروازہ توڑ کر مسلح پہریدار باہر نہ آجائیں۔ ریوالور کا رخ اسی طرف تھا۔ میری ہدایت پر میرے ساتھیوں نے بھی ریوالور نکال کر اسی طرف تان لیے تھے کیوں کہ دروازہ توڑے جانے کی آوازوں میں اب بڑی شدت آگئی تھی۔ پہریداروں کو یقیناً خطرے کا احساس ہوگیا تھا ظاہر ہے کہ اس ویرانے میں رات کے وقت باہر سے دروازہ بند کرنے والا ان کا کوئی دوست نہیں ہوسکتا تھا۔ جیسے جیسے کامیابی کے لمحات قریب آتے جارہے تھے' میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسی وقت اس صوبے کے مزید تین مقامات پر میرے کچھ اور ساتھی بھی اسی کیفیت سے دوچار ہوں گے۔ انہیں بھی میری ہی طرح کسی عمارت کے اڑنے کا انتظار ہوگا۔ میرے لیے تو خیر یہ پہلی مہم تھی مگر شاید ان کے لیے ایسا نہ ہو۔ وہ غالباً میری طرح مضطرب نہیں ہوں گے' کم از کم اتنے مضطرب نہیں ہوں گے جتنا میں تھا۔ میری کیفیت اس طالب علم کی سی تھی' جس نے پہلی بار امتحان دیا ہو اور نتیجے کا منتظر ہو۔ یہ مہم چھاپا مار کارروائیوں کا نقطۂ آغاز تھی۔ میں اسی لیے ہر قیمت پر اس کی کامیابی کا متمنی تھا۔

• طویل لمحے آخر کار بیت ہی گئے۔ میں نے فیتوں [illegible] لگائی اور پھر تیزی کے ساتھ اس جگہ سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ خاصے فاصلے پر پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا فیتے تیزی کے ساتھ سلگ رہے تھے اب صرف دو منٹ کی بات اور رہ گئی تھی۔

"سب کچھ ٹھیک ہے نا شاہین؟" ٹیپو نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے دھڑکتے دل سے جواب دیا "ہاں" پھر میں عمارت کی طرف دیکھنے لگا میں نے گھڑی دیکھی' دس سیکنڈ باقی تھے۔ بے اعتمادی کا وہ بڑا جاں گسل وقت تھا۔ عمارت اب تاریکی کے سبب نظر نہیں آرہی تھی میں دل ہی دل میں لمحوں کا شمار کرنے لگا' ایک۔ دو۔ تین۔

"دس!" میں بلند آواز میں بولا' مگر سب کچھ جوں کا توں تھا۔ عمارت ابھی تک اڑی نہیں تھی۔ فضا میں اس وقت مجھے پُراسرار سی خاموشی محسوس ہوئی۔ قبرستان کا سا سکوت ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا' کیا سارے ڈائنامائٹ ناقص تھے؟

"کیا بات ہے شاہین؟" شاید سراج الدولہ نے مجھے مخاطب کیا تھا "کیا کوئی خرابی ہوگئی؟"

ابھی میں کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ پے در پے کئی دھماکے ہوئے اور پھر فضا مسلسل دھماکوں سے گونج اٹھی۔ یقیناً عمارت اڑ چکی تھی اور اب اس کے اندر موجود گولہ بارود پھٹ رہا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کے گلے لگ گئے میری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"مبارک ہو شاہین!" ٹیپو کی آواز شدت جذبات سے مرتعش سی تھی۔ ہم سبھی جذبات سے مغلوب تھے۔

"تم سب کو بھی مبارک ہو۔" میں نے جواباً کہا اور پھر میں وہیں سجدے میں گر گیا میرے تینوں ساتھیوں نے بھی میری تقلید کی۔

"شاہین!" حیدر علی مجھ سے مخاطب ہوا۔ ہم سب سجدے سے اٹھ چکے تھے "کیا ہم آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں گے؟"

"کچھ نہیں کہا جاسکتا ساتھیو!" میں نے دکھ بھری آواز میں کہا "مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر کے عبرت ناک انجام کے بعد نہ معلوم کتنے لوگ اسی سوال کے جواب کی امید میں اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں۔ ہمیں تو صرف اتنا معلوم ہے کہ ہم ہر گزرتے لمحے کے ساتھ آزادی سے قریب ہوتے جارہے ہیں۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ آزادی کا سورج کب طلوع ہوگا' مگر یہ یقین لازماً ہے کہ میں اس اطمینان کے ساتھ مروں گا میری زندگی بامقصد گزری ہے۔"

کچھ ہی دیر کے بعد ہم چاروں جلالی کے قصبے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

●●●

رات کے دو بجنے والے تھے۔ میں' ٹیپو اور سراج الدولہ

لالہ مرلی دھر کی حویلی کی چھت پر تھے۔ سراج الدولہ اور نیچو تو میرے ساتھ تھے اور حیدر علی نیچے اس کمرے میں ایک مسہری کے نیچے چھپا ہوا تھا جس میں دو نوجوان لڑکیاں سو رہی تھیں۔

جس وقت ہم اس حویلی کے سامنے پہنچے تھے تو لالہ کی کوٹھی کی بیٹھک میں خلاف توقع روشنی ہو رہی تھی۔ حویلی کے باہر تانگے، یکے اور بگھیاں کھڑی ہوئی تھیں یہ صورت حال دیکھ کر ہم حویلی کے عقبی حصے کی طرف آ گئے تھے۔ خیر محمد سے میں نے بڑی تفصیل کے ساتھ حویلی کا پتا اور محل وقوع پوچھا تھا ورنہ اسے تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔

حویلی کے عقبی حصے ہی میں احاطے کے اندر چھوٹا سا ایک مندر بنا ہوا تھا۔ مندر کے ساتھ ہی ایک کنواں بھی تھا شاید یہ وہی کنواں تھا جس میں کود کر خیر محمد کی بہن نے خود کشی کی تھی۔ احاطے میں باغ پھیلا ہوا تھا۔ ہمیں اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ایک درخت پر چڑھ کر ہم رسی کے ذریعے باغ میں اتر گئے تھے۔ سب سے پہلا کام ہم نے یہ کیا تھا کہ وہاں سے فرار کی راہ پیدا کر لی تھی۔ ہم نے عقبی دروازے کی کنڈی کھول دی تھی ہماری واپسی اسی کے ذریعے ہونا تھی۔

کچھ وقفے کے بعد بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ باغ میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ صرف ایک جانب باورچی خانے میں روشنی تھی جس کے ساتھ ہی اوپر جانے کے لیے زینہ تھا۔ ہم نے دیکھ لیا تھا کہ باورچی خانے میں ایک بوڑھا اور بڑھیا بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ باغ میں اترتے ہی ہم نے اپنے چہرے رومالوں کے پیچھے چھپا لیے تھے۔ صرف ہماری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اپنے جوتے ہاتھ میں لے کر ہم آہستہ قدمی کے ساتھ باورچی خانے کے برابر موجود زینے سے چھت پر آ گئے تھے۔ چھت پر پہنچ کر میں نے روشن دانوں کے ذریعے کمروں کا جائزہ لیا۔ ایک کمرے میں دو نوجوان لڑکیاں سو رہی تھیں میرا اندازہ تھا کہ وہ دونوں لالہ مرلی دھر ہی کی بیٹیاں تھیں۔

ایک اور کمرے میں ادھیڑ عمر عورت خوابیدہ تھی اس کے برابر والی مسہری خالی تھی۔ یہ لالہ مرلی دھر کا کمرا لگتا تھا ادھیڑ عمر عورت لالہ کی بیوی ہو سکتی تھی۔

میں نے اس جائزے سے اندازہ لگایا کہ مہمانوں کو رخصت کر کے لالہ مرلی دھر کمروں کو اندر سے بند کر لے گا۔ ہمارے لیے اس سے مشکلات ہو سکتی تھیں۔ میں نے اسی لیے حیدر علی کو نیچے بھیجا تھا کہ وہ کسی کمرے میں چھپ جائے۔

نیچو اور سراج الدولہ کو چھت کے دو مختلف گوشوں میں چوکنا بیٹھنے کی ہدایت کر کے میں اس روشن دان کی طرف بڑھا جس سے بیٹھک میں جھانک سکتا تھا۔ بیٹھک کا جائزہ لے کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے ادھر پہلے توجہ دینا چاہیے تھی وہاں ایک اہم اجلاس ہو رہا تھا اس اجلاس میں جلالی کے سرکردہ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ ہندو غنڈے اور ہندو کوتوال بھی شرکت کر رہا تھا۔ جو باتیں میں نے سنیں ان سے معلوم ہوا کہ وہ یہ اجلاس شدھی تحریک کے سربراہ سوامی شردھانند کی ہدایات پر عمل کرنے کے لیے منعقد ہو رہا تھا۔ سوامی شردھانند نے مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے کے لیے پورے ہندوستان میں تحریک شروع کر دی تھی۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ جو مسلمان ہندو نہ بنائے جا سکیں انہیں قتل کر دیا جائے۔ اس مذموم مقصد کی خاطر ہندو سرمایہ داروں نے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے تھے۔ تحریک پر عمل کرنے کے لیے ہندو غنڈوں اور ہندو طلبہ کو ساتھ ملا لیا گیا تھا۔ جلالی میں اس تحریک کا سربراہ لالہ مرلی دھر تھا اور خازن بھی وہی تھا۔ لالہ کے سامنے میز پر نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان گڈیوں میں سے اس نے دو گڈیاں اٹھا کر ایک شخص کو دے دیں۔

"یہ رکھو!" لالہ مرلی دھر نے اس شخص سے کہا "باقی رقم کام پورا ہونے کے بعد ادا کی جائے گی۔ تم تیاری کرو شمبھو!"

وہ شخص شمبھو صورت ہی سے غنڈا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے لالہ سے پوچھا "بندوقیں کب ملیں گی؟"

لالہ مرلی دھر کی بجائے شمبھو کی بات کا جواب ہندو کوتوال نے دیا "کل رات یہیں سے تمہیں اسلحہ مل جائے گا۔"

"تو پھر اب میں چلتا ہوں۔" شمبھو بولا اور اٹھ کھڑا ہوا "جے رام جی کی!"

"رام بھلی کرے۔" لالہ مرلی دھر نے کہا۔ شمبھو بیٹھک کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ چار اور افراد بھی اٹھ کر چلے گئے۔ بیٹھک میں اب لالہ سمیت صرف چھے افراد رہ گئے تھے۔ لالہ مرلی دھر نے کوتوال کو مخاطب کیا "شرما جی! اس دھرم سینا (مذہبی فوج) کی حفاظت کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

"پروا ہی نہ کریں لالہ جی! یہ تو میرا فرض ہے۔" کوتوال شرما نے یقین دلایا۔

لالہ مرلی دھر نے ایک گڈی اٹھا کر کوتوال کی طرف بڑھا دی "یہ تمہاری خدمت کا صلہ ہے۔"

کوتوال نے نوٹوں کی گڈی لے کر شکریہ ادا کیا اور کھڑا ہو گیا "ہر چیز آپ کو کل فراہم کر دی جائے گی۔"

"دھرم سیو کو!" لالہ مرلی دھر نے کوتوال شرما کے جاتے ہی باقی رہ جانے والے چار افراد سے کہا "ابھی دس ہزار روپیا اور چاہیے۔ آپ کتنا اور دے سکتے ہیں؟"

جواب میں وہ چاروں ہندو سیٹھ اپنی اپنی کاروباری مشکلات کا رونا رونے لگے۔ پھر انہوں نے دو دو ہزار روپے دینے کی ہامی بھر لی۔ مگر اس سے پہلے لالہ مرلی دھر ان کے کام کرانے کا وعدہ کر چکا تھا ان میں سے دو کو سرکاری ٹھیکے درکار تھے۔ ایک کو ریلوے میں اپنے مال کی سپلائی کا پرمٹ مطلوب تھا اور دوسرے کو قریبی جنگلوں میں لکڑی کاٹنے کی اجازت چاہیے تھی۔ سارے معاملات طے پا گئے تو وہ چاروں بھی چلے گئے۔ دو دو ہزار میں انہوں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔ پن (ثواب) منافع میں تھا۔

"ہری!۔۔ چنکو!" لالہ مرلی دھر نے اپنے ملازمین کو آواز دی اور کہا "بند کرو!" یہ کہہ کر اس نے بیٹھک کا دروازہ بند کر دیا، پھر نوٹوں کی گڈیاں سمیٹ کر وہاں سے دوسرے کمرے کی طرف چل دیا۔

میرے سینے میں جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔ اس کمینے بنیے نے سوامی شردھانند کی ہدایت پر مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے یا انہیں راستے سے ہٹا دینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میں اس منصوبے کو ناکام بنا دینا چاہتا تھا۔ اب مجھے لالہ سے دہرا حساب چکانا تھا۔

"دلاری!۔۔ شیامو!" لالہ مرلی دھر کی آواز پھر سنائی دی۔

"جی مالک!" باورچی خانے سے آوازیں آئیں۔

"جاؤ، سو جاؤ!" لالہ نے انہیں حکم دیا۔

میں نے روشن دان سے برابر والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ مرلی دھر دروازہ بند کر کے اپنے کمرے کی طرف چلا اور اس کمرے کی بتی بھی بجھا دی۔ اب مرلی دھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کونے میں رکھی ہوئی تجوری کھولی۔ کھٹکے سے اس کی بیوی جاگ گئی۔

"سو جاؤ نا اب!" لالہ کی بیوی نے نیند میں ڈوبی آواز نکالی اور کروٹ لے لی۔

"ابھی سوتا ہوں۔" لالہ بولا اور تجوری میں نوٹوں کی گڈیاں رکھ کر اسے بند کرنے کے بعد اپنی مسہری پر آ کے لیٹ گیا۔

کچھ ہی دیر میں حویلی کے اندر سناٹا پھیل گیا۔ لالہ مرلی دھر کے خراٹے ضرور سنائی دے رہے تھے۔

اس وقت تک میں نے اپنی مہم کی کامیابی پر خوش ہونے کی وجہ سے کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ جذباتی اشتعال میں اب تک جو ہوا تھا، سو ہوا تھا لالہ مرلی دھر کو کیا سزا دی جائے یہ میں نہیں سوچ سکا تھا۔ اس کی نوجوان بیٹیوں کو اغوا کر لینا چاہیے میں نے سوچا، مگر پریشانی یہ تھی کہ انہیں یہاں سے کیسے اور کہاں لے جایا جائے؟ میں سوچتا رہا اور میرے ذہن میں ایک خاکہ بنتا گیا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی لالہ مرلی دھر کو سوئے آدھا گھنٹا ہو چکا تھا چھت سے میں نے حویلی کے پورے احاطے کو دیکھا تھا۔ مندر کے مقابل دوسری سمت ملازمین کے کوارٹرز تھے۔

"سنو نیچو! تم ملازمین کے کوارٹرز کے دروازوں کو باہر سے بند کر دو۔ پھر تم فوراً زینے پر آؤ، ہم وہیں تمہارا انتظار کریں گے۔"

نیچو چلا گیا تو میں نے ٹارچ کی روشنی کے ذریعے لڑکیوں کے کمرے میں چھپے ہوئے حیدر علی کو اشارہ کیا۔ وہ اشارہ ملتے ہی تیزی کے ساتھ مسہری کے نیچے سے نکل آیا۔ پھر وہ چاروں ہاتھ پیروں کے بل چلتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ اگلے ہی لمحے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں سراج الدولہ کے ساتھ زینے پر آ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد نیچو اپنا کام کر کے وہاں پہنچ گیا۔

"اب کیا کرنا ہے شاہین؟" سراج الدولہ نے سوال کیا۔

"پہلے ہم دونوں لڑکیوں کو قابو میں کریں گے۔" میں نے بتایا "ذرا ٹھہرو!" میں نے باورچی خانے کے دروازے کو آہستہ سے اندر کی طرف دھکا دیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں، میں اندر پہنچ گیا۔ سبزی کاٹنے کی چھریاں میں نے وہاں سے اٹھا لیں۔ میں گولی چلا کر سارے محلے کو ادھر متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک کونے میں مجھے لکڑیاں پھاڑنے کی کلہاڑی رکھی ہوئی مل گئی۔ وہیں فرش پر گنڈاسا بھی پڑا مل گیا۔ میں نے دونوں چیزوں کو اپنے قبضے میں کر لیا اور باورچی خانے سے نکل آیا۔

ایک چھری میں نے اپنے پاس رکھی، ایک سراج الدولہ کو دے دی۔ اس وقت تک حیدر علی بھی ہمارے پاس پہنچ چکا تھا۔ اسے میں نے گنڈاسا تھما دیا اور کلہاڑی نیچو کو دے دی۔

"یہ آپ نے اچھا کیا۔" نیچو نے سرگوشی کی "گولی چلانا

یہاں خطرناک ہوتا۔"

"میری جگہ تم ہوتے تو یقیناً تم بھی یہی سوچتے۔" میں آہستہ سے بولا "تیرے واری آدمی کو محتاط اور چوکنا رہنا چاہیے۔"

اب ہم اپنی کارروائی کے لیے تیار تھے۔

"سنو!" میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا "پہلے ہمیں لڑکیوں کو قابو میں کرنا ہے۔ بہت خاموشی اور ہوشیاری کے ساتھ کہ کوئی آواز نہ ہو۔ میں اور نیپو ایک لڑکی کو سنبھالیں گے۔ سراج الدولہ اور تم حیدر علی، دوسری لڑکی کو قابو میں کرو گے۔ پہلے چادروں سے لڑکیوں کے منہ بند کرنا ہیں تاکہ وہ چیخ نہ سکیں۔ یہ کام میں اور نیپو کریں گے تم حیدر علی اور سراج الدولہ اسی وقت ان کی ٹانگوں کو پکڑلو گے تاکہ وہ ٹانگیں نہ چلا سکیں اس کے بعد کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ چھری کی نوک پر ان سے ہر حکم منوایا جاسکے گا۔"

پھر ہم لڑکیوں کے کمرے میں پہنچ گئے جس کا دروازہ حیدر علی کھول آیا تھا۔ ہم چاروں ہی ایک ساتھ ان پر حملہ آور ہوئے تھے اور وہ لڑکیاں بے بس ہوگئی تھیں۔ پھر میں نے اور نیپو نے ان کے گلوں پر چھریاں رکھ دی تھیں۔ دہشت سے ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"تم نے کوئی بھی غلط حرکت کی اور یہ چھری۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر گردن پر چھری کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

اس کے بعد دونوں کے منہ میں کپڑا ٹھونسنا اور ان کے ہاتھ باندھنا مشکل نہ ہوا۔ ان لڑکیوں کو لے کر ہم لالہ مرلی دھر کے کمرے میں پہنچے۔ لالہ اور لالائن کو قابو میں کرنا بھی دشوار ثابت نہ ہوا۔ لالائن کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے۔ لالہ مرلی دھر کے ہاتھ تو بندھے ہوئے تھے مگر منہ میں کپڑا نہیں ٹھونسا گیا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے کہا "کیا چاہتے ہو بالکو؟"

"ہم تم سے اس بے گناہ مسلمان لڑکی کا بدلہ لینے آئے ہیں لالہ جس نے تمہاری حویلی کے کنویں میں کود کو جان دے دی تھی۔" میں نے جواب میں کہا "سنو لالہ! میں دھنساری کے خیر محمد کی بہن کا ذکر کررہا ہوں جسے تم شدھی کرکے اپنی بیوی بنانا چاہتے تھے!" میں لالہ کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا وہ گھبرا کر اپنی بیوی اور بیٹیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس موقع پر اندھیرے میں تیر چلایا "بولو لالہ! پچھلے مہینے تم نے شمبھو اور اس کے ساتھی غنڈوں سے خیر محمد کی بہن کو اغوا نہیں کرایا تھا؟"

"وہ۔۔۔ وہ کمینہ شمبھو خود ہی اسے اٹھا کر لایا تھا۔" لالہ نے کہا۔

"اور اغوا کرکے تمہیں دے گیا تھا تاکہ تم اس سے اپنی ہوس پوری کرلو! مجھے بتاؤ اس کی لاش کہاں ہے؟" یہ کہہ کر میں نے نیپو کو مخاطب کیا "اس کی تجوری خالی کردو!"

"یہ۔۔۔ یہ تم لوگ کیا کررہے ہو؟۔۔۔ تجوری تو خالی ہے۔۔۔ اور چابی بھی کہیں میں رکھ کر بھول گیا ہوں۔" لالہ گھبرا کر بولا۔

"جھوٹ نہ بول لالہ!" میں نے چھری سے اس کا کرتا پھاڑ دیا۔ خون کی بوندیں کرتے پر چھلک آئیں۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں مائی باپ!" لالہ کپکپانے لگا۔

ایک مرتبہ پھر میرا ہاتھ حرکت میں آگیا۔ اس کے کرتے کی آستین رنگین ہوگئی۔ اس کے جھوٹ بولنے پر میرا خون کھول رہا تھا "مرلی دھر! تو ذلیل بھی ہے اور جھوٹا بھی!" میں نے "نیپو! سرہانے گدے کے نیچے سے چابیاں نکال لو!" میں نے مسہری کے سرہانے کی طرف اشارہ کیا۔

مرلی دھر کا چہرہ پیلا پڑگیا۔ نیپو نے چابیاں نکال لیں اور تجوری کی طرف بڑھ گیا۔ مرلی دھر اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

"لالہ!" میں نے اس کے پیٹ پر چھری رکھ دی "بول! قاتل کی سزا کیا ہوتی ہے؟"

"ہم۔۔۔ میں نے رام قسم کسی کو قتل نہیں کیا۔" خوف سے کانپنے لگا۔

"پوری تجوری خالی کردو نیپو! اب اس دولت کو صحیح مصرف کیا جائے گا۔" میں نے نیپو کو مخاطب کیا جو نوٹوں کی گڈیوں کو کینوس کے تھیلے میں بھر رہا تھا۔ میرے کہنے پر اس نے تجوری میں رکھے ہوئے ڈبے کھول کر زیورات بھی تھیلے میں الٹنا شروع کردیے۔ میں ایک بار پھر مرلی دھر کی طرف متوجہ ہوگیا "ہاں لالہ! تو نے ابھی بتایا نہیں کہ قاتل کی سزا کیا ہوتی ہے؟"

"رام قسم میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس نے خود کنویں میں چھلانگ لگائی تھی۔" لالہ مرلی دھر خوف کے سبب بہ مشکل بول رہا تھا۔

"کیوں چھلانگ لگائی تھی اس نے کنویں میں؟ یہ بتا لالہ!" میں غصے سے چیخ اٹھا۔ میرا خون کھول رہا تھا اور جی چاہ رہا تھا کہ اس کے ٹکڑے کردوں۔ میں نے اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کے کان کی لو کھینچی اور چھری سے اسے کاٹ دیا۔

لالہ نے چیخ ماری اور خون کی بوندیں اس کے کرتے پر گرنے لگیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ نیپو نے تجوری خالی

کردی تھی۔ دونوں لڑکیوں کی حالت خراب تھی اور لالہ کی بیوی بے ہوش ہوکر فرش پر گرچکی تھی۔

"تیری وجہ سے وہ کنویں میں کودی تھی لالہ! کیوں کہ تو اس کی عزت لوٹنا چاہتا تھا۔ سن اب ہم تجھے بھی اسی کنویں میں دھکا دیں گے جو اس باعصمت لڑکی کی قبر بن گیا تھا مگر نہیں پہلے تو یہ بتا کہ اس کی لاش کہاں ہے؟" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"وہ۔۔۔ اسے شمبھو نے ٹھکانے لگایا تھا۔" مرلی دھر نے گھبرا کر بتادیا۔

"حیدر علی! اس ملعون بڈھے کا منہ بھی بند کردو!"

"تم۔۔۔ تم آخر چاہتے۔۔۔ کیا ہو؟" لالہ نے بے چین ہوکر پوچھا۔

"تجھے اسی کنویں میں دھکا دینا چاہتے ہیں!" میں نے جواب دیا۔

"نہیں!" لالہ التجا آمیز انداز میں چیخا "تم یہ پاپ نہیں کرسکتے۔۔۔ تم مسلمان ہو، یہ پاپ مت کرو!"

"اور تو نے جو کچھ کیا تھا وہ پاپ تھا یا پُن تھا؟" میں دہاڑا "حیدر علی! منہ باندھ دو اس کتے کا!"

پھر لالہ مرلی دھر مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ حیدر علی نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ اسے سزا دینے کا ایک نیا منصوبہ میرے ذہن میں آگیا تھا۔

"چل لالہ!" میں نے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔ حیدر علی اور سراج الدولہ کو میں نے وہیں لڑکیوں اور ان کی ماں کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا۔ میں اور نیپو، لالہ کو دھکے دیتے ہوئے کنویں کی طرف چل دیے۔ ایک دو مرتبہ لالہ نے رکنے کی کوشش کی تھی، مگر چھری کے چرکوں نے اس کے کس بل نکال دیے تھے "سن لالہ!" میں نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا "ہم تیری لڑکیوں کو ساتھ لے جائیں گے پھر تجھے معلوم ہوگا کہ خیر محمد کے دل پر کیا گزری ہوگی!" بارش اب بھی ہورہی تھی۔ میری بات سن کر لالہ رک گیا تھا "چلتا رہ!" میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا "رک مت!" کنویں کے قریب پہنچ کر لالہ مرلی دھر بری طرح مچلنے لگا۔

"زیادہ پریشان نہ ہو لالہ! ہم تجھے کنویں میں دھکا نہیں دیں گے، صرف کنویں میں اتاردیں گے تاکہ تو خوب اچھی طرح اس مظلوم لڑکی کی قبر کو دیکھ لے۔ چل! ڈول میں کھڑا ہوجا!" میں نے چرخے کا ڈول اس کے سامنے کردیا۔ آخرکار اسے ڈول کے اندر کھڑا ہونا ہی پڑا۔ پھر میں نے اس کے ہاتھ اوپر کردیے اور رسی کو اس کے سر سے اونچا لے جاکر اس کے ہاتھ رسی سے باندھ دیے۔ اسی حالت میں ہم نے لالہ کو کنویں میں اتار دیا۔ اس کے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور وہ ڈول میں کھڑا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی نیچے ڈالی۔ پانی لالہ مرلی دھر کے شانوں تک تھا۔ رسی کو میں نے مضبوطی کے ساتھ چرخی سے باندھ دیا پھر کنویں میں منہ ڈال کر بولا "لالہ! اب تو سوچتا رہ کہ اس لڑکی نے کنویں میں کیسے جان دی ہوگی!" پھر میں نیپو کو ساتھ لیے اندر حویلی کے اس کمرے میں آگیا جہاں سے لالہ کو لے گیا تھا۔

لالہ کی بیوی ہوش میں آچکی تھی۔ اس نے اور لڑکیوں نے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور جسم ہچکیوں سے لرز رہا تھا میں نے ان آنکھوں کا سوال پڑھ لیا تھا۔ وہ آنکھیں سوال کررہی تھیں کہ لالہ مرلی دھر کہاں ہے؟

"لالہ مرلی دھر۔۔۔ تیرا پاپی شوہر زندہ ہے لالائن!" میں نے بتایا "وہ کنویں میں لٹکا ہوا ہے۔ تجھے وہ صبح صحیح سلامت مل جائے گا۔ اس نے جو گناہ کیا ہے، یہ سزا اس کے لیے بہت معمولی ہے، مگر سن لالائن! تیری یہ دونوں جوان بیٹیاں ہمارے ساتھ جائیں گی۔"

ماں اور بیٹیوں نے زور زور سے انکار میں سر ہلائے۔ ان کے بند منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں ابھریں۔ لالائن بستر سے فرش پر گھٹنوں کے بل گری اور اپنا سر میرے پیروں میں رکھنا چاہا۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔

"لالائن! تو سوچ سکتی ہے کہ اس بے گناہ اور مظلوم لڑکی پر اور اس کے گھر والوں پر کیا گزری ہوگی جسے لالہ مرلی دھر نے، تیرے پتی نے شمبھو سے اغوا کرایا تھا!" میں نے کہا۔ منہ بندھے ہونے کے باوجود ان ماں بیٹیوں کے حلق سے رحم طلب آوازیں ابھرتی رہیں اور جسم ہچکیوں سے لرزتے رہے "سمجھ گئی لالائن! اپنے پتی کو بتادینا کہ آئندہ وہ ایسا پاپ نہ کرے، چلو لڑکیو!"

دونوں لڑکیوں اور ان کی ماں نے نفی میں سر ہلائے اور باری باری رحم طلب نظروں سے ہم چاروں کو دیکھا۔ نیپو اپنا تھیلا اٹھا چکا تھا۔

"چلو!" میں نے زور سے کہا۔

لڑکیوں نے پھر انکار میں سر ہلائے۔ ان کی ماں نے فرش پر سر مارنا شروع کردیا۔

"کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے، سمجھے! ورنہ میں گولی ماردوں گا!" ایک بھاری اور سخت آواز ابھری۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا "اے زنانو! ہاتھ اٹھاؤ!" اس شخص

نے پھر کہا اس کے ہاتھ میں بندوق تھی اور نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی "سب ہاتھ اٹھادو!"

یہ افتاد اچانک اور غیر متوقع تھی۔ میرے لیے یہ لمحات انتہائی نازک تھے۔ اگر میں اپنے وجود میں چھپی ہوئی پُراسرار قوتوں کے سبب بچ بھی جاتا تو میرے تینوں ساتھیوں کا کیا ہوتا؟ وہ کس طرح ایک یقینی موت سے بچتے؟ اس مہم کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے ان کی حفاظت کی ذمے داری مجاہد اول نے مجھ پر ڈالی تھی۔ ہم میں سے کسی کو ریوالور نکالنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

☼

اس شخص کو میں نے پہچان لیا تھا۔ وہ شمبھو تھا۔ اس کے تیور خطرناک نظر آرہے تھے جیسے اگر ہم نے اس کے کہنے پر ہاتھ نہ اٹھائے تو واقعی وہ گولی مار دے گا۔ مجھے ابھی تک اپنے وجود میں کوئی غیر معمولی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مجبوراً میں نے ہاتھ اٹھادیے اور میرے ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

"تو یہ بات تھی! تم شیر کی کچھار میں اس سے شکار چھیننے آئے تھے!" شمبھو نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ کھلی ہوئی تجوری سامنے ہی نظر آرہی تھی۔ وہ درشت آواز میں بولا۔ "بتاؤ مال کہاں ہے؟"

"اس تھیلے میں ہے۔" میں نے کینوس کے تھیلے کی طرف اشارہ کیا جو ٹیپو نے ہاتھ اٹھانے سے پہلے فرش پر رکھ دیا تھا۔

"اے لونڈیو!" شمبھو نے سختی سے کہا۔ "اپنی جگہ کھڑی رہو ورنہ۔۔۔" شمبھو نے بندوق کی نال ان کی طرف کردی۔ دونوں لڑکیاں سہم کر رک گئیں جو شاید شمبھو کی طرف مدد کے لیے بڑھ رہی تھیں۔ وہ زور زور سے سر ہلانے لگیں مگر شمبھو ان کا مطلب نہیں سمجھا۔ شمبھو لڑکیوں کی طرف سے مطمئن ہو کر پھر ہماری جانب متوجہ ہو گیا اور بولا۔ "اگر میں کچھ دیر اور نہ آتا تو بیٹا ہاتھ ہی صاف کر گئے تھے اپنے باپ کے مال پر!" یہ کہتے ہی وہ زور سے ہنسا۔ "چلو لاؤ ادھر تھیلا!"

"لیکن ۔۔ لیکن شمبھو! تجھے تو لالہ نے رقم دے دی تھی۔" میں نے کہا۔ "پھر تو یہاں کیوں آیا ہے؟" میں اسے باتوں میں لگا کر اس افتاد سے بچنے کی کوئی راہ نکالنا چاہتا تھا۔

"شمبھو مال کے لیے آیا ہے اس مال کے لیے جو تم نے سمیٹ لیا ہے۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"مگر تم تو لالہ مرلی دھر کے خاص آدمی ہو۔ تمہیں تو کل بندوقیں ملنے والی ہیں۔" میں پھر بولا۔

"میں کسی کا خاص آدمی نہیں ہوں بیٹا!" شمبھو کی آواز میں تمسخر تھا۔ "شمبھو صرف بدمعاش ہے' چور ہے! شمبھو کو بس مال چاہیے۔"

"اور ان بندوقوں کا کیا ہوگا جو کل تمہیں ملیں گی؟ اس کام کا کیا بنے گا جو لالہ نے تمہیں بتایا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

وہ زور سے ہنس پڑا' پھر بولا۔ "لالہ نے کہا تھا' یہ دھرم کی سیوا ہے' دھرم کی سیوا (دین کی خدمت) اپنا دھرم تو بس مایا ہے بیٹا! مسلمانوں کو مار کر تمہیں شدھی بنا کر مجھے مال تو نہیں مل سکتا نا!"

"تو پھر۔۔ پھر۔۔"

"زیادہ باتیں مت بناؤ!" شمبھو نے میری بات زوردار آواز میں کاٹ دی۔ "تھیلا ادھر لاؤ!" یہ کہہ کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میرے اشارے پر ٹیپو نے جھک کر تھیلا اٹھایا۔ دونوں لڑکیوں نے پھر اپنے سر کو زور زور سے ہلایا۔ ان کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ان کی ماں فرش پر بیٹھی شمبھو کو اشارے سے کچھ بتانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

"کیوں بار بار منڈیا ہلا رہی ہے!" شمبھو خفگی سے بولا۔ "میں یہاں کسی کی مدد کرنے یا فریاد سننے نہیں آیا' سمجھی کہ نہیں!" شمبھو نے ایک قدم اور پیچھے ہٹایا "ادھر لاؤ! دروازے کے باہر!" یہ کہہ کر وہ ہمیں بندوق کی زد پر لیے اور پیچھے ہٹا۔ اب وہ دروازے کے باہر تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب شمبھو نے اپنا سر دروازے سے باہر نکالا "ٹھک" کی ایک زوردار آواز ہوئی۔ شمبھو کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ تینوں ماں بیٹیاں بے تحاشا چیخی تھیں مگر ان کی چیخیں حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ ہم چاروں نے غیر شعوری طور پر اپنے ہاتھ نیچے گرا کر ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ ہمارے علم میں نہیں تھا مگر جو کچھ ہو رہا تھا وہ ہمارے منصوبے کے برعکس تھا اور ہمارے لیے خطرناک بھی!

پھر اس سے پہلے کہ ہم کوئی قدم اٹھاتے' کمرے کے باہر سے آواز آئی۔ "جو سال بھی گزرتا ہے' سروں کے مینار بنتا ہوا گزرتا ہے۔"

"اور یہی سروں کے مینار ہماری منزل کا نشان ہیں۔" کسی نامعلوم شخص کے شناختی جملے کے جواب میں میں نے بھی شناختی الفاظ ادا کیے۔ یہ دونوں ہی جملے ہماری تنظیم کے شناختی کوڈ ورڈز تھے۔ یہ کوڈ ورڈز تبدیل بھی ہوتے رہتے تھے۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ خطرہ ٹل گیا تھا۔ میرے تینوں ساتھیوں نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی۔

ہمارا نیا ساتھی اب دروازے میں آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی اور ہماری ہی طرح اس کا چہرہ بھی ایک نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے فرش پر پڑی ہوئی شمبھو کی بندوق اٹھائی' پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شاہین! ادھر آؤ۔" نووارد کے کپڑے بارش میں تر تھے اور سر سے پانی کی بوندیں گر رہی تھیں۔

میں اس کی طرف بڑھا۔ شمبھو کے جسم کو پھلانگتے ہوئے میں نے اس پر نظر ڈالی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں بولا۔ "کہیں یہ مر تو نہیں گیا؟"

"زندہ بھی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے!" آنے والے نے کہا۔ اس وقت ہم دوسرے کمرے کے وسط میں تھے۔ "سنو شاہین! باہر باغ کی سمت' پچھلی طرف دروازے کے قریب دو تانگے کھڑے ہیں' تم ان میں بیٹھ جاؤ' وہ تمہیں جہاں بھی لے جائیں' چلے جانا! جلدی کرو!"

"مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم یہاں ہیں؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"وقت ضائع نہ کرو' جلدی کرو!" ہمارے نئے ساتھی نے کہا۔ "تمہارے یہاں سے جانے کے پانچ منٹ بعد میں بھی یہاں سے نکل جاؤں گا۔ جلدی کرو!"

مزید کچھ کہے سنے بغیر میں کمرے میں واپس آگیا۔

"سراج الدولہ! لالائن کے پیر باندھ دو!" میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

اس عورت نے بڑی جدوجہد کی مگر بے سُود ہی' سراج الدولہ نے اس کے ہاتھ پیر ایک منٹ کے اندر باندھ دیے تھے۔

"ٹیپو! تھیلا اٹھاؤ' ہم چل رہے ہیں۔ ہمارا نیا ساتھی ہمارے لیے تانگے لے آیا ہے۔" میں نے کہا' ٹیپو نے تھیلا اٹھالیا۔ "حیدر علی! سراج الدولہ! لڑکیوں کو لے چلو!"

لڑکیوں اور ان کی ماں نے پھر مچلنا شروع کردیا۔ وہ یقیناً چیخ رہی ہوں گی۔ ان کے بندھے ہوئے منہ سے گھٹی گھٹی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ دونوں لڑکیاں زور زور سے انکار میں سر ہلا رہی تھیں' ان کی آنکھوں میں آنسو تھے' چہرے کی جلد تنی ہوئی تھی' آنکھوں میں التجا تھی' رحم کی بھیک تھی۔ انہیں بہرحال یہ معلوم تھا کہ ان کو اغوا کر کے لے جایا جا رہا

ہے۔ ان کے ساتھ پھر کیا سلوک ہوگا' کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ان کا تڑپنا' مچلنا اور انکار کرنا فطری امر تھا۔

"لڑکیو!" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "تم سے ہمیں کوئی دشمنی نہیں مگر تمہارے باپ نے ہماری ایک بہن کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا اور اسے کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہم تمہیں اس لیے ساتھ لے جارہے ہیں کہ تمہارے ماں باپ کو بھی معلوم ہو کہ دوسروں کے گھروں میں آگ لگانے والوں کے گھروں میں بھی آگ لگ سکتی ہے۔ ہاں میں تمہیں یہ یقین ضرور دلا سکتا ہوں کہ تم ہمارے پاس قطعی محفوظ رہو گی۔ ہم تمہارے باپ کی طرح ذلیل نہیں ہیں کہ تمہاری عزت لوٹ کر اپنا دامن گناہوں سے آلودہ کریں۔ انہیں لے چلو!" آخری الفاظ حیدر علی اور سراج الدولہ کی طرف دیکھ کر کہے۔ اس پر بھی لڑکیاں مچلیں تو میں سخت لہجے میں بولا۔ "لڑکیو! ہمیں سختی پر مجبور نہ کرو! سنو! اب اگر یہ نہ مانیں تو انہیں زبردستی۔۔" میں نے دھمکی دینے کے انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ لڑکیوں پر اس کا خاصا اثر ہوا۔ وہ سہمی ہوئی نظر آنے لگیں۔

احتیاطاً دونوں لڑکیوں کے پیر باندھ دیے گئے۔ یہ تجویز ٹیپو نے پیش کی تھی جسے میں نے قبول کرلیا تھا۔ پیر باندھنے کے بعد سراج الدولہ اور حیدر علی نے ایک ایک لڑکی کو اٹھالیا۔ اس عرصے میں ہمارا نیا ساتھی دروازے سے شمبھو کو ہٹا چکا تھا۔

"خدا حافظ ساتھی!" میں آخر میں کمرے سے نکلتے ہوئے بولا۔

"خدا حافظ!" نئے ساتھی نے کہا۔ "ہاں تم سب پیچھے ہی بیٹھنا۔" اس نے آخری ہدایت دی اور ہم کمرے سے باہر آگئے۔

بارش ابھی تک نہیں رکی تھی۔ سارا معاملہ بہ خیر و خوبی انجام پا گیا تھا۔ سب سے اطمینان بخش بات یہ تھی کہ ہمیں جلالی ہی میں جائے پناہ مل گئی تھی' ایسی جائے پناہ جو ہماری ہی تنظیم کے افراد فراہم کر رہے تھے۔

میرے ذہن میں اس وقت کئی سوالات تھے اور سب سے پہلا سوال اپنے اندر پوشیدہ پُراسرار قوتوں سے متعلق تھا۔ میری زندگی واضح طور پر خطرے میں پڑ گئی تھی مگر آج پہلی بار خودکار حفاظتی نظام حرکت میں نہیں آیا تھا۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ کیا میری مددگار قوتیں عین اس وقت حرکت میں آتیں جب آخری لمحات قریب آجاتے؟ یہ تو انتہائی خطرے کی بات تھی' زندگی داؤ پر لگانے والی بات! اپنے وجود سے قطع نظر جو اہم سوال میرے پیش نظر تھا' وہ یہ

تھا کہ ہماری تنظیم کو کس طرح یہ معلوم ہو گیا کہ ہم اس وقت لالہ مرلی دھر کی حویلی میں ہیں؟ جب کہ تنظیم کے طریقہ کار کے مطابق ہماری مہم خفیہ تھی۔ ہم چاروں افراد کے سوا کسی کو اس کا علم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کسی طرح علم ہو بھی جاتا تو اصل منصوبے کے مطابق ہمیں اس وقت جالالی میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہمیں تو اپنی مہم سر کر کے اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم لالہ مرلی دھر کی حویلی کے عقبی دروازے سے باہر آ چکے تھے وہاں ہمارے نئے ساتھی کے کہنے کے مطابق دو تانگے کھڑے تھے۔ تانگوں پر چادروں سے پردے باندھ دیے گئے تھے۔ میں اس وقت یہ سمجھ سکا کہ ہمارے نئے ساتھی نے ہمیں پیچھے بیٹھنے کی ہدایت کیوں کی تھی۔ اس طرح ہم محفوظ انداز میں جالالی کی سڑکوں سے گزر سکتے تھے۔ نیچو اور سراج الدولہ ایک لڑکی کو ساتھ لے کر پیچھے والے تانگے میں بیٹھے۔ میں اور حیدر علی دوسری لڑکی کے ساتھ آگے والے تانگے میں سوار ہوئے تھے۔ تانگے والوں نے ہم سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ہمارے سوار ہوتے ہی تانگے چل پڑے۔ تانگوں میں بیٹھنے سے قبل ہم نے دونوں لڑکیوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی تھیں۔ تانگے معمول کے مطابق رفتار سے بڑھتے رہے۔ بارش اب بھی جاری تھی اور پانی تانگے کی چھت سے ٹپک کر اندر آ رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ہمارا یہ سفر ختم ہوا۔ تانگے ایک گلی میں رکے تھے۔ میں نے لڑکی کے پیروں کی رسی کھول دی۔ میں نے چادر ہٹائی تو سامنے ہی ایک ڈیوڑھی کا کھلا ہوا دروازہ نظر آیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ اسی وقت ڈیوڑھی کی سیڑھیوں پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ ہم تینوں تانگے سے اتر کر ڈیوڑھی میں آ گئے۔ ٹارچ پھر بجھ گئی۔ دروازے کے آگے صحن تھا اور وہاں کہیں سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی۔ میں نے اس شخص کو دیکھنا چاہا جس نے ٹارچ روشن کی تھی۔

"اندر چلے جاؤ!" مجاہد اوّل کی سرد اور سخت آواز ابھری۔

مجاہد اوّل کی آواز سن کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوف کی ایک لہر بھی میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اس کی آواز سے واضح طور پر یہی ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اب سے پہلے اس سے میری جو ملاقاتیں ہوئی تھیں اس نے مجھ سے ایسے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ جس وقت ہم تینوں آگے پیچھے صحن سے گزر رہے تھے دوسرا تانگا دروازے پر آ لگا۔ ہم بارش میں بھیگتے ہوئے دائیں جانب بڑھے جہاں ایک کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس کمرے کے سوا پورے مکان میں اندھیرا اور خاموشی تھی۔

ذرا سی دیر کے بعد نیچو اور سراج الدولہ بھی آ گئے۔ نیچو کے کاندھے پر کینوس کا تھیلا تھا اور سراج الدولہ نے لڑکی کو اٹھا رکھا تھا۔ اگر اس نے بھی میری طرح لڑکی کے پیر کھول دیے ہوتے تو کم از کم اس مکان کے دروازے سے کمرے تک لڑکی کو لاد کر نہ لانا پڑتا۔ نیچو نے تھیلا ایک طرف رکھ دیا۔ سراج الدولہ نے اس عرصے میں لڑکی کو ایک مونڈھے پر بٹھا کر اس کی ٹانگیں کھول دیں۔ اس کمرے میں مختصر سا سامان تھا۔ کئی مونڈھے ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے۔ ایک سمت کونے میں میز پڑی ہوئی تھی جس پر لیمپ رکھا تھا۔ ایک کونے میں تپائی پر صراحی اور گلاس بھی موجود تھا۔ ہمارے چہرے اب بھی چھپے ہوئے تھے۔ حیدر علی نے چہرے پر بندھا ہوا رومال ہٹانا چاہا تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک لیا۔ "ابھی نہیں ذرا صبر کرو!"

پھر میں نے اور نیچو نے لڑکیوں کی آنکھوں سے پٹیاں کھول دیں۔ ان کے ہاتھ اور منہ بھی کھول دیے۔ حیرے کہنے پر نیچو نے تھیلے سے دو چادریں نکال کر انہیں دے دیں۔ ان کی ساریاں بھیگ جانے کی وجہ سے جسم سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ دوسری چادروں سے ہم سب ساتھیوں نے سر اور منہ ہاتھ خشک کیے۔ لڑکیاں چادریں اوڑھ کر ایک طرف بیٹھ گئیں۔ ان کے منہ سے دبی دبی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ سارے مکان میں سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے ہمارے سوا وہاں کوئی بھی نہ ہو۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کمرے سے نکل کر باہر کا جائزہ لوں مگر وہاں مجاہد اوّل کی موجودگی کے سبب میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ یہ لمحے میرے لیے خاصے پریشان کن تھے۔ اسلحہ ڈپو کی تباہی کے بعد میں نے جو قدم اٹھایا تھا وہ منصوبے کے مطابق نہیں تھا۔ مجاہد اوّل کی واضح ہدایت یہ تھی کہ کسی بھی صورت میں اور کسی بھی مرحلے پر ہمیں اپنے منصوبے کے خلاف قدم نہیں اٹھانا ہے۔ میری پریشانی کی وجہ یہی تھی۔ اچانک کمرے کے باہر مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کسی کے قدموں کی ہلکی چاپ سنائی دے رہی تھی مگر وہ جو کوئی بھی تھا ہمارے کمرے کی طرف نہیں بڑھ رہا تھا۔ پھر کچھ فاصلے پر چرچراہٹ سی ابھری۔ شاید یہ آواز کوئی دروازہ کھلنے کی تھی۔ سناٹے اور بارش کے مسلسل شور میں یہ آوازیں بڑی پراسرار محسوس ہو رہی تھیں۔

"تم ہمیں یہاں کیوں لائے ہو؟" ایک لڑکی نے سوال کیا جو بڑی بہن معلوم ہوتی تھی۔ "تم کون ہو؟"

"میرا نام شاہین ہے۔" میں نے بتایا "یہاں تمہیں لانے کی وجہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔"

"ہمارے ساتھ تم کیا سلوک کرو گے؟" اس لڑکی نے پھر دریافت کیا۔

"وہی سلوک کریں گے جو کسی مہمان سے کیا جاتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "یقین کرو کہ ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک ہرگز نہیں کریں گے جو تمہارے ہوس کار باپ نے اس معصوم لڑکی سے کیا تھا۔"

"وہ لڑکی کون تھی؟" اس نے پوچھا۔

"ایک مسلمان لڑکی تھی وہ!۔ کیا تمہیں نہیں معلوم؟ اس نے تمہاری ہی حویلی کے کنویں میں تو کود کر خودکشی کی تھی۔ تمہیں اور تمہاری ماں کو اس پر ذرا بھی رحم نہیں آیا؟"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں!۔ باپو ایسا پاپ ہرگز نہیں کر سکتے! تم جھوٹ بول رہے ہو؟"

"تم اپنے گھر واپس جاؤ تو اپنے باپو سے پوچھ لینا۔ اس کا جواب تمہیں وہی دے سکتا ہے۔" میں نے نفرت سے کہا۔

"تو کیا۔ کیا تم ہمیں چھوڑ دو گے؟۔ ہمیں ہمارے گھر جانے دو گے؟" اس کی آواز میں اشتیاق تھا۔

"ابھی تک یہی ارادہ ہے ورنہ ہم بھی زبردستی تمہیں مسلمان بنا کر کسی بوڑھے کے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ دے سکتے تھے مگر ہمارے مذہب میں زبردستی کسی کو اس کے مذہب سے اپنے مذہب میں داخل کرنا گناہ ہے۔ میں اور میرے ساتھی لالہ مرلی دھر نہیں کہ تم اپنی عزت بچانے کے لیے خودکشی پر مجبور ہو جاؤ۔"

"تم۔" اس لڑکی نے کچھ کہنا چاہا۔ اسی وقت برآمدے میں تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی اور لڑکی چپ ہو گئی۔ ایک نوجوان جس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا کمرے میں آ گیا۔ ہم سب کی توجہ اس کی طرف ہو گئی۔

"شاہین!" اس نے دروازے کے قریب ہی رکتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "میرے ساتھ آیئے!" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

میں فوراً ہی کمرے سے باہر آ گیا۔ میں مجاہد اوّل سے جلد از جلد ملنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اسی نے بلوایا ہو گا۔ میں جس وقت کمرے سے نکلا وہ شخص اسی قطار میں بنے ہوئے آخری کمرے کے دروازے تک جا پہنچا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور اپنے پیچھے مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے مجھے آتا دیکھا تو آخری کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس کمرے میں پہنچ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے سوچا تھا کہ وہاں مجاہد اوّل ہو گا مگر وہاں اس اجنبی کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ کمرے میں فرش پر چار بستر لگے ہوئے تھے۔

"ساتھی! مجھے افسوس ہے کہ اس وقت اس کے سوا کچھ اور انتظام نہیں ہو سکا۔" نوجوان شخص نے مجھ سے کہا۔ "اس بکس میں چار جوڑے کپڑے موجود ہیں۔ آپ لوگ کپڑے بدل لیں۔ آپ لوگ خاصے بھیگ چکے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔

"مجاہد اوّل کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کپڑے تو بدل لیں۔" وہ بولا۔ "ان سے بھی آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔"

"میں ان سے فوراً ملنا چاہتا ہوں ساتھی!" میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے تیتومیر کہہ سکتے ہیں۔" اس نوجوان نے اپنا نام بتایا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بھی فرضی نام تھا۔

"ساتھی تیتومیر! مجھے مجاہد اوّل سے فوراً ملوا دو۔ میں انہیں اہم اور ضروری باتیں بتانا چاہتا ہوں۔" میں نے اصرار کیا۔

"میں نے آپ سے عرض کیا نا کہ جلدی مجاہد اوّل سے آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔" تیتومیر کا ٹھنڈا مزاج مجھے مشتعل کر رہا تھا۔ "مجاہد اوّل خود بھی آپ سے جلد از جلد ملنے کے مشتاق ہیں۔ آپ لباس تو تبدیل کر لیجیے!"

"پہلے ان دونوں لڑکیوں کے لیے لباس کا بندوبست کر دیں۔ وہ بھی بھیگی ہوئی ہیں۔" میں بولا۔

"اس کا بندوبست ہو رہا ہے۔" تیتومیر نے بتایا۔ "اگر ہمیں علم ہوتا کہ آپ اپنے ساتھ لڑکیوں کو بھی لے کر آ رہے ہیں تو ان کے لباس بھی تیار رکھتے اور بستر بھی! صرف چند منٹ میں ان لڑکیوں کے لیے لباس کا انتظام ہو جائے گا۔"

"اس ساتھی کا نام کیا ہے جس نے لالہ مرلی دھر کی حویلی میں ہماری مدد کی تھی؟" میں نے تیتومیر سے دریافت کیا۔

"معاف کیجیے گا مجھے اس کا علم نہیں۔ مجھے صرف آپ لوگوں کی میزبانی سونپی گئی ہے۔ کون ساتھی کیا کر رہا ہے مجھے خبر نہیں۔" تیتومیر نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"مجھے تم یہ بتاؤ کہ مجاہد اوّل کہاں ہیں؟" میں جھلا گیا۔ "تم نہیں بتاؤ گے تو میں انہیں خود تلاش کر لوں گا۔"

"فضول باتوں میں اپنی توانائیاں ضائع نہ کریں۔" تیتومیر نے پرسکون آواز میں مجھے مشورہ دیا۔

میں اب اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اس سے کچھ معلوم کرنا ناممکن ہے۔ کچھ سوچ کر میں بولا۔ "ٹھیک ہے میں کپڑے بدل لیتا ہوں۔"

"اسی وقت چھت پر تین بار دھماکے ہوئے۔ تیتو میر نے مجھ سے کہا۔ "آپ لباس تبدیل کریں۔ شاید لڑکیوں کے لباس اور بستر آگئے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ میں نے اسے صحن عبور کر کے ڈیوڑھی کی طرف جاتے دیکھا۔

میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ یہ غالباً دو منزلہ مکان تھا اور اوپری منزل پر جانے والا زینہ شاید ڈیوڑھی ہی میں ہوگا۔ میں جلدی جلدی لباس تبدیل کرتے ہوئے سوچ رہا تھا اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ مجاہد اوّل اس وقت اوپری منزل ہی پر ہوگا۔ میں لباس تبدیل کر چکا تھا کہ تیتو میر کمرے میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا اور سر پر ایک موٹا سا ہولڈال تھا جس میں یقیناً بستر تھے۔

"لیجیے لڑکیوں کا بندوبست بھی ہوگیا۔" تیتو میر نے خوش دلی سے کہا۔ "آپ خواہ مخواہ ان کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔" اسی دوران میں اس نے ہولڈال اور تھیلا فرش پر رکھ دیا تھا۔ "کیا آپ ان لڑکیوں کا لباس بھی دیکھنا چاہتے ہیں؟" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"تیتو میر! تم بہت دلچسپ آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "پہلے میں یہ سمجھا تھا کہ تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ میرے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر کے صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"لڑکیوں کے سونے کا انتظام کہاں ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ اور آپ کے ساتھی اسی کمرے میں آرام کریں گے۔" تیتو میر نے میرے سوال کی نوعیت سے پورا فائدہ اٹھایا۔

"یار! میں لڑکیوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" میں بولا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ انہیں اپنے ساتھ نہیں سلائیں گے۔" اس کے جواب میں پھر شرارت شامل ہو گئی تھی۔

"یار! تم مجاہد ہو کہ توتا کہانی!" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ مارا۔

"جناب! آپ ہمارے مہمان ہیں بلکہ مہمان عزیز! اس لیے آپ جو کہیں سر آنکھوں پر! بہرحال ان کے سونے سلانے کا انتظام ہمارا مسئلہ ہے۔ وہ آپ ایسے مہمانوں کی مہمان ہیں۔ ان کی خدمت کرنا تو ہمارا فرض ہے۔" تیتو میر خوشگوار لہجے میں بولا۔

"شکریہ ساتھی تیتو میر!" میں نے کہا۔ "میری پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے آرام اور دیکھ بھال کی ذمے داری مجھ پر ہے۔ تنظیم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"اور آپ کی وجہ سے وہ ہماری ذمے داری بن گئی ہیں۔" تیتو میر کے لہجے میں شوخی تھی۔ "ویسے آپ کی تسلی اور اطمینان کے لیے میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ برابر والے کمرے ہی میں ان کے سونے کا انتظام کیا گیا ہے۔ آیئے دیکھ لیجیے!" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

برابر والا کمرا تقریباً اتنا ہی بڑا تھا البتہ اس میں ایک بڑی سی مسہری موجود تھی۔ مسہری پر کوئی گدا یا چادر نہیں تھی۔ میں نے موم بتی کی روشنی میں اس کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ موم بتی وہی تھی جسے تیتو میر نے روشن کر دیا تھا۔ "ٹھیک ہے۔" میں نے اطمینان سے سر ہلا دیا۔

"جی ہاں! مسہری خاصی بڑی ہے۔ اس پر تین افراد بھی بہ آسانی سو سکتے ہیں۔" تیتو میر نے پھر خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔

میرے ساتھی لباس تبدیل کر چکے تھے۔ لڑکیوں کو برابر والے کمرے میں سونے کے لیے بھیج دیا گیا تھا مگر مصیبت یہ کھڑی ہو گئی کہ وہ دونوں ہی اپنے بھیگے ہوئے لباس تبدیل کرنے پر راضی نہیں تھیں۔ سب ہی ساتھی انہیں باری باری سمجھا چکے تھے کہ بھیگے کپڑوں میں سونے سے ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ مسلسل بارش کی وجہ سے خنکی میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ دونوں ہی بڑی نازک جسموں کی مالک تھیں۔ میں نے انہیں ایک مرتبہ پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہم کہہ چکے ہیں کہ کپڑے نہیں بدلیں گے۔" بڑی بہن بولی۔ "سمجھے تم!"

"آخر کیوں؟ کوئی وجہ تو ہو اس کی!" میں نے پوچھا۔

"بس مرضی ہماری!" وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔

"ٹھیک ہے" تیتو میر نے مجھے آنکھ ماری۔ "شاہین! پھر تو مجبوراً خود ہمیں ہی ان کے لباس تبدیل کرنا پڑیں گے۔" یہ کہتے ہی اس نے بڑی بہن کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ۔۔۔ تم یہ کیا کر رہے ہو؟" بڑی بہن گھبرا کر بولی۔ اس کی آواز میں حیرت بھی تھی اور خوف بھی!

"میری بچی! میرے دوست کو تم دونوں کی اور خاص طور پر تمہاری بہت فکر ہے۔ ہم اسے پریشان نہیں دیکھ سکتے۔"

تیتو میر نے لڑکی سے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شاہین! تم اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لو!"

"تت۔۔۔ نہیں! ۔۔۔ تم۔۔۔ تم ایسا نہیں کر سکتے!" اس کے چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہونے لگی۔ "تم ہمیں لباس تبدیل کرنے پر کیوں مجبور کر رہے ہو؟"

"حیرت ہے کہ تم اتنی سی بات اب تک نہیں سمجھ سکیں!" تیتو میر بولا۔ "ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ تم اپنے والدین کے پاس ٹھیک ٹھاک حالت میں جاؤ۔ اگر تم نے لباس تبدیل نہ کیا تو بیمار پڑ جاؤ گی۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "یار! تم سنتے کیوں نہیں! پکڑو اس کا دوسرا ہاتھ!"

میں بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا تو اس نے ٹیپو اور حیدر علی کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے انہیں آگے بڑھنے کے لیے کہا۔ ان دونوں میں سے حیدر علی نے بڑھ کر بڑی بہن کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ لڑکی نے بہت زور لگایا، کسمسائی۔ "نہیں! ۔۔۔ نہیں ۔۔۔!" وہ چیخی۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے!" اس کی دوسری بہن سہم کر کونے میں جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں اور چہرے پر خوف تھا۔

"ایسا ضرور ہوگا لڑکی!" تیتو میر نے کہا۔ "تم نے خود ہی ہمیں اس پر مجبور کر دیا ہے۔ یقین کرو کہ ہم اپنی آنکھیں بند کر لیں گے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شاہین! تم اور ٹیپو دوسری کو پکڑ کر آنکھیں بند کر لو۔ ہم اس کے کپڑے تبدیل کراتے ہیں۔"

ہم دونوں دوسری لڑکی کی طرف بڑھنے لگے تو بڑی لڑکی نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔ "تم۔۔۔ کیا واقعی ہمارے کپڑے۔۔۔" شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے!

"جی ہاں! میں تمہارے کپڑے تبدیل کروں گا۔ ہم سب کی آنکھیں بند رہیں گی۔" یہ کہہ کر تیتو میر نے لڑکی کے شانے سے ساڑی کا پلو کھینچ لیا۔

"نہیں نہیں! ۔۔۔ ایسا مت کرو!" لڑکی نے روہانسا ہو کر کہا۔

"تو پھر تم خود لباس تبدیل کر لو!" تیتو میر پُرسکون آواز میں بولا۔

"ٹھیک۔۔۔ ٹھیک ہے۔" لڑکی جلدی سے کہنے لگی۔ "ہم بدل۔۔۔ بدل لیں گے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ "تم ہمارے دھرم کے دشمن ہو۔ تم۔۔۔ تم ہمارے جسموں کو نجس کرنا چاہتے ہو۔ یہ۔۔۔ یہ کپڑے پہننے سے ہمارے جسم نجس ہو جائیں گے۔"

"تو بعد میں گنگا جل سے اشنان کر لینا۔" تیتو میر نے مسکرا کر کہا۔

یوں ان دونوں بہنوں نے بہ مشکل لباس تبدیل کیے تھے۔ پھر تیتو میر ہمارے لیے گرم گرم چائے لے آیا تھا، ساتھ ہی دوا کی گولیاں بھی تھیں جن کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ ان سے جسم کا درد اور تھکن دور ہو جائے گی اور بخار آنے کا خطرہ بھی نہیں رہے گا۔

لڑکیوں کو ان کے کمرے میں چائے دے دی گئی تھی اور باہر سے ان کا کمرا بند کر دیا گیا تھا۔ ہم سب اپنے بستروں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"ساتھی تیتو میر!" میں نے کہا۔ "اب تو مجاہد اوّل سے ملنے میں کوئی رکاوٹ نہیں، میں ان سے فوراً ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

"چائے پینے کے نصف گھنٹے کے بعد آپ ان سے مل سکیں گے۔" تیتو میر بولا پھر گھڑی دیکھ کر کہنے لگا۔ "پانچ بجنے والے ہیں، ساری رات ہی گزر گئی۔"

واقعی تمام رات گزر گئی تھی۔ ہم فرش پر بچھے ہوئے اپنے بستروں پر چائے پی کر دراز ہو گئے تھے۔ تیتو میر چائے کی پیالیاں سمیٹ کر جا چکا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں مجاہد اوّل کو بتانے جا رہا ہوں "آپ نے چائے پی لی ہے اور ملاقات کے لیے تیار ہیں۔ کیا خبر مجاہد اوّل آدھے گھنٹے سے پہلے آپ کو بلا لیں!" تیتو میر بڑا زندہ دل اور خوش مزاج تھا۔ اس کی گفتگو نے ہمارے ذہنوں پر چھائے ہوئے تناؤ کو ختم کر دیا تھا۔ مجاہد اوّل نے واقعی ایک مناسب شخص کو میزبانی پر مقرر کیا تھا۔ میں جاگتے رہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میری آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ نیند کا غلبہ شدید تھا۔ تیتو میر ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ میں نے سوچا کہ سو جاتا ہوں "اگر مجھے مجاہد اوّل نے بلوایا تو تیتو میر خود جگائے گا" اس خیال کے ساتھ ہی میرے ذہن پر نیند کا غلبہ ہو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے تینوں ساتھی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ میں کھڑا ہو گیا اور پھر کمرے سے باہر آ گیا۔ برابر کے کمرے کے دروازے کی کنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ یہی وہ کمرا تھا جس میں لڑکیاں تھیں۔ دن کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی مگر بادل اب بھی آسمان کو گھیرے ہوئے تھے۔ میں برآمدے میں دوسرے سرے تک چلا گیا۔ برابر برابر تین کمرے اور تھے مگر سب بند پڑے تھے اور دروازوں پر تالے نظر آ رہے تھے۔ دوسرے کمرے کے ساتھ ہی باورچی خانہ

تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ رکھے گملوں میں پھول مہک رہے تھے۔ میں نے پہلو میں بھی دو کمرے بنے دیکھے۔ ان کی درمیان چھوٹا سا برآمدہ تھا۔

میں ابھی وہاں کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ تیتو میر ڈیوڑھی کی طرف سے صحن عبور کرکے قریب پہنچ گیا۔ "اٹھ گئے آپ!" وہ بولا۔

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "مجاہد اوّل کہاں ہیں؟"

"منہ ہاتھ دھو لیں۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ آپ سے ملیں گے۔" اس نے جواب دیا۔

"رات کو تم نے ہمیں چائے کے ساتھ خواب آور گولیاں دی تھیں نا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"مجاہد اوّل کا کہنا تھا کہ آپ لوگوں کو آرام کی ضرورت ہے۔" تیتو میر نے کہا پھر بولا۔ "لڑکیاں اٹھ گئیں؟"

"معلوم نہیں۔ کیا انہیں بھی خواب آور..."

"جی ہاں! ہم میں سے کوئی بھی بغیر نقاب کے ان کے سامنے نہیں جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے رومال سے اپنا چہرہ چھپا لیا، صرف آنکھیں کھلی رہنے دیں۔

ناشتا کرنے کے بعد ہم چاروں تیتو میر کے ساتھ مکان کی اوپری منزل پر گئے۔ اوپر کا حصہ بھی نیچے کی طرح سنسان تھا۔ شاید وہاں سفیدی اور مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ ایک طرف لمبی سی سیڑھی پڑی ہوئی تھی، ساتھ ہی بڑا سا ٹب رکھا تھا جس میں سفیدی کے لیے چونا گھلا ہوا تھا۔ طاق میں سفیدی کی کوچیاں کرنیاں اور تھالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سیدھے ہاتھ کی طرف گلی کی دوسری جانب ایک مسجد تھی جس کے صحن میں نیم کا ایک گھنا پیڑ تھا۔ اس درخت نے گلی پر سایہ کر رکھا تھا۔

اوپری منزل ہی کی ایک اندھیری کوٹھری میں مجاہد اوّل سے ہماری ملاقات ہوئی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر نقاب تھی۔ ایک چھوٹے سے موکھلے کی وجہ سے کمرے میں تھوڑی سی روشنی آرہی تھی۔ پہلے تو اندھیرے کی وجہ سے ہمیں کچھ نظر نہ آیا مگر کچھ ہی دیر میں آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوگئیں۔

ہم جیسے ہی کوٹھری میں داخل ہوئے مجاہد اوّل نے تیتو میر سے کہا۔ "اپنے ساتھیوں کو بٹھاؤ!" تیتو میر نے ٹارچ کی روشنی میں ہمیں وہ چاروں مونڈھے دکھائے جو کچھ ہی فاصلے پر دکھائی دے رہے تھے۔

"اب تم جاسکتے ہو تیتو میر!" مجاہد اوّل کی بھاری سخت اور کھردری آواز ابھری جس سے ہماری سماعتیں آشنا تھیں۔ "دونوں لڑکیوں کی نگرانی ضروری ہے۔ انہیں اس گھر کا نقشہ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔" مجاہد اوّل تیتو میر کو ہدایات دے رہا تھا۔ "دن میں اگر انہیں کمرے سے باہر لاؤ تو ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہونی چاہئیں ویسے تمہیں زیادہ دیر ان کی نگرانی نہیں کرنا پڑے گی، چاند بی بی آئی ہی ہوگی۔"
مجاہد اوّل کی ہدایات سننے کے بعد تیتو میر وہاں سے چلا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ اب اس اندھیری کوٹھری میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

"شاہین! تم نے وہ عمارت تباہ کردی؟" مجاہد اوّل نے مجھے مخاطب کیا۔ وہاں دوسرے ساتھیوں کی موجودگی کے سبب اس نے میرا فرضی نام ہی لیا تھا۔

"جی ہاں" میں نے جواب دیا۔ "ہماری مہم کسی خطرے سے دوچار ہوئے بغیر کامیاب رہی۔"

"میں نے بھی دیکھا تھا" مجاہد اوّل کی آواز ابھری۔ "مگر تم لوگ یہاں کیوں ہو؟ اس اسلحہ ڈپو کی تباہی کے بعد تمہیں جلالی میں نہیں ہونا چاہیے تھا!" مجاہد اوّل کا لہجہ کرخت تھا۔

"جناب! اس کے ذمے دار میرے ساتھی نہیں، میں ہوں۔" میں نے مجاہد اوّل کے رویے میں سختی دیکھ کر سارا الزام اپنے سر لے لیا۔

"مگر پھر بھی اس کی ذمے داری ہے! اس لیے کہ تم سب ایک دوسرے کے محافظ ہو۔ ایک سے کوئی کوتاہی ہو تو دوسرے کو اسے ٹوکنا چاہیے! مجھے بتاؤ کہ تم لوگ یہاں جلالی میں کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہدایات دی گئی تھیں؟ تمہیں یاد ہیں وہ ہدایات؟" مجاہد اوّل بولا۔

"جی ہاں۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جواب دیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ علی گڑھ سے آتے ہوئے دشواری ہوئی۔" پھر میں نے خیر محمد سے ملاقات کا واقعہ سنا دیا۔

"اس میں کوئی کلام نہیں کہ تمہارے ارادے نیک تھے مگر تمہیں یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔" مجاہد اوّل نے کہا۔ "تم اس قوم کے سپاہی ہو، سمجھے اور سپاہی کا کام صرف تعمیل حکم کرنا ہے۔ یہ تمہاری پہلی غلطی تھی اس لیے تمہیں معاف کیا جارہا ہے لیکن یاد رکھو آئندہ تمہیں صرف ہدایات پر عمل کرنا ہوگا! اگر کسی بھی سبب اور کسی بھی مرحلے پر ان ہدایات کے خلاف کوئی قدم تمہیں اٹھاؤ گے جو تمہیں دی

جائیں گی نہ کم نہ زیادہ!" مجاہد اوّل کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"بہت بہتر ہے جناب!" یہ کہتے ہوئے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ نیلو نے اس موقع پر میرا ہاتھ دبا کر اپنے اطمینان کا یقین دلایا تھا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم رات کو مجھ سے ملنے کے لیے بہت مضطرب تھے۔ کیا بات تھی؟" مجاہد اوّل نے سوال کیا۔ "تم مجھے کیا بتانا چاہتے تھے؟" پھر میں نے وہ ساری باتیں بتائیں جو رات کو لالہ مرلی دھر کی حویلی میں چھپ کر سنی تھیں۔ میں نے ایک ایک بات یاد کرکے بتائی تھی تاکہ کوئی ابہام نہ رہ جائے۔

"کیا وہاں مہیش نہیں تھا؟" مجاہد اوّل نے پوچھا۔

"اس وقت تو اس نام کا کوئی شخص میرے علم و اطلاع کے مطابق وہاں نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے وہاں موجود ہو اور آکر چلا گیا ہو۔" میں نے جواب دیا پھر پوچھا۔ "اے مجاہد اوّل! یہ مہیش کون ہے؟"

"جلالی کا ایک متعصب ہندو بنیا ہے۔ بہت مال دار۔" مجاہد اوّل نے بتایا۔ "ہاں اب مجھے وہاں پیش آنے والے دوسرے واقعات سے آگاہ کرو۔"

میں نے لالہ مرلی دھر کی حویلی میں پیش آنے والے تمام واقعات بیان کردیے۔ میں نے آخر میں کہا۔ "اس تھیلے میں لالہ مرلی دھر کی تجوری سے ملنے والی تمام رقوم اور زیورات موجود ہیں۔ یہ تنظیم کے لیے ہیں۔ وہ رقم جو ہندوؤں نے مسلمانوں کے قتل عام کی خاطر جمع کی تھی اب انہی کے خلاف استعمال ہوگی۔"

"شاید۔" مجاہد اوّل نے کہا۔ "تو تم مجھے یہی سب کچھ بتانے کے لیے بے چین تھے!"

"جی ہاں۔" میں بولا۔

"ہندوؤں کی اس سازش کی اطلاع مجھے بھی مل گئی تھی۔ میں اسی لیے یہاں آیا تھا۔" مجاہد اوّل کہنے لگا۔ "بہرحال تمہاری اس باغیانہ مہم جوئی کی وجہ سے ہمیں ان کے [illegible] منصوبے کا پتا چل گیا ہے۔ ہمیں سوچنا ہوگا کہ اس کے تدارک کی خاطر کیا کرنا چاہیے! مگر میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں! اگر تم سے آئندہ ایسی کوتاہی ہوئی تو تمہیں اس کی سخت سزا بھگتنا پڑے گی۔" مجاہد اوّل نے ایک بار پھر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ "کل رات اگر تمہارا ساتھی بروقت نہ پہنچتا تو سوچو کیا ہوتا؟"

میں اور میرے ساتھی کیا کہتے! ظاہر ہے کہ ہمارے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"پھر یہ بتاؤ کہ لالہ مرلی دھر کی حویلی سے نکل کر اس کی لڑکیوں کو لے کر تم کہاں جاتے؟"

مجاہد اوّل کے اس سوال کا جواب بھی ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ یہ مسئلہ تو رات کو ہمارے ساتھی کے وہاں پہنچنے سے قبل تک میرے لیے پریشانی کا سبب رہا تھا۔

"یقیناً جذبات کی رو میں بہہ کر تم نے اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ تم نے جو کچھ کیا تھا جذبات سے مغلوب ہو کر کیا تھا۔ یہ تمہاری بہت بڑی غلطی تھی شاہین! بہت بڑی بھول تھی!" یہ کہہ کر مجاہد اوّل چند لمحے خاموش رہ کر پھر بولا۔ "تم یہ معلوم کرنے کے لیے بے قرار ہوگے کہ ہمارا ایک سرفروش عین وقت پر تمہاری مدد کے لیے تانگہ لے کر کیسے پہنچ گیا؟ تو سنو! تم نے جس وقت اسلحہ کا ڈپو تباہ کیا تھا میں تم سے تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھا۔ یہ ضروری تھا شاہین! اس لیے کہ یہ تمہاری پہلی مہم تھی اور ہماری طرف سے سیوناڑ کی پہلی کارروائی! میں اس مہم کو ہر قیمت پر کامیاب دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر اس کے بعد تمہارا تعاقب کرنا مشکل نہ تھا۔ تمہاری مدد کرنا میری ذمے داری اور فرض تھا۔"

"ہم آپ کے شکر گزار ہیں جناب!" میں نے کہا۔

"احمقانہ باتوں سے گریز کرو!" مجاہد اوّل بولا۔ "ہم میں سے کوئی بھی کسی پر احسان نہیں کر رہا۔ کوئی بھی کسی کا شکر گزار نہیں ہے سمجھے! ہم میں سے ہر شخص اپنا اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ ہم سب ایک جسم کی طرح ہیں اور تم سب میرے دست و بازو ہو!" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، پھر وہ خود ہی کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "میں بہرحال تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس مہم کی کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں۔"

"بقیہ تین اضلاع سے کوئی خبر ملی؟" میں نے دریافت کیا۔

"ابھی تو نہیں لیکن امید ہے کہ شام تک ہر جگہ سے اطلاعات مل جائیں گی۔ توقع یہی ہے کہ ہر جگہ ہمیں کامیابی ہوگی۔" مجاہد اوّل نے میرے سوال کا جواب دیا۔

"لالہ مرلی دھر کی حویلی سے کوئی اطلاع آئی؟"

"اس نے پولیس میں رپورٹ کردی ہے۔" مجاہد اوّل نے بتایا۔ "مزید کچھ علم نہیں ہوسکا۔ شام تک شاید اس سلسلے میں بھی کوئی نئی خبر مل جائے۔"

"ہمارے لیے اب کیا حکم ہے؟" میں نے پوچھا۔ "ہم کب یہاں سے جائیں گے؟"

"ابھی تم سب انتظار کرو!" مجاہد اوّل نے کہا۔ "جلدی یہاں سے تمہارے محفوظ سفر کا بندوبست کردیا جائے گا۔"

خوب سوچ سمجھ کر ایک بات کا جواب دو!" مجاہد اول کی بھاری آواز کوٹھری میں گونجی۔ "لالہ مرلی دھر کی حویلی میں تم نے کسی موقع پر کوئی ایسی بات تو نہیں کی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ تم ان کے منصوبے سے واقف ہو گئے ہو؟"

"جی نہیں" میں بڑے وثوق سے بولا۔ "لالہ مرلی دھر سے گفتگو کے موقع پر میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا اور کوشش یہی کی تھی کہ وہ ہمارا مقصد محض یہ سمجھے کہ ہم اس سے خیر محمد کی بہن ہی کا بدلہ لینے آئے ہیں۔"

مجاہد اول سے ملاقات کر کے ہم سب نیچے آ گئے تھے۔ لڑکیوں کے کمرے کے باہر دروازے پر اب بھی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ تیتو میر ہمارے کمرے میں ایک بستر پر دراز تھا۔ ہمیں آتا دیکھ کر ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس کے پوچھنے پر نیچو اسے رات کی مہم کی تفصیلات بتانے لگا۔ نیچو مزے لے لے کر یہ داستان بیان کر رہا تھا اور تیتو میر اتنی توجہ سے سب کچھ سن رہا تھا جیسے یہ مہم خود اسی نے سر کی ہو۔ نیچو ابھی خیر محمد سے ملاقات کا ذکر کر رہا تھا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چل دیے؟" تیتو میر نے سوال کیا۔

"میں ذرا لڑکیوں سے مل لوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھہرو!" تیتو میر بولا۔ "میں ابھی آیا۔" اس نے نیچو سے کہا۔ "شاہین کے کمرے میں جانے کے بعد میں کنڈی لگا کر آتا ہوں۔"

میرے اس استفسار پر کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ تیتو میر نے کہا کہ میں محض احتیاط کے پیش نظر ایسا کر رہا ہوں کیوں کہ مجاہد اول کا حکم ہے لڑکیوں کو گھر کا نقشہ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایک ہی لڑکی ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی' وہاں دو دو ہیں!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ شوخ ہو گیا۔

میں لڑکیوں کے کمرے میں پہنچا تو انہوں نے مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیے۔ میں مونڈھے پر جا کر بیٹھ گیا اور پھر کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "کیا تم دونوں مجھ سے خفا ہو؟" وہ چپ رہیں' ظاہر ہے کہ ناراض ہی تھیں۔ میں نے مزید کہا "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تم دونوں یہاں قطعی محفوظ ہو۔ یہاں کوئی تمہاری عزت و آبرو لوٹنے والا نہیں ہے۔ ہم تمہیں جلد ہی واپس بھیج دیں گے۔ تمہیں ڈرنے یا پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہمیں تمہاری باتوں پر یقین نہیں ہے' سمجھے!" بڑی لڑکی نے کہا۔ وہ بڑی بھولی سی حسین صورت کی مالک تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ بڑی بڑی ہرنی

ایسی آنکھوں پر گھنی پلکوں کے لمبے لمبے سائے' ستواں ناک' پتلے پتلے سرخ اور رسیلے ہونٹ' کتابی چہرہ' دائیں رخسار پر بڑا سا سیاہ تل' لمبے سیاہ بالوں کی گھٹا کمر سے نیچے تک پھیلی ہوئی' ساری میں کسا ہوا گداز جسم' وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ کلونت کور سے حالانکہ وہ کوئی مماثلت نہیں رکھتی تھی مگر جانے کیوں اس موقع پر مجھے وہ ظالم یاد آ گئی تھی۔ سانپ کی طرح خوب صورت' کسی ہرنی کی طرح چوکنا' زخمی شیرنی کی طرح حملہ کرنے کے لیے بے چین نظر آتی تھی۔

"تمہیں اب تک تو ہماری نیکی اور شرافت پر یقین آ جانا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر تم پر ہماری نیت خراب ہوتی تو اب تک تمہاری آبرو برقرار نہ ہوتی۔"

"ہمارا خیال ہے کہ شاید ہم صرف اس وقت تک محفوظ ہیں جب تک تم سب یہاں موجود ہو۔" بڑی لڑکی بول رہی تھی۔ "تم سب شاید ایک دوسرے کے سامنے زیادتی سے گریز کر رہے ہو۔ اگر تم میں سے کوئی ایک یہاں اکیلا رہ جائے تو۔۔ تو پھر شاید اس کی نیت بدلتے دیر نہیں لگے گی۔"

"جب ایک مسلمان لڑکی بھرے گھر میں مرلی دھر کی دست درازیوں سے بچنے کے لیے کنویں میں چھلانگ لگا دیتی ہے اور جب مرلی دھر کو کسی کا خیال نہیں آیا تو ہم اگر اندر سے تمہارے باپ ہی کی طرح من کے کالے ہیں تو ہمیں ایسی کیا مجبوری ہو سکتی ہے کہ تمہیں۔۔"

"یہ جھوٹ ہے۔۔ بالکل جھوٹ ہے۔" وہ بولی۔

"تمہارے جھوٹ بولنے یا انکار کرنے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔ تم دونوں بہنوں اور تمہاری ماں کو اس معصوم لڑکی پر ذرا رحم نہیں آیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ لڑکی مسلمان تھی۔ تم۔۔ تم شاید مسلمان لڑکیوں کی عزت نہیں سمجھتیں۔" میری آواز تیز ہوتی گئی۔ "تمہارے ظالم باپ نے ایک مسلمان لڑکی کو اغوا کرایا۔ اسے اپنے گھر میں رکھا کہ زبردستی ہندو بنا لے اور اس طرح اس کی عزت داغدار کر دے!"

"یہ غلط ہے۔" اس مرتبہ چھوٹی لڑکی بولی۔ "ہمارے سامنے ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔"

"اگر یہ غلط ہے تو تم دونوں ہی کے سامنے تمہارے باپ نے یہ بات کیوں تسلیم کی تھی کہ شمبھو نے اس مسلمان لڑکی کو اغوا کیا تھا؟ اس نے کیوں مان لیا تھا کہ لڑکی نے کنویں میں کود کر خود کشی کی تھی؟" میں نے کہا۔ "بولو! کیا یہ سب بھی جھوٹ ہیں؟" سنو! وہ لڑکی تمہاری عمر کی تھی۔ وہ تمہارے باپ کی بیٹیوں کی عمر کی تھی! تمہارے باپ کو اتنی بھی شرم نہیں آئی کہ وہ جس لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا ہے' وہ عمر میں اس کی بیٹیوں کی برابر ہے۔ دو جوان بیٹیوں کے باپ کو کم از کم اتنی شرم تو کرنا چاہیے تھی!"

ان دونوں کی موجودگی میں ان کے باپ نے لڑکی کے فرار اور خود کشی کو تسلیم کیا تھا' یہ ایک ایسی مضبوط دلیل تھی کہ ان لڑکیوں کو ہار ماننا ہی پڑی۔

"ممکن ہے کہ تم سچ بول رہے ہو۔" بڑی لڑکی بولی۔ "مگر کچھ بھی ہوا ہمارے سامنے نہیں ہوا۔ ہم دونوں اپنی ماتاجی کے ساتھ اپنے چاچا کے پاس بنارس گئے ہوئے تھے۔ ہم دونوں ایک ہی ہفتے پہلے بنارس سے آئے ہیں۔ ہمارے سامنے اگر ایسا ہوتا تو ہم خود اس لڑکی کو اتیاچار (ظلم) سے بچاتے مگر۔۔ مگر تم تو ہم سے بدلہ لینا چاہتے ہو۔" اس کی آواز میں دکھ تھا۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "ہم تم سے بدلہ نہیں لیں گے۔ ہمارا مقصد صرف تمہارے ماں باپ کو یہ احساس دلانا ہے کہ جس کی بیٹی اغوا کر لی جاتی ہے اس کے دل پر کیا گزرتی ہے! اس کے گھر والوں پر کیا بیتتی ہے! ہم تمہیں اپنی نیکی' شرافت اور پارسائی کا یقین دلانا نہیں چاہتے۔ تم جو چاہو' سمجھتی رہو' اس سے ہمارے اوپر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب تم اپنے گھر پہنچ جاؤ تو پھر سوچنا کہ تم کن لوگوں کے درمیان رہیں اور وہ کیسے تھے! پھر غور کرنا کہ تم اتنی ہی پوتر (پاک) ہو کہ نہیں جتنی یہاں آنے سے پہلے تھیں! لو اب اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو اپنا نام بتا دو!"

"میرا نام رادھا ہے۔" بڑی لڑکی نے بتایا۔ "اور اس کا نام ساوتری۔"

"اور میرا نام۔۔"

"میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بڑی نے آنکھیں چلا کر کہا۔ "تمہارا نام شاہین ہے مگر جانے کیوں مجھے یہ نام نقلی سا لگتا ہے۔ اصل نام کیا ہے تمہارا؟"

"پوچھنے سے کیا فائدہ!" میں نے طویل سانس لیا۔ "زندگی کے کسی موڑ پر اب شاید ہم نہ مل سکیں۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ کبھی کسی شاہین سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی جو اپنے قول و فعل میں سچا تھا۔ تمہیں یہ ملاقات یاد دلاتی رہے گی کہ مسلمان اتنے قابل نفرت نہیں ہوتے جتنا انہیں تمہارا باپ یا دوسرے متعصب ہندو سمجھتے ہیں۔"

پھر میں اس کمرے سے باہر آ گیا۔ رادھا نے میرے دل پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس کے لیے میں اپنے دل میں ایسے جذبات محسوس کر رہا تھا جو کبھی کلونت کور کے لیے محسوس کیے تھے۔ ایک خلش سی میری روح میں اتر گئی تھی۔ ایک کانٹا سا میرے دل میں چبھ کر رہ گیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ رادھا کے دل میں میرے لیے کیا جذبات تھے! میں سوچنے لگا کہ میرا بھی کیا مقدر ہے! پہلے ایک سکھ دوشیزہ میرے حواس پر چھا گئی اور اب ایک ہندو لڑکی مجھے بھا گئی تھی۔ وہ دن رادھا سے ملاقات کے بعد مجھے سوگوار سا معلوم ہونے لگا۔ کچھ دیر کے بعد چاند بی بی آ گئی اور وہ ان دونوں بہنوں کے پاس چلی گئی۔ چاند بی بی بھی ایک تاریخی نام تھا جو یقیناً فرضی ہی ہو سکتا تھا۔ چاند بی بی کی صورت شکل میں نہ دیکھ سکا۔ وہ سفید لمبا برقع پہن کر آئی تھی اور چہرے پر نقاب تھی۔ تیتو میر اسے سیدھا لڑکیوں کے کمرے میں لے گیا تھا۔ اسے بھی تیتو میر نے ہدایت کر دی تھی کہ لڑکیوں سے چھوچھپانا ہے۔

"آخر نقاب پر اتنا زور کیوں ہے؟" میں نے تیتو میر سے پوچھا تھا۔

"اس لیے کہ لڑکیوں کو بہرحال رہا کیا جانا ہے۔" تیتو میر جواباً بولا۔

بارش اب بھی پوری رفتار سے ہو رہی تھی۔ اس وقت میں اور میرے ساتھی حویلی کے ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے۔ ہمیں پھر ایک مہم درپیش تھی۔ اس مہم کا سہرا ایک بار پھر مجھے ہی پہنایا گیا۔ میرے تینوں ساتھی وہی تھے جو گزشتہ مہم میں میرے ساتھ تھے! اسی روز بعد نماز مغرب مجاہد اول نے ہمیں پھر اوپری منزل پر بلوایا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ جلالی میں پولیس نے بڑے پیمانے پر لوگوں کو زیر حراست لیا ہے۔ گرفتار ہونے والوں میں سیاسی کارکنوں کے علاوہ تمام بدنام اور مشتبہ افراد بھی شامل ہیں۔ زیر حراست افراد میں نامی گرامی غنڈے' بدمعاش اور دس نمبری بھی تھے۔ ان میں ہندو اور مسلمان کی تخصیص نہیں برتی گئی تھی۔ ان لوگوں سے جلالی کے قریب ایک عمارت کی تباہی کے بارے میں اور لالہ مرلی دھر کے گھر میں ڈکیتی کے متعلق پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔ مرلی دھر کی بیٹیوں کے اغوا کو پولیس چھپا رہی تھی۔ ایسا شاید خود مرلی دھر ہی کے ایما پر کیا جا رہا تھا۔ وہ غالباً رسوائی سے بچنا چاہتا تھا۔ اس کی رپورٹ پر پولیس' دھنساری کا رخ بھی کر چکی تھی۔ مشتبہ افراد میں مرلی دھر نے خیر محمد کا نام بھی لیا تھا اس لیے یہ امکان بھی تھا کہ خیر محمد کو بھی پکڑ لیا گیا ہو۔ ایک اہم اطلاع یہ بھی تھی کہ آس پاس کے علاقوں سے چندہ بیس ہندو سیٹھ مہیش کی حویلی میں

مسلمانوں کا بڑا ہمدرد بنتا ہے' ہندو مسلم ایکتا کی بات کرتا ہے۔ بتائیں کہ ہے نا یہ پاگل!"

اس دوران میں چائے آگئی۔ جوگیندر نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں پاگل نہیں ہوں چاچا جی! پاگل تو سوامی شردھانند' آپ اور ہریال جی ایسے لوگ ہیں۔ اس دیش میں جب سکھ' پارسی' عیسائی' بودھ سب رہ سکتے ہیں تو مسلمان کیوں نہیں رہ سکتے؟"

"اس لیے کہ وہ ہماری بہو بیٹیوں کو بھی اغوا کر لیتے ہیں۔ ان پر بری نظر رکھتے ہیں' ان کی عزت لوٹ لیتے ہیں؟" لالہ مرلی دھر کڑوی آواز میں بولا۔

"اور اگر ہم مسلمانوں کی بہو بیٹیوں کو اٹھوا لیں' ان کی عزت لوٹنا چاہیں تو کیا آپ مسلمانوں کو بھی یہ حق دیں گے کہ وہ ہندوؤں سے ہندوستان میں رہنے کا حق چھین لیں؟"

"خاموش ہو جا جوگیندر!" مرلی دھر گرجا۔ "تجھے شرم آنا چاہیے اپنے چاچا کے سامنے باتیں کرتے ہوئے۔"

"مجھے شرم تو اس دن بھی آئی تھی جب ایک بے گناہ مسلمان لڑکی نے اپنی آبرو بچانے کے لیے کنویں میں ڈوب کر جان دے دی تھی۔" جوگیندر ترکی بہ ترکی بولا۔

لالہ مرلی دھر غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "نکل جا یہاں سے ابھی اور اسی وقت!" لالہ چیخا اور پھر آگے بڑھ کر جوگیندر کا ہاتھ پکڑا اور اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ "چل نکل جا!"

شور و غل سن کر لالائن اور ایک نوجوان حسین لڑکی ڈرائنگ روم میں آگئے۔ لالائن نے آتے ہی کہا۔ "لالہ جی! یہ کیا کر رہے ہو؟"

"تو اندر جا!" لالہ غصے سے بولا' مگر لالائن جوگیندر کو اس سے چھڑا کر اندر لے گئی۔ اس کے بعد لالہ مرلی دھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہریال جی! آپ خیال نہ کرنا' اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ "ارے یہ چنکو اب تک نہیں لوٹا!"

"میں جا کر دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں تم یہیں ٹھہرو!" لالہ مرلی دھر بولا اور پھر زور سے آواز دی۔ "ہری!۔ ارے او ہری!"

"آیا سرکار!" ہری کی آواز سنائی دی اور پھر چند لمحوں بعد ہی وہ بیٹھک میں آگیا۔ "جی مالک"

"باہر جا کر دیکھ!" مرلی دھر نے اس سے کہا۔ "دیکھ یہ چنکو کہاں مر گیا! شرما جی کی نم نم سے بکسے اٹھانے گیا تھا۔"

مجھے معلوم تھا کہ چنکو کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ یقیناً وہ اس وقت نم نم میں بندھا پڑا ہوگا اور اب ہری بھی اسی انجام سے دوچار ہونے والا تھا۔ اس کے بعد ہماری اصل کا[م کا] آغاز ہوتا۔ ہری چلا گیا تو لالہ مرلی دھر اس مہم کے [بارے میں] باتیں کرنے لگا جس کے لیے میش نے مختلف علاق[وں سے] ہندوؤں کو یہاں بلوایا تھا۔

"آج یہ طے ہوا ہے کہ کل صبح ہی ایک پارٹی [دھنساری] جائے گی۔ کل رات وہاں مسلمانوں کے خون سے [ہولی کھیلی] جائے گی۔" لالہ مرلی دھر مجھے بتا رہا تھا۔ "مسلمان[وں کو] بتا دیں گے کہ ہندو بہو بیٹیوں کو اغوا کرنا کوئی معمولی [بات نہیں] ہے۔"

"اگر ایسا ہے لالہ جی! تو یہ بندوقیں یہاں کیوں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"بندوقیں یہیں سے جائیں گی۔" لالہ [بولا]۔ "ہریال جی! تم نہیں جانتے کہ میرا خون کتنا کھول رہا [ہے۔ میں] اس خیر محمد کا خون پی جاؤں گا۔"

"یہاں سے بندوقیں لے کر کون جائے گا؟" [میں نے] موقع دیکھ کر معلوم کیا۔

اپنے بھتیجے جوگیندر کی باتوں سے لالہ کچھ زیادہ [ہی برہم ہو] گیا تھا اس لیے میری بات کو نظر انداز کرتے ہو[ئے] ہانکنے لگا۔ "ان مسلوں نے بڑے کل پرزے نکال [لیے ہیں]۔ ان کی ہمت تو دیکھو ہریال جی! یہ اب ہماری عزت [سے] کھیلنے لگے ہیں۔ بیچہ ڈیکل! نہ معلوم میری بٹیاں [کس حال] میں ہوں گی! میں دھنساری میں مسلمانوں کا ایک ا[یک گھر] جلا دوں گا! ان کے ایک ایک بچے کو قتل کر دیا جائے [گا اور ان کی] عورتوں کی عزتیں ان کے سامنے لوٹی جائیں گی!"

"ایسا ہی ہو گا لالہ جی!" میں نے اس [کی] ہاں [میں ہاں] ملائی۔ "ہمیں اس وقت ذرا صبر سے کام لینا چاہیے۔ [آپ] مجھے بتائیں کہ یہاں سے بندوقیں کون لے کر جائے [گا؟"]

پھر مرلی دھر کھل ہی گیا۔ اس نے بتایا کہ میں بندوقیں لے کر دھنساری جاؤں گا۔ میرے ساتھ [وہ] بھی ہوں گے جو میش بھیجے گا۔ کوتوال شرما جی آج کسی وقت چار ہندو غنڈوں کو جو پولیس کی تحو[یل میں] ہیں چھوڑ دیں گے۔ کاغذات اور پولیس ریکارڈ کے [مطابق یہ] غنڈے پولیس کی حراست میں ہوں گے۔ دھنسا[ری کے] مسلمانوں پر حملے کی قیادت انہی چاروں ہندو غنڈ[وں نے کرنی] ہے۔ یہی غنڈے حملہ آور پارٹی کو لے کر دھنسار[ی جائیں] گے کیوں کہ وہ اس علاقے سے اچھی طرح واقف [ہیں]۔ دھنساری کے باشندے ان غنڈوں کو پہچان بھی [لیں تو کوئی] فرق نہیں پڑے گا کیوں کہ پولیس ریکارڈ کے مطابق [وہ]

پہلے ہی پولیس کی حراست میں ہوں گے۔ حملے کے بعد ہمارے جوان اپنے اپنے گھر لوٹ جائیں گے اور یوں تفتیش کا دائرہ کبھی ہم تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

مرلی دھر شیطان کی باتوں پر میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ کوتوال شرما آج رات کس طرح ہندو غنڈوں کو رہا کر سکتا تھا؟ وہ تو خود بندھا پڑا تھا۔ صبح سے پہلے اس کی رہائی کا امکان نہیں تھا۔ اب ہمیں تیزی سے کام کرنا تھا۔ میش کے بھیجے ہوئے دونوں نوجوان کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے تھے جنہیں لالہ مرلی دھر کے ساتھ دھنساری جانا تھا۔

"کیا ہو گیا آخر!" میں اچانک بول اٹھا۔ "چنکو کے ساتھ تو ہری بھی وہیں جا کر بیٹھ گیا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں خود جا کر دیکھتا ہوں۔"

مرلی دھر کو بھی اب شاید کسی گڑبڑ کا احساس ہو چکا تھا۔ میرے ساتھ ہی وہ بھی بیٹھک سے اٹھ کر برآمدے تک آیا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا اور بارش میں بھیگتا ہوا حویلی کے پھاٹک کی طرف بڑھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ سب کام ٹھیک تھا۔ چنکو اور ہری جکڑے پڑے تھے۔ ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ میں پھر الٹے قدموں واپس ہو گیا۔

"کچھ گڑبڑ لگتی ہے لالہ جی!" میں نے لہجے میں پریشانی کا اظہار کیا۔ "آپ کے دونوں ملازم اور میرا ساتھی تینوں وہاں بندھے پڑے ہیں اور بندوقوں کے بکسے غائب ہیں۔"

"ہیں!" لالہ مرلی دھر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ "ہائے رام! یہ کیا ہو گیا؟ اندر آجاؤ بیٹا' اندر آجاؤ!" یہ کہتا ہوا وہ دوڑ کر اندر چلا گیا۔ اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ میں بیٹھک میں پہنچا تو وہ دروازے سے دوسری طرف لپک رہا تھا۔ "دروازہ بند کر دو' جلدی!" اس نے رک کر مجھ سے کہا۔ خوف سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"جلدی سے دروازہ بند کر دو!" اس نے پھر گھبرا کر کہا۔ "اور۔۔۔ اور تم بھی اندر ہی آجاؤ!" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ظاہر ہے کہ مجھے دروازہ بند نہیں کرنا تھا۔ میرے تینوں ساتھی حویلی کا پھاٹک بند کر کے اندر آچکے تھے۔ انہوں نے رومالوں سے اپنے چہرے چھپا لیے تھے۔ میں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کو کہا اور تیزی سے برابر والے کمرے میں کھلنے والے دروازے میں آگیا۔

مرلی دھر باغ کی طرف کھلنے والے دروازے میں کھڑا چیخ رہا تھا۔ "شیامو!۔ شیامو!"

اب میرے تینوں ساتھی بیٹھک میں آچکے تھے۔ میں نے انہیں وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور تیزی سے بھاگ کر لالہ مرلی دھر کے پاس پہنچ گیا۔ لالہ مرلی دھر کی آواز سے کچھ ایسی ہی گھبراہٹ اور خوف کا اظہار ہو رہا تھا کہ شیامو کے ساتھ ہی لالائن' ملازمہ دلاری' لالہ کی حسین و نوجوان بھتیجی سیتا اور جوگیندر بھی وہاں آگئے۔

"کیا بات ہے؟۔ کیا ہوا؟" "کچھ بتائیں تو!" لالہ مرلی دھر سے مختلف سوالات کیے گئے۔

"بتاتا ہوں۔" لالہ مرلی دھر اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "دیکھ شیامو! تو ذرا کوتوال شرما جی کے پاس جا۔ شرما جی سے کہنا کہ لالہ جی نے ابھی بلایا ہے۔ ان سے کہہ دینا کہ انہوں نے جو مال بھیجا تھا' وہ کوئی اڑا لے گیا ہے۔ شیامو! تو پچھلے دروازے سے نکل جا' جلدی کر! شرما جی کو اپنے ساتھ ہی لانا' الٹے پاؤں آ۔ جلدی جا!"

شیامو رسوئیا (باورچی) بھاگتا ہوا برآمدے سے باغ کی طرف گیا چند لمحوں بعد ہی وہ حویلی کے عقبی دروازے سے نکل چکا تھا۔ لالہ مرلی دھر نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"چنکو اور ہری کہاں ہیں؟" جوگیندر نے اپنے چاچا لالہ سے پوچھا۔

"باہر۔ وہ باہر بندھے پڑے ہیں۔" لالہ مرلی دھر نے جواب دیا۔ "مجھ کو یہ وہی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ انہی کا کام جان پڑتا ہے۔" وہ بے حد خوف زدہ تھا۔

"میں دیکھتا ہوں۔" جوگیندر نے بیٹھک کی طرف بڑھنا چاہا۔

لالائن اور سیتا نے اسے پکڑ لیا۔ "نہیں نہیں!" لالائن بولی۔ "تو یہیں ٹھہر بیٹا!"

"گھر میں اور کوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بیٹا!" لالہ مرلی دھر بولا' پھر یہاں لوگوں سے کہا "تم سب اندر چلو' کمرے میں!" مرلی دھر کے کہنے پر سبھی اندر چلے گئے۔ "دروازہ بند کر لو اندر سے!" لالہ پر کچھ زیادہ ہی گھبراہٹ طاری تھی۔ پھر اس نے خود بڑھ کر اندر کا دروازہ بند کر دیا اور بولا۔ "تمہیں نہیں معلوم کہ وہ لوگ کتنے خطرناک ہیں!"

میں نے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی کہ وہ کن لوگوں کی بات کر رہا ہے! اب حالات ہمارے قابو میں تھے۔ میں لالہ مرلی دھر کو باتوں میں لگائے ہوئے تھا کہ میرے تینوں ساتھی بیٹھک کے دروازے سے اس کمرے میں داخل ہوئے۔ ان تینوں نے لالہ مرلی دھر کو قابو میں کر لیا تھا۔ لالہ ایک مرتبہ پھر ہماری گرفت میں تھا۔ وہ

شاید اپنی زندگی کے بدترین صدمے اور حیرت کے لمحات سے گزر رہا تھا اور گھگیا رہا تھا۔ اس مرتبہ ہمیں زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ اندر والے کمرے میں بند افراد زور زور سے چیخ رہے تھے۔ دروازے کو اندر سے پیٹا جا رہا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اندر والے کمرے میں کوئی اور دروازہ نہیں ہے۔ کھڑکیاں تھیں تو ان پر اتنی موٹی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں کہ اس کمرے سے ان لوگوں کے باہر آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لالہ مولی دھر کو ہم ایک بار پھر کشاں کشاں اس کنویں کی طرف لے گئے جس میں اسے گزشتہ رات لٹکایا تھا۔ لالہ بری طرح بلک رہا تھا۔

"عورتوں کی طرح شور نہ مچاؤ!" میں نے اسے ڈانٹا پھر دھمکی دی۔ "مت بھولو کہ ہم تمہیں کنویں میں لٹکانے کے بجائے موت کے گھاٹ بھی اتار سکتے ہیں۔"

پھر لالہ مولی دھر خاموش ہو گیا۔ دھمکی کا اس پر خاصا اثر ہوا تھا۔ آج رات بھی لالہ کو کنویں میں اترنا ہی پڑا تھا۔ اندر کمرے سے لالائن اور دوسرے لوگوں کی چیخ پکار کے ساتھ ہی اب بیٹھک کی طرف سے بھی چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید منیش کے بھیجے ہوئے آدمی وہاں پہنچ چکے تھے۔ ہم سب حویلی کے عقبی دروازے سے نکلے اور دوڑتے چلے گئے۔ ہمارا رخ اس مقام کی طرف تھا جہاں ہمیں ایک قلی تانگا ملنا تھا۔ دو بجے ہم پھر اسی مکان میں تھے۔ آج ہمارے سونے کا بندوبست اوپری منزل پر کیا گیا تھا۔ نچلی منزل میں اندھیرا تھا۔ میں نے تیتو میر سے دونوں لڑکیوں کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ مجاہد اوّل کے حکم پر انہیں کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہے۔

"مجاہد اوّل سے کب ملاقات ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔" تیتو میر نے جواب دیا۔ "آپ لوگوں کو کل صبح فجر کی اذان کے وقت روانہ ہو جانا ہے۔"

"میں انہیں اپنی مہم کی رپورٹ بھی تو دینا چاہتا تھا۔" میں بولا۔

"رپورٹ آپ مجھے دے دیں۔"

میں نے پھر تیتو میر کو لالہ مولی کی حویلی میں پیش آنے والے تمام واقعات سے آگاہ کر دیا۔ وضاحت کے لیے درمیان میں تیتو میر مجھ سے سوالات بھی کرتا رہا۔ جب میں تیتو میر کو پوری رپورٹ دے چکا تو وہ بولا۔ "واقعی شاہین! آپ انتہائی ذہین اور دلیر ہیں۔ اگر مجاہد اوّل کو آپ پر اتنا اعتماد ہے تو کچھ بے جا نہیں۔" اس کے لہجے سے رشک کا اظہار ہو رہا تھا۔ "کاش آپ کے ساتھ میں بھی ہوتا!"

"مجاہد اوّل تم پر بھی اعتماد کرتے ہیں۔" میں نے اس کی خوشنودی کے لیے کہا۔ "اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ تمہیں ہمیں صحیح کر کے پہنچانے کا فرض نہ سونپتے۔"

پھر ہم بستر پر دراز ہو گئے۔ میری آنکھوں میں نیند تھی۔ رادھا کو دیکھ کر میرے سارے غم ہرے ہو گئے۔ کلونت کور مجھے بری طرح یاد آنے لگی تھی۔ کبھی میرے تصور میں کلونت ابھرتی اور کبھی اس کا چہرہ رادھا کے خدوخال میں تبدیل ہو جاتا۔ معلوم نہیں رادھا کہاں تھی؟ مجاہد اوّل نے اسے کہاں بھیج دیا تھا؟

رادھا سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی اسے اس کی بہن ساوتری کے ساتھ واپس بھیج دیا جائے گا۔ میرا پروگرام تھا کہ میں آج ہی رات ان دونوں کو ان کے گھر پہنچا دوں گا مگر اب انہیں کہیں اور ہی منتقل کر دیا گیا تھا۔ مجاہد اوّل سے میری ملاقات کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ مجاہد اوّل کو میں یہ بتا دیا تھا کہ دونوں بہنوں سے میں نے جلد ان کے گھر پہنچانے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس پر مجاہد اوّل نے کہا تھا کہ تم بے فکر رہو لیکن میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ کیا مجاہد اوّل میرے وعدے کو پورا کرے گا؟ میرے ذہن نے اس سوال کا جواب اثبات میں ہی دیا۔

"تیتو میر! تیتو میر!" میں نے آہستہ سے آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ شاید اسے نیند آ گئی تھی۔ میں لالٹین کی بتی نیچی کی اور واپس اپنے بستر پر آ بیٹھا۔

بارش کے یکساں اور بے کیف شور میں اچانک مجھے غیر معمولی آوازیں محسوس ہوئیں۔ نیچے کوئی دروازے کو طرح پیٹ رہا تھا۔ میں نے تیتو میر کو جگا دیا۔ وہ آنکھیں جھپکاتا ہوا اٹھا اور بولا۔ "کیا بات ہے؟"

"نیچے کوئی دروازہ پیٹ رہا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ اسی وقت فضا کے دوش پر لہراتی ہوئی ایک بھاری کرخت آواز سنائی دی۔ "پولیس! پولیس! دروازہ کھولو۔"

"پولیس — یہ مصیبت یہاں کہاں سے آ گئی؟" ... بڑبڑایا۔

"میرا خیال ہے کہ پولیس نے یہاں چھاپا مارا ہے۔" تیتو میر نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

نیچو، حیدر علی اور سراج الدولہ کو بھی جگا دیا گیا۔ دروازے پر دستکیں اور شدید ہو گئی تھیں۔ "تم لوگ ... سمجھو!" میں نے ان سے کہا اور تیزی سے زینہ اتر گیا۔ صدر دروازے کو اب توڑنے کی کوشش شروع ہو گئی تھیں۔ یہ اندازہ میں نے آوازوں سے لگایا۔ میں نے زینے کا دروازہ بند کیا اور پھر اوپر آ کر وہاں کے دروازے کی کنڈی بھی لگا دی۔

"یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟" میں نے تیتو میر سے پوچھا۔ تیتو میر نے مایوسی کے ساتھ انکار میں سر ہلا دیا۔

"اب کیا ہوگا؟" نیچو بولا۔ اس کی آواز سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

پریشان تو ہم سب ہی تھے۔ صورت حال ہی ایسی تھی۔ اس مکان سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا جسے پولیس نے مسدود کر دیا تھا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ پولیس کی گرفت سے بچنے کی واحد صورت یہی ممکن تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس میں ناکامی ممکن نہیں تھی۔ بارش کے شور اور باہر ہونے والے ہنگامے کے سبب مجھے یقین تھا کہ ہم پولیس کے اوپر پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ سفیدی کا جو سامان اوپری منزل پر موجود تھا۔ اس کی مدد سے میں خود کو اور اپنے ساتھیوں کو پولیس کی گرفت سے بچا سکتا تھا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ نیچے دروازے پر پڑنے والی ضربوں میں بھی شدت آ گئی تھی۔ گلی میں شور اور ہنگامہ برپا تھا۔ محلے کے لوگ بھی شور سن کر بارش کے باوجود اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈیوڑھی کا چوبی صدر دروازہ کب تک ضربیں برداشت کر سکتا ہے؟

"جلدی کرو!" میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ "اپنے کپڑے اور سامان ایک تھیلے میں رکھو!"

"آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟" تیتو میر نے سوال کیا۔

"نیچو! جلدی کرو۔" میں نے تیتو میر کے سوال کو نظر انداز کر دیا، پھر سخت لہجے میں کہا۔ "یہ سستی یا کاہلی کا وقت نہیں ہے۔" میرے لہجے کی سختی سے میرے ساتھی مرعوب ہو گئے۔ وہ یقیناً سمجھ گئے تھے کہ میرے ذہن میں فرار کی کوئی ترکیب آ گئی ہے۔ نیچو، حیدر علی اور سراج الدولہ کپڑے سمیٹ کر جلدی جلدی تھیلے میں رکھنے لگے۔ میں اس عرصے میں تھیلے سے پٹ سن کی رسیوں کے لچھے نکال چکا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ مجاہد اوّل بھی ہماری طرف سے غافل نہیں ہوں گے۔" تیتو میر نے اپنا خیال پیش کیا۔ اسے شاید یہ امید تھی کہ اس موقع پر مجاہد اوّل کی طرف سے ہمیں کسی نہ کسی طرح مدد مل جائے گی۔ ممکن ہے اس کا خیال درست ہو مگر یہ محض خوش گمانی بھی ہو سکتی تھی۔

"ممکن ہے تمہارا کہنا صحیح ہو۔" میں بولا۔ "لیکن ہمیں اپنے طور پر بھی کوشش کرنا چاہیے۔ تم یہ رسی کھولو! ہم ان شاء اللہ یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

تیتو میر کی مدد سے میں نے ایک لچھے کو کھول لیا، پھر رسی کو دہرا کر کے اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گانٹھیں لگا دیں۔ اس وقت تک میرے بقیہ تینوں ساتھی کینوس کے تھیلے میں کپڑے اور دوسرا ضروری سامان بھر چکے تھے۔

"نیچو! تم دوسرے لچھے کو کھول کر رسی میں اسی طرح گرہیں لگاؤ!" میں نے ہدایت دی۔

"آخر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟" تیتو میر نے تجسس سے مجبور ہو کر دریافت کیا۔

"دیکھتے رہو۔" میں نے کہا، پھر رسی میں ایک اور گرہ لگا دی۔ "تم ذرا پچھلی طرف دیوار سے نیچے جھانک کر دیکھو۔" میں نے تیتو میر سے کہا اور مزید گرہیں لگانے لگا۔

تیتو میر نے سفیدی کے کام میں استعمال ہونے والی گھوڑی پر چڑھ کر دیوار کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ میں رسی میں گرہیں لگاتا رہا۔ نیچو اور حیدر علی دوسری رسی میں میری ہی طرح گرہیں لگا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد تیتو میر گھوڑی سے اتر کر جلدی جلدی میرے پاس آ کر بولا۔ "پولیس ادھر بھی موجود ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا کہ انہوں نے ہمیں دونوں طرف سے گھیرا ہوگا۔" میری آواز پرسکون تھی۔ "میں صرف اپنے خیال کی تصدیق چاہتا تھا۔ خیر کوئی پروا کی بات نہیں۔ پولیس ہماری گرد کو بھی نہیں پا سکے گی۔ پولیس جب یہاں پہنچے گی تو حیرت کے سوا اسے کچھ نہ مل سکے گا۔" اس کام میں ہمیں چار منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ دونوں رسیوں میں گرہیں لگ چکی تھیں۔ ہم ان کے ذریعے بلندی سے نیچے جا سکتے تھے۔ نیچے دروازے پر پڑنے والی ضربیں اب اور بھی تیز ہو گئی تھیں۔

"او کے پٹھو! کیا ہاتھوں میں دم نہیں ہے! جلدی کرو، توڑ دو اس دروازے کو!" ایک رعب دار آواز بلند ہوئی۔

میرے لیے نیچے سے آنے والی یہ رعب دار آواز آشنا تھی۔ میں اس آواز کو کیسے بھول سکتا تھا! پہلے بھی یہ آواز سن چکا تھا۔ یہ آواز کوتوال شرما کی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد کوتوال کی آواز پھر سنائی دی۔ اب وہ مختلف سپاہیوں کے نام لے کر انہیں دیوار پھاند کر مکان میں داخل ہونے کا حکم دے رہا تھا۔ یہ حکم ہم سب نے سنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی نیچو نے اوپری منزل کی ایک دیوار میں بنی ہوئی کھڑکی کھولی۔ یہ کھڑکی

دوسری طرف نیچے پر کھلتی تھی۔ نیو کھڑکی میں لیٹ کر چھجے پر پہنچا اور نیچے صحن کا جائزہ لینے لگا۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کی مدد سے میں اس وقت عقبی دیوار سے لگی ہوئی سیڑھی اٹھا چکا تھا۔ لمبی سیڑھی کو میں نے آہستہ سے اس بلند و بالا درخت کے ایک گدے سے ٹکا دیا جو مسجد کے صحن میں اگا ہوا تھا۔ وہ گدا ہم سے آٹھ فٹ کے فاصلے پر رہا ہوگا۔

"بہترین!" تیتو میر نے پرجوش آواز میں کہا اور میرے شانے پر شاباشی کے انداز میں تھپکی دی۔

نیو اسی وقت کھڑکی بند کر کے واپس آگیا اور بتایا۔ "وہ لوگ دیوار پھاند کر اندر آ گئے ہیں۔"

"پروا نہیں۔" میں اطمینان سے بولا۔ "شکر ہے کہ پہلے یہ بات ان کی عقل میں نہیں آئی۔" ہمارے فرار کی راہ ہموار ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ "چلو جلدی کرو!" پھر میرے اشارے پر تینوں ساتھی آہستگی لیکن پھرتی کے ساتھ سیڑھی سے ہو کر نیم کے درخت پر پہنچ گئے۔ میں نے انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ درخت پر پہنچتے ہی ڈال ڈال ہو کر آہستگی سے مسجد کی چھت پر پہنچ جائیں اور ہمارا انتظار کریں۔ نیچے ڈیوڑھی کا دروازہ کھل چکا تھا۔ گلی کا شور اب صحن، برآمدے اور ڈیوڑھی میں منتقل ہو چکا تھا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ پھر ڈیوڑھی میں زینے کے نیچے والے دروازے پر ضربیں لگنے کی آواز آنا شروع ہو گئی۔

"تم لوگ جو اوپر ہو، زینے کا دروازہ کھول کر نیچے آجاؤ! تمہیں گھیرا جا چکا ہے۔" یہ آواز کوتوال شرما کی تھی جو صحن سے آ رہی تھی۔ اسے ہم چند گھنٹے پہلے باندھ کر ایک سڑک کے کنارے ڈال آئے تھے، پھر وہ کس طرح آزاد ہو گیا؟ اس سوال کا ممکنہ جواب یہ تھا کہ لالہ مرلی دھر کی حویلی میں پہنچنے والوں کو جب لالہ سے ہمارے بارے میں پتا چلا ہو گا تو کوتوال شرما کو تلاش کیا گیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ کوتوالی سے ٹم ٹم لے کر لالہ کی حویلی ہی گیا تھا۔ اسی راستے میں اسے تلاش کیا گیا ہوگا۔

کوتوال کی بات سن کر ایک تلخ گھٹا ہوا قہقہہ میرے حلق سے ابھرا۔ "جلدی کرو تیتو میر!" میں نے کہا اور ایک رسی اسے تھما دی جسے دہرا کر کے ہم پہلے ہی تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گرہیں لگا چکے تھے۔ "یہ رسی۔ اس رسی کا ایک سرا تم درخت پر پہنچتے ہی گدے سے باندھ دینا!" میں نے اسے ہدایت دی۔

"کیوں؟" تیتو میر نے سوال کیا۔

اس بے وقت سوال پر میں جھنجلا سا گیا۔ "جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو، سمجھے!" میری آواز میں تلخی آگئی۔ "میں اسی کے سہارے درخت پر پہنچوں گا۔"

"مگر وہ سیڑھی جو موجود ہے؟"

"میں کہہ رہا ہوں، چلے جاؤ اور وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔" میں سختی سے بولا۔

"پہلے آپ جایئے!" تیتو میر نے کہا۔ "میں ان لوگوں سے یہیں نمٹ لوں گا۔"

"ان سے کوئی نہیں نمٹے گا!" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "چلو جلدی آگے بڑھو!"

"مگر جناب، یہ کبھی نہیں ہو سکتا! میں آپ کو یہاں چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گا!" وہ اڑ گیا۔

"احمق! بے وقوف!" میں نے جھلا کر اس کی گدی پر ہاتھ ڈال دیا اور اسے سیڑھی کی طرف دھکیلا۔ "دیر مت کرو ورنہ ہم سب پھنس جائیں گے۔ یہ حکم ہے سمجھے!"

"لیکن۔۔۔"

"بک بک مت کرو!" میں غرایا۔ "رسی کو مضبوطی سے باندھنا!"

میری آواز میں اس قدر سختی تھی کہ اس کے بعد تیتو میر کو خاموش ہونا پڑا۔ وہ رسی کا ایک سرا ہاتھ میں لے کر سیڑھی کے ذریعے درخت تک پہنچ گیا اور پھر میری ہدایت کے مطابق رسی کو درخت کے گدے سے باندھ دیا۔ دوسرا سرا میں نے احتیاطاً برآمدے میں پڑی ہوئی چارپائی سے باندھ دیا کہ کہیں ہوا کے جھونکے سے رسی دیوار سے پھسل کر باہر نہ گر جائے۔

اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں نے سیڑھی اٹھائی اور اسے عقبی دیوار سے ٹکا دیا۔ اس سے قبل میں نے سیڑھی کے آخری ڈنڈے کے درمیان میں دوسری رسی کا ایک سرا باندھ دیا تھا۔ سیڑھی کو دیوار سے ٹکا کر میں نے وہ رسی دیوار کے باہر لٹکا دی۔ اس کارروائی کا مقصد پولیس کو اس دھوکے میں مبتلا کرنا تھا کہ ہم نے فرار کے لیے سیڑھی اور اس سے بندھی ہوئی رسی کو استعمال کیا ہے۔ اس عرصے میں نیچے زینے کے دروازے پر ضربیں اور شدید ہو گئی تھیں۔ جس وقت اس دروازے کے ٹوٹنے کی آواز آئی میں چارپائی سے رسی کھول کر دیوار پر چڑھ چکا تھا۔ رسی میری کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ بارش کے سبب دیوار پر پھسلن سی تھی۔ مجھے بہت احتیاط سے کام لینا تھا کیوں کہ دیوار کمزور تھی۔ ذرا سے غلط وزن کی وجہ سے دیوار ٹوٹ بھی سکتی تھی جس سے سارے کیے دھرے پر پانی پھر جاتا۔ دیوار ٹوٹنے سے شور ہوتا اور پولیس ادھر متوجہ

ہو جاتی۔ پھر پولیس کے لیے ہمارا تعاقب کرنا اور پھر ہم پر ہاتھ ڈالنا آسان ہوتا۔ میں ظاہر ہے کہ اس سے بچنا چاہتا تھا۔ میرا دل اسی لیے تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پولیس والے اب زینے کے اوپر والے دروازے کو توڑ رہے تھے۔ میں نے رسی کو مضبوطی سے پکڑا اور دوہری رسی کے درمیان ایک گرہ پر پیر جما دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں رسی کے سہارے باہر جھول گیا۔ ذرا دیر کے بعد میں گرہوں پر پیر رکھتا ہوا درخت کے اس گدے تک پہنچ گیا جس پر تیتو میر منتظر تھا۔ گدے سے رسی کھول کر میں نے اپنی کمر کے گرد لپیٹ لی اور

تیتو میرے بولا۔ "چلو!"

پھر ہم دونوں آگے پیچھے بانس، شاخوں اور گڈوں کے سہارے مسجد کی چھت پر جا پہنچے۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ زینے کے اوپری دروازے پر ضربیں اب بھی لگ رہی تھیں مگر تشویش ناک لمحات گزر چکے تھے۔ ہم پولیس کا جال توڑ کر نکل آئے تھے۔ مسجد کی چھت سے ہم رسی کے سہارے مسجد کی عقبی سمت میں اترے۔ اب تیتو میر ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔

مختلف گلیوں اور سڑکوں سے گزر کر ہم کوئی پندرہ منٹ بعد چھوٹے سے ایک مکان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ تیتو میر کی پہلی دستک ہی پر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والے نے اسے پہچان لیا اور کہا۔ "آؤ آؤ اندر آجاؤ! ہم سب تمہارے لیے بہت پریشان تھے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ پولیس کے چھاپے کی خبر تم تک پہنچ چکی ہے!" تیتو میر دروازے میں داخل ہو کر بولا۔ اس کے پیچھے ہم چاروں بھی اندر پہنچ گئے اور دروازہ بند کر لیا گیا۔

"پولیس نے جب وہاں چھاپا مارا تھا" اس کے پانچ منٹ بعد ہی یہاں خبر آگئی تھی۔" اس شخص نے ایک طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ظاہر ہے ہمارے لیے یہ خبر انتہائی پریشانی کا سبب تھی۔ مجاہد اوّل کا کہنا تھا کہ پولیس کے چھاپے کی صورت میں وہ مکان چونکہ بے دخل ہی گیا ہوگا حیرت ہے کہ تم لوگ پھر بھی وہاں سے فرار ہو کر یہاں آگئے! یہ کس طرح ہوا؟ مجاہد اوّل نے تم لوگوں کی مدد کے لیے کچھ افراد کو روانہ کیا تھا۔"

"بس نکل ہی آئے وہاں سے کسی نہ کسی طرح!" تیتو میرنے جواب دیا پھر پوچھا۔ "مجاہد اوّل کہاں ہیں؟"

"اندر ہیں۔" جواب ملا۔ اسی وقت ہم ایک کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ہمارے میزبان ساتھی نے دروازے پر تین مرتبہ مخصوص انداز میں دستک دی، پھر ذرا ٹھہر کر دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ چند لمحے بعد ہی اس نے ہم سے اندر آنے کو کہا۔ ہم آگے پیچھے اس کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں بہت مختصر سامان تھا۔ ایک طرف چند موڑھے پڑے ہوئے تھے۔ کونے کی ایک طاق میں چراغ جل رہا تھا جس کی لو دھیمی تھی۔ دیوار کے ساتھ موڑھوں کے سامنے ایک تخت نظر آرہا تھا جس پر سفید چادر بچھی تھی اور گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تخت کے پہلو میں اونچی پشت والا موڑھا پڑا ہوا تھا۔ کمرا اس اعتبار سے خالی تھا کہ ہمارے داخل ہونے سے پہلے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

"مجاہد اوّل کہاں ہیں؟" تیتو میرنے پوچھا۔ "تم تو کہہ رہے تھے کہ اندر ہیں۔"

"معلوم نہیں۔ مجھے یہی علم تھا کہ وہ اندر ہیں۔" جواب دیا گیا۔ "بہر حال آپ لوگ یہاں بیٹھیں، انتظار کریں۔ میں آپ لوگوں کے لیے گرم گرم قہوہ لاتا ہوں۔" وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا اور کمرے کا دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ پھر اس کے قدموں کی آواز دور ہوتے ہوئے بارش کے شور میں مدغم ہو گئی۔

"یہ تجربہ بھی یاد رہے گا۔" ٹیپو بولا اور لمبا سانس لیا۔ "مگر شاہین!" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "فرار کی راہ آپ کو خوب سوجھی۔"

میں "ہوں" کہہ کر چپ ہو گیا۔ میرے ساتھی اس مکان سے فرار پر گفتگو کر رہے تھے مگر مجھے اس سے دلچسپی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں تو اس وقت کئی پریشان کن سوالات گردش کر رہے تھے۔ یہ سوالات اسی وقت سے مجھے پریشان کیے ہوئے تھے جب پولیس کا چھاپا پڑا تھا۔ سب سے پہلا اہم سوال تو یہی تھا کہ آخر پولیس کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ہم اس مکان میں چھپے ہوئے ہیں؟ میرے ذہن میں طرح طرح کے خدشات پیدا ہو رہے تھے۔ پولیس سے مخبری کرنے والا ہم ہی میں سے کوئی ہو سکتا تھا۔ وہ کالی بھیڑ کون تھی؟ میں سوچنے لگا۔ تیتو میر، چاند بی بی یا وہ جس نے کوتوال شہر سے بندوقیں چھیننے کی مہم میں تیتو میر کا ساتھ دیا تھا؟ یا ان میں سے کوئی جو ہمیں لالہ سکھ دھری کی حویلی پر یلغار کے دوران میں ملے تھے؟ ان میں سے کون پولیس کا مخبر تھا؟ ظاہر ہے مخبری کے بغیر پولیس کو الہام تو نہیں ہو سکتا تھا۔

انہی پریشان کن خیالات کے ساتھ میرے دل میں خوشی کا ایک چھوٹا سا چراغ بھی جل اٹھا تھا، ایسی خوشی جس نے میرے دل کو روشن کرنے کے ساتھ ساتھ ذہن کو بھی تازگی بخشی تھی۔ مایوس کن صورت حال کے باوجود میں اپنے ساتھیوں کو خطرے سے بچا کر لے آیا تھا۔ میرے نزدیک یہ کامیابی اسلحہ ڈپو کو اڑانے سے زیادہ اہم تھی کیوں کہ اس میں کسی پہلے سے طے شدہ منصوبے پر عمل نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کامیابی صرف میرے مشاہدے اور بروقت فیصلوں کا حاصل تھی۔

میرے ساتھی اب بھی اسی فرار پر محو گفتگو تھے۔ میں نے تیتو میرسے پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ پولیس کو اس مکان کا کس طرح سراغ مل گیا؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ واقعی یہ حیران کن اور تشویش ناک ہے۔" تیتو میر بولا۔

اسی وقت ہمارا میزبان ایک ٹرے میں گرم گرم قہوے کے پیالے لے کر آگیا۔ قہوے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

"اس وقت اس سے بہتر اور مناسب تواضع ممکن نہیں تھی۔" میں نے قہوے کا پیالہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ!" اس نے جواب دیا اور قہوہ دے کر واپس چلا گیا۔

ہم نے ابھی قہوہ پی کر پیالے رکھے ہی تھے کہ کمرے کے ایک کونے میں بنے ہوئے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ہم سب اپنی جگہ چوکنا ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی دروازے پر لگا ہوا قفل کھول رہا ہو۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کیا چکر ہے؟ دروازے کا قفل کھولنے والا کون ہو سکتا ہے؟

"مجاہد اوّل ہیں شاید!" تیتو میرنے خیال ظاہر کیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر کنڈی کھولنے کی آواز آئی۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ میری نظر اسی طرف تھی۔ یہ دروازہ مکان کی عقبی سمت میں ایک گلی کے اندر کھلتا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی مجاہد اوّل، دبلے پتلے سے ایک شخص کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ مجاہد اوّل سیاہ برساتی، سیاہ ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور چہرے پر بھی سیاہ نقاب حسب معمول تھی۔

مجاہد اوّل نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا۔ چراغ کی زرد روشنی میں نقاب کے سوراخوں سے مجاہد اوّل کی آنکھوں میں اطمینان کی لہریں دوڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے گہرا سانس لیا، برساتی اتار کر دو تین مرتبہ جھٹکے دیے جس سے پانی فرش پر گرا۔ پھر مجاہد اوّل نے اونچی پشت والے موڑھے پر بیٹھنے سے پہلے برساتی ایک کیل سے ٹانگ دی اور دبلے پتلے شخص سے مخاطب ہوا۔ "قاسم! تم بھی بیٹھ جاؤ۔" دبلا پتلا شخص قاسم ایک موڑھے پر بیٹھ گیا تو مجاہد اوّل ہماری طرف متوجہ ہوا۔ "تو تم لوگ وہاں سے نکل آئے!" اس کی آواز میں مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "تمہارے وہاں پھنس جانے سے بہت پریشانی ہو گئی تھی۔ میں وہیں سے آرہا ہوں۔ کوتوال شہر پاگل ہو رہا ہے۔ عقبی حصے کی طرف متعین پولیس والوں کی کم بختی آگئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اس طرف سے فرار نہیں ہوئے۔"

"آپ کا خیال درست ہے مجاہد اوّل!" میں نے کہا اور پھر فرار کی تفصیلات بیان کر دیں۔

"بہت خوب شاہین! تم یقیناً ایک بیدار مغز نوجوان ہو۔" مجاہد اوّل نے تحسین آمیز لہجہ اختیار کر لیا، پھر بولا۔ "اگر ذہن کو فعال رکھا جائے اور اس سے کام بھی لیا جائے تو

بڑی سے بڑی مایوسی کو امید اور ہر ناکامی کو کامیابی میں بدلا جا سکتا ہے۔"

میں نے اپنی تعریف پر مجاہد اوّل کا شکریہ ادا کیا پھر کہا۔ "مگر جناب! پولیس نے وہاں آخر کس کی مخبری پر چھاپا مارا تھا؟"

"یہ سوال خود میرے لیے بھی تشویش کا سبب ہے۔" مجاہد اوّل بولا پھر قاسم سے مخاطب ہوا۔ "تم بتاؤ قاسم! اس پر تم کوئی روشنی ڈال سکتے ہو؟"

"نہیں جناب!" قاسم نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"اس کا جواب ہمیں کل دوپہر تک مل جائے گا شاہین!" مجاہد اوّل نے خاص طور پر مجھے مخاطب کیا کیوں کہ میں نے ہی سوال اٹھایا تھا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم پر جو اعتماد کیا گیا تھا، تم نے خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا ہے۔" میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو تعریف پر خوش ہوتا مگر میرا ذہن تو اس وقت الجھا ہوا تھا۔ کمرے میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

اچانک مجاہد اوّل کی بھاری آواز سے سناٹا ختم ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تم سب مجھے بیٹوں کی طرح عزیز ہو۔ یقین کرو کہ اس سے پہلے کہ کسی پولیس والے کا ہاتھ تم میں سے کسی پر بھی پڑتا، وہاں خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔ کیوں قاسم! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"جی نہیں جناب!" قاسم نے جواب دیا۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"تیتو میر!" مجاہد اوّل نے کہا۔ "قاسم کے لیے قہوہ لے کر آؤ، مسلسل بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اسے سردی لگ رہی ہے۔" پھر تیتو میر اٹھ کر چلا گیا۔ مجاہد اوّل کے ایما پر میں نے گزشتہ شب کی پہلی مہم کی تفصیلات بیان کیں جو کوتوال شہر سے بندوقیں چھیننے سے لے کر لالہ سکھ دھری کی حویلی پر ہماری کارروائی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس عرصے میں قاسم کے لیے گرم قہوہ بھی آگیا۔

"ساتھیو، مجاہدو! اب ہمیں ایک نئی مہم درپیش ہے۔ یہ مہم ہماری اب تک کی تمام مہموں سے زیادہ خطرناک ہوگی شاہین!" مجاہد اوّل نے بتایا۔ "تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ایک مرتبہ پھر اس خطرناک مہم میں حصہ لے کر آتش سے گزرنا پڑے گا۔"

"ہم تیار ہیں جناب!" میں بولا اور میرے ساتھیوں نے بھی یہی الفاظ دہرائے۔

"یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تم لوگوں کو بلاوجہ مشکلات میں ڈال دیتا ہوں یا یہ کہ تم سے بہتر ہماری صفوں میں کوئی اور

نہیں ہے۔" مجاہد اوّل کی آواز گونجی۔ "بات صرف اتنی ہے کہ میں جلالی میں جلالی ہی کے کسی مجاہد سے کوئی کام لینا نہیں چاہتا۔" میں اس موقع پر کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر مجاہد اوّل بول اٹھا۔ "خاموش رہ کر میری بات توجہ سے سنو! میں تمہارے جذبات سے واقف ہوں۔ میرا مقصد محض یہ ہے کہ یہاں پر اپنی کارروائی کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھو کہ تمہارے شہر میں اگر ضرورت پڑی تو شاید وہاں تیتو میر' قاسم یا کوئی اور سرفروش یہی فرائض انجام دے رہا ہوگا جو تم یہاں انجام دے رہے ہو۔"

"ہمارے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آسکتا کہ آپ ہمیں مشکلات میں ڈال رہے ہیں یا ہم سے بہتر ہمارے ساتھیوں میں کوئی اور نہیں۔" نیپو نے اس مرتبہ ہماری ترجمانی کی۔

"بہرحال۔" مجاہد اوّل بولا۔ "جو مہم تمہیں سونپی جارہی ہے بہت اہم اور اسی اعتبار سے خطرناک بھی ہے۔ اسلحہ ڈپو کی تحقیقات کے لیے علی گڑھ سے کلکٹر یہاں پہنچ چکا ہے۔ پولیس کے اعلیٰ حکام بھی آچکے ہیں۔ مزید جن تین ضلعوں میں ہمارے ساتھیوں نے جو کارروائیاں کی ہیں' ان کی کامیابی کی اطلاع بھی موصول ہو چکی ہے۔ ایک ہی رات اور ایک ہی وقت پر چار جگہ اسلحہ ڈپوز کی تباہی سے حکومت بوکھلا گئی ہے۔ دہلی میں اعلیٰ انگریز افسران کا اجلاس طلب کرلیا گیا ہے جس میں ان واقعات پر غور و خوض کے بعد کوئی لائحہ عمل یا نئی حکمت عملی ترتیب دی جائے گی۔ یہ اجلاس کل ہو رہا ہے فوری طور پر سٹیلے سے انٹیلی جینس کے چار بڑے افسران چاروں ضلعوں میں بھیج دیے گئے ہیں۔ انہی میں سے ایک بڑا افسر جلالی آیا ہے۔ کل رات تمہیں پولیس کے اعلیٰ افسران میں سے کم از کم دو افسروں پر حملہ کرنا ہے۔ یہ کام بہت خطرناک ہے۔ یوں سمجھو کہ تم موت کے منہ میں جارہے ہو!" آخری الفاظ ادا کرکے مجاہد اوّل نے قاسم کی طرف دیکھا "کیوں قاسم ٹھیک کہہ رہا ہوں میں؟"

"بالکل جناب!" قاسم نے تائید کی۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

قاسم کون تھا؟ اس کی اہمیت کیا تھی؟ میں اس وقت اس سے واقف نہیں تھا' لیکن اسے جس انداز میں مجاہد اوّل مخاطب کر رہا تھا' اس سے مجھے محبت اور پسندیدگی کی بجائے غصے اور ناپسندیدگی کا تاثر مل رہا تھا۔ معلوم نہیں واقعی ایسا ہی تھا یا یہ صرف میرا وہم تھا۔

"قاسم! تم کل شام تک ضروری تفصیلات سے شاہین کو آگاہ کردو گے۔" مجاہد اوّل نے کہا۔ "ہماری یہ مہم خطرناک بھی ہے اور اہم بھی! آؤ ہم سب مل کر ایک ساتھ یہ عہد کریں کہ اس سلسلے میں مکمل رازداری سے کام لیں گے۔"

اس کے بعد ہم سب نے حلف اٹھایا۔ مجاہد اوّل نے الماری سے کلامِ پاک نکال کر تخت پر رکھ دیا تھا۔ پھر ہم سب نے کلامِ پاک پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا تھا۔ "ہم سب جو یہاں موجود ہیں' اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے' اللہ کی مدد اور بھروسے پر اس مہم میں حصہ لے رہے ہیں اور ہم اللہ ہی سے نصرت طلب کرتے ہیں۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم مکمل رازداری سے کام لیں گے۔ ہم ایک دوسرے پر اعتماد کریں گے' ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور ایک دوسرے کی حفاظت کریں گے۔ نہ ہم غداری کریں گے نہ غداری کا خیال دل میں لائیں گے۔ اگر ہماری صفوں میں سے کسی نے تنظیم سے غداری کی' مخبری کی اور ہمارے مقاصد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو ہم اسے سخت ترین سزا دیں گے۔ ہم اس سے کوئی رعایت' کوئی نرمی نہیں کریں گے۔ ہم میں سے ہر شخص' غدار کو وہی سزا دے گا جس کا غدار مستحق ہوتا ہے یعنی سزائے موت! اس سے کم سزا غدار کو نہیں دی جائے گی۔ اے اللہ! ہم سب کو اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرما۔ ہمیں بدعہدی سے بچا اور بدعہد پر اپنا قہر نازل کر!"

ہم مکمل رازداری کا عہد کر چکے تھے۔ مجاہد اوّل نے کلامِ پاک کو پھر الماری میں رکھ دیا۔

"اب ہم اطمینان سے اپنی نئی مہم کی طرف بڑھ سکیں گے۔" مجاہد اوّل نے کہا۔ ہم سب اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ قاسم ایک طرف کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ "قاسم!" مجاہد اوّل اس سے مخاطب ہوا۔ "کل شام تک تمہیں تمام معلومات فراہم کردینا ہیں۔" مجاہد اوّل نے ٹہلتے ہوئے کہا۔ "اب تم جاسکتے ہو۔"

اس وقت مجاہد اوّل' قاسم کے قریب ہی تھا۔ مجاہد اوّل کے ہاتھ میں رومال کے دو کونے مضبوطی سے لپٹے ہوئے تھے اور رومال' سانپ کی طرح ہاتھوں کی جنبش کے ساتھ حرکت کر رہا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ عجیب اور پراسرار سا لگ رہا تھا۔

"میں کل شام تک تمام باتیں بتادوں گا۔" قاسم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

قاسم دروازے کی طرف مڑا ہی تھا کہ مجاہد اوّل کے ہاتھوں میں لپٹا ہوا رومال کا سانپ اپنی کنڈلی کھول کر قاسم کی گردن کے گرد لپٹ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجاہد اوّل کے دونوں ہاتھ ریشمی رومال کو لپیٹتے ہوئے قاسم کی گدی پر جم گئے تھے۔ قاسم کی آنکھیں ابل پڑی تھیں اور ہچکیاں حلق سے نیچے ہی گھٹ کر رہ گئی تھیں۔

سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ ہم کچھ سمجھ ہی نہ سکے تھے' لیکن صورت حال ایسی تھی کہ ہم سبھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"یہ ہے ایک غدار کا انجام!" مجاہد اوّل سرد انداز میں بولا۔ اس کے لہجے میں موت کی سی ٹھنڈک تھی۔ ہم سب پر سکوت سا طاری تھا۔ مجاہد اوّل اپنے ہاتھوں کو زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔ ہر جھٹکے کے ساتھ قاسم کے ہاتھ فضا میں ادھر سے ادھر حرکت کر رہے تھے یوں جیسے وہ کچھ پکڑنا چاہتے ہوں۔ اس کا جسم جھٹکے کھا رہا تھا۔ وہ اس بے مہر دنیا کا آخری نظارہ کر رہا تھا۔ اب سے پہلے کبھی یوں میں نے اپنے سامنے کسی شخص کو قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ میرے لیے یہ بڑا عجیب اور سنسنی خیز تجربہ تھا جسے شاید میں الفاظ میں بیان نہ کرسکوں۔ ہم سحر زدہ کیفیت میں سب کچھ دیکھتے رہے۔ میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ قاسم کا بے جان جسم فرش پر گر چکا تھا۔ اس کا چہرہ بگڑ کر انتہائی بھیانک لگ رہا تھا۔

"تم یہی پوچھنا چاہتے تھے نا شاہین کہ پولیس نے کس کی مخبری پر چھاپا مارا تھا؟" مجاہد اوّل نے کہا۔ "جواب تمہارے سامنے ہے۔ یاد رکھو ہر غدار کا تمہارے ہاتھوں یہی انجام ہونا چاہیے! ہمیں ہر قدم پر ان غداروں سے چوکنا رہنا پڑے گا۔"

تیتو میر نے بعد میں مجھے بتایا کہ پہلے روز جن تانگوں کے ذریعے لالہ مرلی دھر کی حویلی سے فرار ہوئے تھے' ان میں سے ایک تانگا قاسم کا تھا اور وہی اپنا تانگا چلا رہا تھا۔

☆☆☆

رات کا اندھیرا سمٹ کر صبح کے اجالے میں سما چکا تھا۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور یہ صبح بڑی سوگوار محسوس ہو رہی تھی۔ میرے اس احساس کی وجہ شاید یہ تھی کہ قاسم کی لاش ایک بنڈل کی صورت میں تانگے کے پائدان پہ پڑی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جو ہماری آنکھوں کے سامنے قتل ہوا تھا۔

"یہ زندہ بھی تھا تو ایک بے جان لاش ہی تھا' چلتی پھرتی لاش!" مجاہد اوّل نے ہم سے کہا تھا۔ "سارا ہندوستان ایسی چلتی پھرتی لاشوں سے بھرا پڑا ہے۔"

اتنا مجھے بھی معلوم تھا کہ قاسم کی موت ہمارے لیے سود مند اور زندگی نقصان دہ تھی۔ اگر وہ زندہ بچ جاتا تو ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ویسے تو اب بھی وہ ہمارے لیے جانے کیا کیا خطرات پیدا کرچکا تھا ہمیں علم نہیں تھا۔ ہمیں تو بس یہ معلوم تھا کہ اس نے ہماری سرگرمیوں کی مخبری کی تھی۔ ہماری تنظیم اور اس کے ارکان میں سے قاسم کس کس سے اور کس حد تک واقف تھا' اس کا علم مجاہد اوّل کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم بھی خطرات کو اپنی طرف بڑھتے محسوس کر رہے تھے۔ اس وقت میں اور نیپو تانگے میں کوتوالی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نیپو تانگا چلا رہا تھا۔ میں اس کے برابر آگے ہی بیٹھا تھا۔ قاسم کی لاش تانگے کے پچھلے حصے میں تھی۔ کوتوالی سے ذرا آگے پہنچ کر ایک درخت کے نیچے نیپو نے تانگا روک لیا۔ سڑک پر ابھی تک آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ نیپو نے گھوڑے کے منہ سے دانے کا تھیلا باندھ دیا۔ تانگے کو ہمیں قاسم کی لاش سمیت یہیں چھوڑ دینا تھا۔ یہ تانگا بھی مرنے والے کا ہی تھا۔ قاسم کی لاش پر ہم نے ایک چٹ لگا دی تھی۔ اس چٹ پر لکھا ہوا تھا "وطن پرستوں کی طرف سے کوتوال شرما کے لیے ایک تحفہ"

کام ختم ہوتے ہی میں نے اپنے جسم پر چادر لپیٹتے ہوئے۔ نیپو کو خدا حافظ کہا اور پھر سڑک عبور کرکے سامنے ہی ایک کچی گلی میں گھس گیا۔

ابھی تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ مجاہد اوّل نے مجھے اور نیپو کو اس کام کے لیے کیوں منتخب کیا تھا! ہمارے اندازے کے مطابق پولیس کو چند اجنبیوں کی تلاش تھی۔ لگتا یہی تھا کہ کوتوال شرما کو لالہ مرلی دھر کی بیٹیوں کے اغوا کے سلسلے میں ہماری تلاش تھی۔ اس تلاش کا کوئی تعلق اسلحہ ڈپو کی تباہی سے معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی ان حالات میں دو اجنبیوں کا' جلالی کے باشندے قاسم کے تانگے میں ایک لاش کے ساتھ جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس کے باوجود ہم نے بلا تامل یہ خطرناک ذمے داری قبول کرلی تھی کیوں کہ ہمیں یقین تھا کہ مجاہد اوّل نے بلا سبب ایسا نہیں کیا ہوگا۔ احتیاط کے طور پر ہمیں ایک نئی شناخت بھی دے دی گئی تھی۔ مجاہد اوّل نے ہم سے کہا تھا کہ اگر کسی مرحلے پر پوچھ گچھ ہو تو ہم یہی بتائیں کہ حسین نقوی صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں' ان کے مہمان ہیں۔ نقوی صاحب کون تھے' ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ہمیں ابھی یہ حوالہ دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ ہاں ہمیں یہ ضرور معلوم تھا کہ جلالی میں سادات کی اکثریت ہے اور نقوی صاحب بھی ان ہی میں سے ہوسکتے تھے۔

مختلف کچی پکی گلیوں میں سے گزرتا ہوا میں اپنی منزل کی

طرف بڑھ رہا تھا۔ صبح کا اجالا اب پہلے کی نسبت اور پھیل گیا تھا۔ زندگی اب انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگی تھی۔ گھروں کے دروازے کھلنے لگے تھے اور چہل پہل بھی نظر آنے لگی تھی۔ مکانوں سے بچوں اور بڑوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ دکانیں بھی کھل رہی تھیں اور ان تمام آوازوں میں ایک تیزی اور سکون تھا۔ ایک گلی سے گزرتے ہوئے مجھے ایک حلوے پراٹھے والے کے گرد لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ اس نے انگیٹھی پر حلوے کا تھال جما رکھا تھا اور موڑھی پر پراٹھوں کی ٹوکری رکھی ہوئی تھی۔ میں اس کے قریب سے گزر کر تیز تیز قدم اٹھاتا آگے سے مڑ کر ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ اسی وقت مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے تعاقب میں ہے۔ میں نے اپنی رفتار بڑھا دی، مگر ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ مجھے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اسی کے ساتھ میں نے ایک آشنا آواز بھی سنی۔ مجھ سے وہ کہہ رہا تھا۔ "جوپال جی! اس طرح منہ چھپائے کہاں جا رہے ہو؟"

میری رگوں میں جیسے خون جمنے لگا۔ یہ آواز لالہ علی دھر کے نوجوان بھتیجے جوگیندر کی تھی۔ یقیناً اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میرا تعارف اس سے اسی نام سے ہوا تھا۔ میں نے تو اپنا نام جوپال ہی بتایا تھا اور خود کو بنارس ہندو یونیورسٹی کا طالب علم ظاہر کیا تھا۔ پلٹ کر جوگیندر کو جواب دینے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا مگر اسی عرصے میں اس پوری گلی کا میں نے ایک ہی نظر میں جائزہ لے لیا تھا۔ یہ ایک پتلی گلی تھی جو چالیس پچاس گز کے بعد ایک چوڑی سڑک پر جا نکلتی تھی۔ مجھے اس سڑک کو عبور کرکے ایک گلی میں داخل ہونا تھا اور پھر کئی گلیوں سے گزر کر اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔ منزل پر پہنچنے کے لیے دانستہ میں نے طویل راستہ اختیار کیا تھا۔ گلی میرے لیے جو بے وطن بن گئی تھی جس میں مجھے جوگیندر نے گھیر لیا تھا۔ وہاں بھی خاصی رونق تھی۔ گلی میں کئی گھروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے جن کے چبوتروں اور سیڑھیوں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ منہ ہاتھ دھو رہے تھے اور داتن چبا رہے تھے۔ قصبوں اور دیہات میں عموماً یہ معمول گھروں کے باہر ہوتے ہیں۔

"جی فرمایئے!" صورت حال کا جائزہ لے کر میں نے جوگیندر سے کہا۔ پھر میں نے اپنے لہجے میں حیرت پیدا کرتے ہوئے جو کہا۔ "میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"آپ نے نہیں پہچانا جوپال جی! تو کیا ہوا! میں تو آپ کو پہچان گیا ہوں!" جوگیندر کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"یقیناً آپ کو دھوکا ہوا ہے، میرا نام جوپال نہیں ہے۔" میں حتی الامکان پرسکون آواز میں بولا۔

"رات ہی کو تو چاچا علی دھر کی حویلی میں ہماری ملاقات ہوئی ہے جوپال جی! آپ نے بتایا تھا کہ آپ سیٹھ مینش کے مہمان ہیں!" جوگیندر میری بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ شاید اندازہ لگا چکا تھا کہ میں اس گلی سے فرار نہیں ہو سکتا۔ وہ دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا اور ابھی تک اس نے لوگوں کو اپنی مدد کے لیے نہیں پکارا تھا۔ یہ امر میرے لیے تسلی بخش تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانا چاہا کہ اسے دھوکا ہوا ہے۔ مگر ظاہر ہے وہ کہاں ماننے والا تھا۔ "اور تم جھوٹ بول رہے ہو!"

"میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میرا نام جوپال نہیں ہے۔" اس مرتبہ میں کچھ گرم ہو گیا۔

"تمہارا نام جو بھی ہو، میں تمہیں نہیں بھول سکتا۔ تم نے میرے چاچا لالہ علی دھر کو کنویں میں اتارا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہی نے رادھا اور ساوتری کو بھی اغوا کیا تھا۔ زیادہ بننے کی کوشش مت کرو! یہ نہ بھولو کہ میں اسی وقت تمہیں پکڑوا بھی سکتا ہوں ورنہ سیدھی طرح میرے ساتھ ساتھ چلو!" یہ کہتے ہی اس نے میری کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ "تمہیں میرا ایک کام کرنا پڑے گا! بولو چلتے ہو کہ نہیں؟" اس کے سوال کے جواب میں دھمکی بھی شامل تھی۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں کروں تو کیا کروں! اس سے کس طرح جان چھڑاؤں؟ فرار ہونے کی کوشش کرتا تو وہ شور مچا کر مجھے پکڑوا سکتا تھا۔

"تم مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتے ہو؟" اس سے یہ سوال میں نے محض وقت گزاری کے لیے کیا تھا۔

"اپنے گھر۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے زہر لگ رہی تھی۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تاج منڈی کے پاس۔" اس نے مجھے بتایا۔

"مگر تم مجھے اپنے گھر کیوں لے جانا چاہتے ہو؟" میں نے پھر سوال کیا حالانکہ یہ سوال بے مقصد ہی تھا۔ "مجھے جلدی ایک جگہ پہنچنا ہے۔"

"بلاوجہ بحث نہ کرو شاہین!" اس نے مجھے تنظیم کے شناختی نام سے مخاطب کیا۔ یہ بات میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔

"کیا؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"ویسے بھی میں کل رات تمہاری اداکاری کا قائل ہو چکا ہوں۔" جوگیندر کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔ "یقیناً تم

اس وقت ٹیپو میر، حیدر علی اور کیا نام ہے اس کا ہاں یاد آیا سراج الدولہ کے پاس جا رہے ہو گے!"

میں گم صم سا ہو کر رہ گیا۔ شدید حیرت نے میری قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید جوگیندر بھی ہماری ہی خفیہ تنظیم کا ایک کارکن ہے۔ وہ ہم ہی میں سے ہے مگر میرے مشاہدے کے مطابق ایسا ممکن نہیں تھا۔ ابھی تک تنظیم کے جتنے افراد بھی میرے سامنے آئے تھے ان میں سے کوئی بھی ہندو نہیں تھا۔ پھر یہ کہ عموماً مجاہد اول ہم ساتھیوں کو مجاہدو اور اسلام کے سپاہیو کے نام سے مخاطب کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ کبھی اس نے واضح طور پر یا اشارتاً کوئی ایسی بات نہیں کی تھی کہ تنظیم میں کوئی ہندو شامل نہیں ہو سکتا۔ یہی سوچ کر میں نے چاہا تھا کہ جوگیندر سے تنظیم کا شناختی جملہ کہوں۔

لیکن اسی لیے جوگیندر نے میری کلائی پر گرفت سخت کرتے ہوئے کہا۔ "بولو شاہین! چل رہے ہو یا کرادوں گرفتار؟ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے ایک بات اور بتا دوں کہ کئی سروں کے مینار ہمارے لیے منزل کا نشان ہیں۔"

جوگیندر کے ادا کیے ہوئے آخری الفاظ میرے لیے حیرت انگیز صدمے کا سبب تھے۔ وہ یقیناً بہت کچھ جانتا تھا۔ اس وقت جوگیندر سے الجھنا یا اس کی بات نہ ماننا تنظیم کے لیے نقصان دہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے انداز سے یہ بات ظاہر تھی کہ اگر میں نے اس کا کہنا نہ مانا تو وہ مجھے گرفتار کرا دے گا۔ اس کے کہے ہوئے آخری الفاظ سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ ہماری تنظیم کا رکن نہیں ہے۔ میں نے اچھا ہی کیا تھا کہ شناختی جملہ نہیں کہا تھا ورنہ جواباً وہ یہی الفاظ دہراتا اور میں دھوکا کھا جاتا۔ اگر وہ واقعی ہماری تنظیم کا رکن ہوتا تو وہی بلوچی کہاوت دہراتا جو یہ تھی کہ جو سال بھی گزرتا ہے، سروں کے مینار بناتا ہوا گزرتا ہے۔ اسے جوابی شناختی جملہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں نے ان تمام باتوں پر غور کیا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "چلو!" اس نے میری کلائی چھوڑ دی، مگر میری طرف سے وہ چوکنا ہی تھا۔ میں بہر حال گرفتار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ راستے میں اس نے مجھ سے کچھ ایسی باتیں کیں کہ مجھے یقین ہو گیا کہ میری طرف سے اس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ وہ بہر حال میرا دشمن نہیں تھا۔

☆☆☆

جلالی کے محلہ نصیر میں سید حیدر عباس صاحب کے گھر پر اسی روز شام کے وقت قصبے کے سرکردہ ہندو اور مسلمان لیڈروں اور اہم شخصیات کا اجتماع ہو رہا تھا۔ اس میں مجاہد اول کی سفارش پر مسلم کانفرنس کے ایک مندوب کی حیثیت سے میں بھی شریک تھا۔ یہ کانفرنس انہی دنوں دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔ وہاں پہنچنے والوں میں سے ایک شخص میں ہی تھا۔ بطور احتیاط میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی کلائی میں پٹی باندھ لی تھی۔

حیدر عباس صاحب نے میرا بڑا پرجوش استقبال کیا تھا اور پھر دیوان خانے میں لا کر بٹھا دیا تھا۔ فرش پر سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میرے بعد وہاں پہنچنے والا جوگیندر تھا۔ اس کی بہن سیتا بھی اس کے ساتھ تھی۔ حیدر عباس صاحب نے بڑھ کر ان دونوں کا بڑی محبت سے استقبال کیا۔

"ارے ہماری بٹیا سیتا بھی آئی ہے!" حیدر عباس صاحب نے کہا۔

"سلام چاچا!" سیتا نے جھک کر ادب سے انہیں سلام کیا۔

حیدر صاحب نے سیتا کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعائیں دیں اور گھر کے اندر لے گئے۔ "ارے سنتی ہو!" میں نے حیدر صاحب کی آواز سنی۔ "یہ سیتا بٹیا آئی ہے۔" یہ تعلقات صدیوں کے ہندو مسلم میل جول کا نتیجہ تھے جنہیں بعض سیاست دانوں نے مصلحتوں اور خود غرضی کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

جوگیندر اس اجلاس میں اپنے باپ موہن لال کی جگہ شرکت کر رہا تھا۔ موہن لال ان دنوں کلکتے گیا ہوا تھا۔ ہر چند کے موہن لال، لالہ علی دھر کا سگا بھائی تھا مگر اپنے خیالات و نظریات میں علی دھر سے بالکل مختلف تھا۔ دونوں بھائیوں میں اسی وجہ سے اختلاف تھا۔

حقیقتاً یہ اجلاس جوگیندر ہی کی اطلاع کی بنا پر ہو رہا تھا۔ اس نے آج صبح مجھے اپنے گھر لے جا کر جو کچھ بتایا تھا اس کے بعد یہ اجلاس ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا "جلالی میں ابھی مذہبی جنون زیادہ نہیں بڑھا ہے۔ لوگوں کے درمیان ابھی پرانے تعلقات کمزور نہیں پڑے ہیں۔ سیٹھ مینش ایسے لوگوں کو وہ یقیناً یہاں ہندو مسلم فساد برپا نہیں کرنے دیں گے۔ یہاں کے رہنے والے کبھی یہ نہیں چاہیں گے کہ لوگ مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے کا خون بہائیں، ان کے گھروں کو نذر آتش کریں، معصوم بچوں کو نیزوں پر چڑھائیں اور عورتوں کو بے حرمت کریں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں پہلے ہی اس خطرے سے آگاہ کر دیا جائے۔"

شدھی تحریک کے ردعمل میں کچھ عرصے قبل آگرہ اور کتار پور میں ایسے ہی اندوہناک ہندو مسلم فسادات ہوئے تھے۔ جوگیندر نے انہی کی تصویر کھینچی تھی۔

میرے سیدھے ہاتھ کی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی دیکھ کر جوگیندر ہنسا تھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہین کو اب نہیں پہچانا جاسکے گا۔" اس نے سرگوشی کی تھی۔ جواباً میں نے محبت سے اس کی کمر تھپک دی۔ پھر وہ بولا۔ "تم نے اچھا کیا۔ کوتوال شرما تمہاری گرفتاری کے لیے بولایا ہوا کتا بن گیا ہے۔ جہاں بھی اسے تمہارے ملنے کا شک شبہ ہوتا ہے' چڑھ دوڑتا ہے۔ ویسے دوست' تمہارا چہرہ بہت دھوکے باز ہے! کوئی بھی تمہیں دیکھ کر یہ شبہ نہیں کرسکتا کہ تم اتنی خطرناک شخصیت کے مالک ہوگے۔" ہم دونوں ساتھ ساتھ ہی ایک گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے تھے۔ وہ اب مجھ سے جلالی کے قریب ایک عمارت کی تباہی اور دھماکوں کا ذکر کر رہا تھا۔ پھر ہم زیادہ باتیں نہیں کرسکے۔ لوگوں کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ سب سے آخر میں آنے والا پنڈت گردھاری لل تھا۔ جوگیندر ہر آنے والے کے بارے میں مجھے بتا رہا تھا۔ اس نے پنڈت جی کی آمد پر میری طرف جھک کر سرگوشی کی۔ "یہ بہت بدبودار شخص ہے۔"

پنڈت گردھاری لل عجیب کینڈے اور نرالی شان کا آدمی تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں' باہر کو ابلی ہوئی سی بڑی بڑی آنکھیں' گنجے سر پر لہراتی ہوئی چوٹی' سفید ململ کا کرتہ' سفید دھوتی اور آواز میں گرج' یہ تھا پنڈت گردھاری لل! حیدر صاحب نے بڑی خندہ پیشانی سے پنڈت جی کا استقبال کیا تھا۔

پنڈت جی نے اپنی مخصوص آواز میں کہا۔ "اور میر صاحب' آج ہم غلاموں کو کیسے یاد کرلیا؟"

"ارے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں پنڈت جی!" حیدر صاحب انکسار سے بولے۔

"دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے میر صاحب!" پنڈت گردھاری لل نے کہا۔ "اور ہمیں تو تم لوگ آٹھ سو برس سے جلاتے آرہے ہو!" پنڈت جی کے لہجے سے واقعی جلے ہوئے دودھ کی بو آرہی تھی۔

اس مرتبہ جواب میں حیدر صاحب کچھ نہ بولے پنڈت گردھاری لل' ملکھان سنگھ کے پاس بیٹھ چکا تھا۔ اس کے بعد دروازے بند کردیے گئے۔ شاید اب کسی کو نہیں آنا تھا۔ حیدر صاحب' میرے' اور جوگیندر سمیت اس اجتماع میں گیارہ افراد شریک تھے۔ ان میں جوگیندر سمیت چھ ہندو تھے۔ یہ دور تھا جب ہندوؤں کے ایک مخصوص ٹولے کو چھوڑ کر ہندو مسلم اتحاد پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ برطانوی حکومت اشارے پر بعض متعصب عناصر اس اتحاد کو ختم کرانے لیے الزامات اور جھوٹ کے سہارے ہندوؤں اور مسلما میں بے اعتمادی پھیلا رہے تھے' اس کے باوجود ہندو مسلمان اکثر ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہوجاتے تھے۔ خلافت حالانکہ پورے طور پر صرف مسلمانوں کا مسئلہ تھا ہندو بھی اس تحریک میں جوش و خروش سے حصہ لے تھے۔ ہندو لیڈر گاندھی جی بھی اکثر تحریک خلافت اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کانگریس سے تعاون و اشتراک کا مظاہرہ کرتے رہتے مولانا جوہر کانگریس کے جلسوں میں تقریریں بھی کرتے دوسری طرف گاندھی جی نے ہندوستان کی آزادی کے پروگرام دیا تھا' مسلمان اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ تھے۔ یہ وہ سال تھا جسے گاندھی جی نے سوراج کا سال تھا اور سارے ہندوستان کو یہ نوید دی تھی کہ اس سال آخر تک ہندوستان کو سوراج مل جائے گا۔ اسی مقص حصول کی خاطر انہوں نے کانگریس کو ہدایت کی تھی کہ سال تک تین ماہ کے عرصے میں ایک کروڑ روپے جمع جائیں' کانگریس کے ایک کروڑ ممبر بنائے جائیں اور بیس چرخے چلانے کا انتظام کیا جائے۔ اسی کے ساتھ گاند کی طرف سے ترک موالات کی مہم بھی جاری ہندوستان کے مسلمان تحریک خلافت کے ساتھ ساتھ جی کی طرف سے چلائی جانے والی ان تمام مہمات میں خروش سے حصہ لے رہے تھے۔

اجلاس باقاعدگی سے شروع ہوچکا تھا۔ حیدر صاحب صدر مجلس تھے۔ انہوں نے اس اجتماع کی غایت بیان کرنے سے پہلے ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط بنا اس کے فوائد پر روشنی ڈالی' پھر کہا "بھائیو! آج میں کو ایک اہم معاملے پر غور کرنے کے لیے زحمت دی لوگ ہمہ تن گوش ہوگئے "یہ ہم سب کا مشترکہ مسئلہ ہندوؤں کا بھی' مسلمانوں کا بھی! جلالی میں رہنے والے شخص کا مسئلہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ۔۔۔"

"بس کرو میر صاحب!" پنڈت گردھاری لل نے صاحب کی بات کاٹ دی۔ "اب ہم ان چکنی چپڑی باتوں نہیں آئیں گے۔" محفل پر سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص گردھاری لل کی طرف متوجہ تھا۔ جوگیندر نے میرا دبایا۔ گردھاری کے جملے میں جو تلخی تھی' لہجے کی رعونت دو آتشہ ہوگئی تھی۔

"پنڈت جی!" حیدر صاحب بولے۔ "آپ یہ انگارے کیوں چبا رہے ہیں! پہلے میری پوری بات تو سن لیتے۔"

"یہ انگارے چبانے کی بات نہیں ہے میر صاحب!" پنڈت کے لہجے میں تلخی اور بڑھ گئی۔ "کان کھول کر سن لو' جلالی کا کوئی ہندو' تحریک خلافت کا ساتھ نہیں دے گا!"

"سارے ہندوؤں کو بدنام نہ کرو پنڈت جی!" جوگیندر بول اٹھا۔

پنڈت گردھاری لل نے اپنی بڑی بڑی گول آنکھوں سے جوگیندر کو گھورا۔ "تو چپ رہ موہن لال کے پوت!"

"جوگیندر نے ٹھیک کہا ہے۔" ملکھان سنگھ نے کہا۔ "ہاں میر صاحب! آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"نہیں ملکھان سنگھ جی!" اس مرتبہ سیٹھ رگھو ویر نے مداخلت کی۔ "پہلے پنڈت جی کو اپنی بات پوری کرلینے دو۔ ہاں پنڈت جی!"

"میں پہلے ایک بات آپ حضرات پر واضح کردوں۔" حیدر صاحب نے کہا۔ "میں نے آپ حضرات کو تحریک خلافت میں شرکت کرنے کے لیے نہیں بلایا۔ اگر اس محفل کا کوئی تعلق بھی تحریک خلافت سے ہوتا تو میں پنڈت جی اور رگھو ویر کو ہرگز یہاں مدعو نہ کرتا۔ یہاں موجود تمام ہی افراد جانتے ہیں کہ تحریک خلافت کے سلسلے میں ان دونوں حضرات کو کبھی زحمت نہیں دی گئی۔" حیدر صاحب نے قدرے توقف کیا۔ ان کے چہرے پر ناگواری تھی۔ "میں نے آپ لوگوں کو صرف اور صرف جلالی کے ایک مسئلے پر غور کرنے کے لیے بلایا ہے۔"

"میر صاحب!" پنڈت گردھاری لل ترخ کر بولا۔ "تم لوگ آٹھ سو برس سے ہمیں اسی طرح الو بنا رہے ہو۔ مختلف حیلے بہانوں سے تم نے ہمیں غلام بنا رکھا ہے۔ اب تم لوگ پھر نیا جال پھیلا رہے ہو! مولانا جوہر نے گاندھی ایسے مخلص کو الو کا گوشت کھلا دیا ہے۔ وہ خلافت کی ڈگڈگی بجائے جارہے ہیں۔"

"پنڈت جی!" ملکھان سنگھ نے بلند آواز میں تنبیہہ کی۔ "زبان سنبھال کے بات کرو! مولانا جوہر کے بارے میں تمہیں ایسے الفاظ نہیں کہنا چاہئیں ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟" سیٹھ رگھو ویر درمیان میں بول اٹھا۔

"کیوں بات نہ کریں جی!" پنڈت گردھاری لل نے قہر آلود انداز میں ملکھان سنگھ کو گھور کر دیکھا۔ "ملکھان سنگھ جی! تم سے لوگ سر پکڑ کر روئیں گے ایک دن! تم ان لوگوں کی چالوں کو نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ بڑے پاپی ہیں۔"

"پنڈت جی!" اس مرتبہ ڈاکٹر بشن چند بولا۔ "بڑے شرم کی بات ہے۔ کم از کم اتنا ہی خیال کرلیتے کہ آپ یہاں مہمان ہیں۔"

"تم لوگوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔" گردھاری لل نے کہا۔ "پائنیر اخبار پڑھا کرو ڈاکٹر! مالویہ' سردار اور سوامی آننگر کی باتوں کو غور سے سنا کرو! سنو ڈاکٹر کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں! پھر تم کو معلوم ہوگا کہ ہمارے خلاف یہ مسلمان سازشیں کر رہے ہیں! یہ لوگ انگریزوں کو یہاں سے نکالنے کے لیے ہماری مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ افغانستان کا حکمراں سردار امان اللہ ہندوستان پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے تاکہ ایک بار پھر ہندوستان میں مسلمانوں کا راج قائم ہوجائے۔ معلوم ہے پھر کیا ہوگا ڈاکٹر' اگر راج پاٹ مسلمانوں کو مل گیا؟ پھر یہی محمد علی جوہر تمہاری گردن کاٹے گا۔"

اب مجھ سے خاموش نہیں رہا گیا۔ "پنڈت جی!" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "آپ نے مولانا جوہر پر جو الزامات لگائے ہیں' مولانا اپنی گرفتاری سے پہلے ان کے جواب دے چکے ہیں پائنیر اخبار کی بات نہ کریں! وہ انگریزوں کا کاسہ لیس ہے۔ اگر ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو' ایک کروڑ افغانیوں اور سات کروڑ ہندوستانی مسلمانوں سے اتنا ڈرتے ہیں تو پھر ہندوؤں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں پنڈت جی! آپ نے جو باتیں کی ہیں' انگریزوں کے پٹھو ایسی باتیں کرتے ہیں۔"

میں کچھ اور بھی کہتا کہ پنڈت گردھاری لل بول اٹھا۔ "یہ کون ہے میر صاحب؟" اس کا لہجہ تلخ تھا۔ "کل کے اس چھوکرے سے تم میرا اپمان (توہین) کرا رہے ہو! یہ ہمارے نیتاؤں (رہنماؤں) کو انگریزوں کا پٹھو کہتا ہے۔ ارے تو کیا جھوٹ صرف ہندو کہتے ہیں اور سچ بولنے والے بس مسلمان ہی ہیں!"

حیدر صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ "یہ دہلی کی مسلم کانفرنس میں مندوب کی حیثیت سے شریک تھے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "شاکر بیٹے! تم خاموش رہو۔" انہوں نے مجھے میرے ایک نئے فرضی نام سے مخاطب کیا تھا۔ انہیں میرا یہی نام بتایا گیا تھا۔

"سنا ڈاکٹر صاحب!" سیٹھ رگھو ویر نے کہا۔ "پنڈت جی کی بات دھیان سے سنو!" رگھو ویر ایسا شخص معلوم ہوتا تھا جو لوگوں کو آپس میں لڑانے کے ماہر ہوتے ہیں۔

"ہمیں اگر اس دیش میں رہنا ہے تو پھر مسلمانوں کے پھیلائے ہوئے جال سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ یہ لوگ ہمارے

وہ مجھے خوفزدہ کرنا چاہتا تھا۔ میں اور جوگیندر بیٹھک میں تھے اور سیتا ہمارے لیے ناشتے کا بندوبست کر رہی تھی۔ میں نے منع بھی کیا مگر جوگیندر نہیں مانا۔ "میں جانتا ہوں ابھی تم نے ناشتا نہیں کیا۔" کچھ توقف کے بعد جوگیندر نے پھر کہا۔ "معلوم ہے گزشتہ رات تمہارے جانے کے بعد کیا ہوا؟"

میں جواب میں کچھ نہ بولا۔ جوگیندر کے انداز گفتگو سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا دل میری طرف سے صاف ہے مگر میں محتاط اور چوکنا تھا۔ اس احتیاط کا سبب وہ حالات تھے جن سے میں گزر رہا تھا۔ ان حالات میں کسی پر اعتماد کرنا میرے لیے شدید خطرے کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ جوگیندر بہرحال لالہ مرلی دھر کا بھتیجا تھا۔ رادھا اور ساوتری جنہیں میں نے اغوا کیا تھا اس کی چچا زاد تھیں۔ حالات و واقعات کا تقاضا تو یہی تھا کہ جوگیندر مجھے پولیس کے حوالے کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس کا رویہ میرے لیے ناقابل فہم تھا۔

میرے چہرے سے جوگیندر نے شاید میری بے چینی کا سراغ لگایا اور بولا۔ "مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی تک تم خود کو خطرے میں محسوس کر رہے ہو۔ یقین کرو کہ تم خطرے میں نہیں ہو۔ میں تمہیں گرفتار نہیں کراؤں گا۔ اس بات پر تمہیں اس وقت یقین آئے گا جب تم یہاں سے اٹھو گے۔" ذرا توقف کے بعد اس نے پھر کہا۔ "مجھے دراصل تم سے ایک کام ہے۔"

"مگر بتاؤ تو سہی کہ وہ کام ہے کیا؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"اس کام کے متعلق میں تمہیں اپنی بہن سیتا ہی کے سامنے بتاؤں گا۔ فی الحال تم اپنے ذہن سے ہر خطرے کو جھٹک کر میری بات سنو!"

ظاہر ہے کہ خواہ مخواہ پریشان ہونے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے اپنے اضطراب پر قابو پاتے ہوئے کہا "ہاں کہو میں تمہاری بات توجہ سے سن رہا ہوں۔"

"جب تم حویلی سے چلے آئے تو سیٹھ مہیش کے بھیجے ہوئے آدمی وہاں پہنچ گئے۔" جوگیندر بتانے لگا۔ "انہی کی وجہ سے ہمیں رہائی ملی۔ چاچا جی کو بھی کنویں سے انہوں نے ہی باہر نکالا تھا۔ اس کے بعد کوتوالی میں اس واقعے کی خبر کی گئی اور پھر کوتوال شرما کو تلاش کر لیا گیا۔"

جوگیندر مجھے بتا رہا تھا کہ اس واقعے کے تقریباً ایک ہی گھنٹے بعد رادھا اور ساوتری واپس حویلی پہنچ گئی تھیں۔ کوتوال شرما بھی اس وقت تک حویلی آ چکا تھا۔ اس نے رادھا اور ساوتری کے بیانات لیے' ان سے سوالات کیے اور فوراً ہی وہاں سے چلا گیا۔ "کوئی دو گھنٹے کے بعد کوتوال حویلی آ کر رادھا اور ساوتری کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں بھی ان دونوں کے ساتھ گیا تھا۔ ان دونوں سے کوتوال اس مکان کی شناخت کرانا چاہتا تھا جہاں اغوا کے بعد انہیں رکھا گیا تھا۔ مکان تو وہ نہیں پہچان سکیں البتہ اس کمرے کی شناخت کر لیا جہاں ان دونوں کو پہلی رات ٹھہرایا گیا تھا۔"

میں نے جوگیندر کی پوری بات سن کر بڑے اطمینان سے کہا۔ "میں سمجھ نہیں سکا کہ تم نے مجھے یہ ساری روداد کیوں سنائی ہے! نہ میں ہردیال ہوں اور نہ شاہین! میرا نام تو ... ہے اور میں حسین نقوی صاحب کا مہمان ہوں۔"

"شاید تم اسی لیے میرے ساتھ خاموشی کے ساتھ آئے کہ میں تمہیں پکڑوا نہ دوں!" جوگیندر بولا "مجھے ... ہے کہ تم ایسے لوگوں کے لیے ناموں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ویسے شاہین صاحب یا ہردیال جی یا مقیم صاحب نے ان تینوں شخصیتوں کو زخم کے اس واضح نشان سے ... ہے جو تمہاری سیدھی کلائی کے پنچے پر ہے۔ بچپن کی چوٹ کا شاید یہ نشان ہے۔ رادھا اور ساوتری نے اغوا کی روداد سناتے ہوئے وہ نام بتائے تھے جن سے تم ایک دوسرے کو مخاطب کر رہے تھے۔ یہ سارے ہی نام پہلی بار سن کر میں سمجھ گیا تھا کہ فرضی ہیں۔ یہ سب نام آزادی کے ان مجاہدین کے ہیں جنہوں نے انگریزوں سے ٹکر لی تھی۔ انہی دونوں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ جس کو شاہین کہہ کر پکارا جا رہا تھا اس کی دائیں کلائی کے پنچے پر زخم کا بیٹا سا واضح نشان ہے۔ اس کے بعد ہی میرے لیے اس نتیجے پر پہنچنا آسان ہو گیا کہ ہردیال اور شاہین ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔" جوگیندر نے میری طرف مسکرا کر دیکھا' پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "اب کلائی چھپانے سے کیا فائدہ! میں نے ابھی تک کوتوال شرما یا کسی کو یہ بات نہیں بتائی۔ میرا خیال ہے کہ ابھی اس راز سے سیتا اور میرے سوا کوئی واقف نہیں ہے۔ جوگیندر ہی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ دونوں بہنوں نے یہ بھی بتایا تھا' ہم آپس میں ایک دوسرے کی شناخت کے مخصوص جملے ادا کرتے ہیں۔ یہ اندازہ انہوں نے اس وقت لگایا تھا جب انہیں اغوا کیا گیا تھا۔ شمبو پر حملہ کرنے والے نے کوئی جملہ کہا تھا مگر وہ انہیں یاد نہیں رہا تھا البتہ جو جملہ میں نے دیا تھا ان کے ذہن میں رہ گیا تھا "اب کہو کیا اب بھی تم تمام باتوں کی تردید کرتے رہو گے؟" جوگیندر آخر میں بولا۔

انکار کی اب گنجائش نہیں رہ گئی تھی اس لیے میں نے صرف اتنا کہا "ٹھیک ہے۔"

"تمہارا دل شاید ابھی تک پوری طرح میری طرف سے صاف نہیں ہے۔ تم میری طرف سے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔" جوگیندر بولا۔

اسی وقت سیتا ناشتا لے کر آ گئی اور ہم سب نے ساتھ ہی ناشتا کیا۔ ان کے رویے اور حسن سلوک سے میرے دل میں پیدا ہونے والے خدشات بڑی حد تک ختم ہو گئے تھے۔ جوگیندر نے مجھے بتایا کہ رادھا تمہاری شرافت اور اخلاق کا اعتراف کر رہی تھی۔ اس پر اسے چاچا مرلی دھر اور چاچی کی ڈانٹ بھی سننا پڑی تھی۔

اب یہ بات کھل ہی گئی تھی کہ رادھا اور ساوتری کو اغوا میں نے ہی کیا تھا تو اس اغوا کا سبب بیان کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ میں اسی لیے انہیں بتانے لگا۔

"رادھا اور ساوتری کو اغوا کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کے باپ لالہ مرلی دھر کو یہ احساس ہو سکے' کسی کی بہن یا بیٹی کو اغوا کرانے سے والدین اور گھر والوں کے دل پر کیا گزرتی ہے! اور یہ کہ اغوا کرانا یا کرنا کس قدر ذلیل حرکت ہے! ہماری نیت صاف تھی اسی لیے ہم نے لالہ مرلی دھر کی طرح ان دونوں کی آبرو سے کھیلنا نہیں چاہا تھا' ان کی پاک دامنی پر اپنی ہوس کا داغ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔" یہ کہنے کے بعد میں اصل مقصد پر آ گیا۔ "تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"یہ تو ہم تمہیں بعد میں بتائیں گے' پہلے اپنے بارے میں بتانا چاہتے ہیں کہ ہم کیا ہیں!" سیتا نے کہا۔

"تم سیتا ہو اور یہ تمہارا بھائی جوگیندر ہے۔ تم موہن لال جی کی اولاد ہو اور لالہ مرلی دھر تمہارا چچا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کچھ بتانے کو رہ جاتا ہے!" میں بولا۔

"مگر ہم سیتا اور جوگیندر کے علاوہ بھی کچھ ہیں۔ جس طرح تم ہردیال' شاہین اور مقیم کے علاوہ بھی کچھ اور ہو۔" جوگیندر نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا۔

"ہاں ہم کچھ اور بھی ہیں۔" اس مرتبہ سیتا بولی۔ "میرا بھائی جوگیندر مانا کہ مرلی دھر کا بھتیجا ہے' مگر اسی نے اپنے چاچا کے پاپ کی معافی دھنساری جا کر خیر محمد سے مانگی تھی اور اسے اس کی بہن کے کنویں میں ڈوب کر جان دینے کی بھی اطلاع دی تھی۔"

یہ بات میرے لیے واقعی حیران کن تھی۔ پھر بھی میں نے کہا۔ "مگر خیر محمد کو اس معافی سے کیا ملا؟ اس کی بہن تو اسے نہیں مل سکی!"

"انسان کے جذبات کو سود و زیاں کی ترازو میں نہیں تولا جا سکتا۔ جوگیندر کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "یہ تم نے نقصان فائدے کی کیا بات کی! اگر تم نفع نقصان ہی کی بات کر رہے تو پھر یہ بتاؤ کہ اس سے مجھے کیا فائدہ ہوا؟" اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔ "مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی کہ تم ایسی کوئی بات کہو گے! میں اگر تم سے یہ پوچھوں کہ رادھا اور ساوتری کے اغوا سے کیا خیر محمد کو اس کی بہن واپس مل گئی؟ تو بولو' تم اس سوال کا کیا جواب دو گے؟"

اس بات کا اب مجھے بھی احساس ہو گیا تھا کہ میری بات سے جوگیندر کو دکھ پہنچا ہے اسی لیے میں نے کہا "معاف کرنا جوگیندر' میرا مقصد تمہاری دل آزاری نہیں تھا۔"

"صدیوں سے جو لوگ اس دیش میں پیار و محبت سے رہ رہے ہیں' میری کوشش بھی یہی تھی کہ ان کے درمیان نفرتوں کی فصل نہ بوئی جائے۔ ایسا کرتے ہوئے میرے سامنے اپنا نفع یا نقصان نہیں تھا۔ میں نے تو نیکی اور بھلائی کی خاطر یہ قدم اٹھایا تھا۔" جوگیندر کی آواز سے اس کے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں دوست!" یہ کہہ کر میں نے اسے گلے لگا لیا۔ "معاف کر دو مجھے میرے دوست!"

جوگیندر نے دوستانہ انداز میں میرے شانے پر تھپکی دی' پھر بولا۔ "مجھے تمہاری دوستی ہی کی ضرورت ہے۔ بولو دوستی نبھاؤ گے؟"

"یقیناً!" میری آواز میں عزم تھا۔ "میں دوستی نبھاؤں گا مگر پہلے تم یہ بتاؤ کہ مجھے معاف کر دیا یا نہیں؟"

"معاف کر دیا نا دوست! بھگوان کی سوگند (قسم) اللہ کی قسم اور انسان کی قسم" اس کے لہجے میں بڑا کھرا پن اور سچائی تھی۔ دوستی' خلوص' محبت اور اعتماد کی نرم و گرم فضا ہمارے درمیان قائم ہو گئی تھی۔ ہم تینوں اسی رشتے میں بندھ گئے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں' ایک دوسرے کے دکھ سکھ اور خوابوں میں شریک ہوں۔ پھر ہمارے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں اور ان کا مقصد ایک دوسرے کو بہتر طور پر جاننا تھا۔

"ہم دونوں بہن بھائی کا خیال ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی کسی ایسے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اس بگڑے ہوئے معاشرے کو سدھارنا چاہتا ہے۔ تم نیک مقاصد کے حصول کی کوشش میں برائیوں کے خلاف برسرپیکار ہو۔ بتاؤ کیا ہمارا خیال صحیح ہے؟" جوگیندر بولا۔

"بڑی حد تک صحیح ہے۔" میں نے تصدیق کی۔

"ہم دونوں کافی عرصے سے ایسے ہی ساتھیوں کی تلاش کر رہے تھے۔" سیتا نے کہا۔ "مگر ہم اپنی جدوجہد کا رخ انگریزوں کے خلاف رکھنا چاہتے ہیں۔"

"لیکن ہم تو خالی ہاتھ ہیں۔ ہم کیسے ایسی جدوجہد کا آغاز کر سکتے ہیں!" میں بولا۔ میں ابھی پہلے ہی مرحلے پر انھیں سب کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا مقصد ان پر بے اعتمادی نہیں بلکہ محض احتیاط کے پیش نظر ایسا کر رہا تھا۔

"یہ ہم بعد میں سوچیں گے۔" جوگیندر نے کہا پھر وہ کھل گیا۔ "فی الحال میں کھیتوں اور کھلیانوں میں کام کر رہا ہوں۔ ہمارے دیش کی اسی فی صد سے زیادہ آبادی دیہات میں ہے اور ہم وہیں سے اپنی جدوجہد کا آغاز کر رہے ہیں۔"

"اور یہ بھی تو بتاؤ نا بھیا کہ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہمارے کچھ اور ساتھی بھی ہیں اور ہمارے اس نیک مقصد میں ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔" سیتا بول اٹھی۔ "صدیوں سے زمینداری اور جاگیرداری کے جبر میں گرفتار لوگ یہ بھی بھول چکے ہیں کہ وہ انسان ہیں۔ بھوک، غربت اور جہالت اپنی تقدیر سمجھ بیٹھے ہیں اور یہ بڑے دکھ کی بات ہے!"

"تو پھر؟" میں بولا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ دونوں بہن بھائی مجھ سے کیا چاہتے ہیں!

"میرا کہنا یہ ہے کہ انقلاب دیہات سے نہیں شہروں سے پھوٹتا ہے۔" سیتا نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"لیکن تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" یہ سوال میری زبان پر آہی گیا۔

"تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے متعلق ہم نے بہت گفتگو کی ہے۔" سیتا نے اپنے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا خیال یہ تھا کہ اگر ہم اور تم مل جل کر کام کریں تو بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ ہم تمہاری تلاش ہی میں تھے اور خوش قسمتی سے آج بھیا کو تم مل ہی گئے۔"

میں نے انھیں بتا دیا کہ صرف میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا، مجھے اس سلسلے میں اپنے قائد سے بات کرنا پڑے گی۔ جوگیندر اور سیتا کو میں نے یہ بھی بتا دیا کہ میرا یا میرے ساتھیوں کا جلالی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ کہتے ہوئے میرا ذہن ان کی تجویز ماننے پر آمادہ تھا۔ میرے خیال میں یہ ایک بہتر تجویز تھی۔ ان لوگوں کی مدد سے ہماری اطلاعات کے ذرائع وسیع ہو سکتے تھے۔ یہ لوگ ہندو ہونے کے سبب ہندو حلقوں کی فکر اور مسلمانوں کے خلاف بنائی جانے والی سازشوں سے ہمیں آگاہ کر سکتے تھے۔ ان لوگوں کے تعاون سے ہماری جدوجہد ایک بڑے دائرے میں داخل ہو سکتی تھی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم اب بھی میری طرف سے مطمئن نہیں ہوئے۔" جوگیندر نے کہا۔ "ایک طرح سے یہ غلط بھی نہیں۔ ہم ایسے لوگوں کو کسی پر بھی جلد اعتماد نہیں کرنا چاہیے مگر آج رات ہی میں تمہیں اپنی نیک نیتی اور خلوص و وفاداری کا ثبوت فراہم کر دوں گا! وہ ثبوت ایسا ہوگا کہ اسے میرے خلاف بھی استعمال کر سکو گے۔"

میں جوگیندر کے رویے اور اس کے انداز گفتگو سے متاثر ہو کر بولا۔ "نہیں میرے دوست! مجھے تم پر بھروسا ہے، کسی ثبوت کی مجھے ضرورت نہیں۔" میں نے جو کچھ کہا تھا سچ تھا۔ میں نے ان دونوں بہن بھائی پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کے دلوں میں مجھے کوئی کھوٹ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"میں خود کو مطمئن کرنے کے لیے وہ ثبوت پیش کروں گا۔" جوگیندر نے کہا۔ "مگر آج رات مجھے ایک اور کام ہے۔ سیٹھ مہیش نے جلالی کے گردو نواح میں جو دیہات ہیں ان میں مسلمانوں کو شدھی کرنے اور ان کے قتل عام کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ منصوبہ تمہاری رات کی کارروائی کے باوجود بدستور برقرار ہے۔ اگر ایسا ہو گیا، اگر وہ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو گیا تو بہت برا ہوگا دوست! سارے علاقے میں ہندو مسلم فسادی آگ بھڑک اٹھے گی۔ میں ذاتی طور پر آج یہ کوشش کروں گا کہ جلالی کے سرکردہ افراد سے مل کر انھیں اس تباہی کا احساس دلاؤں اور اس سے نجات حاصل کرنے کی کوئی راہ نکال لوں۔ میرے لیے کافی مشکل ہے۔ متعصب ہندو طبقہ مجھے، میرے پتا جی کو اور سیتا کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ لوگ انتہا پسند ہیں۔ یہ ہمیں کمیونسٹ، دھرم غدار اور مسلمانوں کا چمچہ کہتے ہیں۔"

"ویسے میرے خیال میں جوگیندر تمہارا طریقہ کار مناسب نہیں ہے۔ تمہیں تو انتہا پسند ہندو طبقے کا اعتماد حاصل کرنا چاہیے۔" میں بولا۔ "میرے نزدیک یہ بہت ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح تم بہت آسانی کے ساتھ ان کے مذموم عزائم سے بروقت آگاہ رہو گے اور ان کا توڑ کر سکو گے۔"

ان دونوں ہی بہن بھائی نے میری یہ تجویز پسند کی تھی مگر سوچنا یہ تھا کہ ایسا کس طرح ہوگا؟ معاً جوگیندر نے مجھ سے کہا۔ "سمجھ میں آ گئی ترکیب۔" پھر وہ مجھے تفصیل بتاتا رہا۔ اس میں ناکامی کے امکانات کم تھے۔

"تو پھر آج رات نو بجے اناج منڈی کے صدر دروازے

پر مل رہے ہو نا؟" سیتا نے یاددہانی کرائی۔

"بالکل مل رہا ہوں۔" میں نے ان دونوں کو یقین دلایا۔

وہاں سے جب میں روانہ ہوا تو عجیب سے احساسات تھے۔ میں الجھن میں گرفتار تھا۔ جوگیندر سے اشتراک کا فیصلہ میرا تھا۔ اس سے میں نے جو وعدہ کر لیا تھا، ہر قیمت پر اسے پورا کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسی وجہ سے مجاہد اول کو اس سلسلے میں کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہاں میں اسے سیٹھ مہیش کے منصوبے کے بارے میں ضرور بتاتا۔ میں اس سے یہ بہانہ کر سکتا تھا کہ جب میں قاسم کی لاش کو تانگے میں چھوڑ کر ہندوؤں کے ایک محلے سے گزر رہا تھا تو کچھ ہندوؤں کو منصوبے کے متعلق باتیں کرتے سنا تھا۔

پھر میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس کے بعد مجاہد اول نے سید حیدر عباس کے گھر اجتماع کا بندوبست کیا تھا۔ مجاہد اول ہی نے وطن پرستوں کی طرف سے سرکردہ افراد کو خطوط بھجوائے تھے جن میں ہندو اور مسلمان سبھی شامل تھے۔

☆☆☆☆

جوگیندر کے رخصت ہوتے ہی میں ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ عقب سے مجھے حیدر صاحب کی آواز سنائی دی۔ "شاکر میاں! شاکر بیٹے!" میں پلٹ کر ان کی طرف بڑھا۔ ان کا سانس قابو میں نہیں تھا۔ غالباً وہ بہت تیز تیز چل کر میرے قریب پہنچے تھے۔ ان کے چہرے سے پریشانی ظاہر تھی۔

"بیٹے! تمہارے لیے ایک ضروری پیغام ہے۔" حیدر صاحب اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولے۔ میں نے ان کی حالت ہی سے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کوئی اچھی خبر نہیں دیں گے۔ "تمہیں واپس ٹھکانے پر نہیں جانا!" انھوں نے تیزی سے بتایا۔ "اس مسجد میں چلے جاؤ۔ عصر کی نماز تک تمہیں وہیں ٹھہرنا ہے۔" انھوں نے ایک قریبی مسجد کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں، بات کیا ہے؟ کیا ہوا؟" میں نے ان سے دریافت کیا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں، صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ تمہارا وہاں واپس جانا خطرے سے خالی نہیں۔" حیدر صاحب نے جواب دیا۔ "تم مسجد میں چلے جاؤ! اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔" انھوں نے مجھے دعا دی اور واپس چلے گئے۔ انداز ایسا ہی تھا کہ وہ زیادہ دیر میرے قریب نہیں رکنا چاہتے تھے۔ شاید انھیں خطرہ تھا کہ کہیں وہ میرے ساتھ نہ دیکھ لیے جائیں! یوں بھی وہ ممکنہ خطرے میں گھر جاتے۔ خطرے کی نوعیت سے تو میں واقف نہ تھا، ہاں مجھے یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ میرے اردگرد خطرہ منڈلا رہا ہے۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میں مسجد کی طرف بڑھا۔ موذن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مسجد میں قدم رکھتے ہی صحن کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے کوئی آیا ہوا شخص نظر نہ آیا۔ وضو کرنے کے بعد میں مسجد کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ ذرا ہی دیر کے بعد نمازی آنے لگے۔ جماعت کھڑی ہونے سے پہلے وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ان کا موضوع گفتگو جلالی کے قریب تباہ ہونے والی ایک سرکاری عمارت تھی۔ عمارت کے تباہ ہونے سے پے در پے جو دھماکے ہوئے تھے، وہ میلوں تک سنے گئے تھے۔ قاسم کے قتل پر بھی تبصرے ہو رہے تھے۔ اس تانگے والے کے قتل کو ہندوؤں کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔ مجھے یہ سن کر ظاہر ہے حیرت ہی ہوئی۔ انہی کے ساتھ وطن پرستوں کے تذکرے بھی ہو رہے تھے۔ لالہ سکھی دھر کی بیٹیوں کے اغوا کے ساتھ دستاری کے خیر محمد کی بہن کے حوالے بھی دیے جا رہے تھے۔ میں خاموشی کے ساتھ یہ باتیں سن رہا تھا۔ ان باتوں میں ایک تلخی سی بھی تھی جو سیٹھ مہیش کے گھر آنے والے مہمانوں کی آمد، ان کے عزائم اور اسی ضمن میں طرح طرح کی افواہوں سے پیدا ہوئی تھی۔ لوگ مشتعل بھی تھے، غصے میں بھی لگتے تھے اور پریشان بھی نظر آ رہے تھے۔ میری نظریں ہر آنے والے کا جائزہ لے رہی تھیں کہ شاید کوئی شخص میرے لیے پیغام لایا ہو۔ پیغام لانے والا میرے لیے قطعی اجنبی بھی ہو سکتا تھا۔ پھر جماعت کھڑی ہو گئی۔ نماز پڑھ کر دعا مانگنے کے بعد لوگ ایک ایک کرکے مسجد سے جانے لگے۔

پھر میرا انتظار ختم ہو گیا۔ ٹیپو ایک شخص کے ساتھ صحن مسجد سے اندر آتا دکھائی دیا۔ وہ دونوں میری طرف بڑھے تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد ہم خاموشی کے ساتھ مسجد سے نکلے۔ باہر ایک بگھی کھڑی تھی۔ پہلے ٹیپو بگھی میں بیٹھا، پھر میں اور آخر میں وہ اجنبی سوار ہوا اور بگھی چل پڑی۔ ابھی تک ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ راستے میں بھی بہ طور احتیاط ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ چند ہی منٹ بعد بگھی رک گئی۔ وہ ایک بڑی سی حویلی تھی جس کے اندر پہنچ کر بگھی رکی تھی۔

اس اجنبی نے ہمیں حویلی کے مہمان خانے میں ٹھہرا دیا اور کہنے لگا۔ "مرغوب کے دوست میرے لیے بیٹوں ہی کی طرح ہیں۔"

میں نے ٹیپو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے بتایا۔ "بھئی یہ مرغوب کے والد ہیں مسعود صاحب!"

"اچھا اچھا!" میں نے جلدی سے گردن ہلائی۔ "بڑی

خوشی ہوئی آپ سے مل کر!" مجھے اس وقت تک قطعی علم نہیں تھا کہ مرغوب کون ہے!

نیپو اس اجنبی سے مخاطب ہوا تھا۔ "مرغوب آپ کی جتنی تعریفیں کرتا تھا' میں نے اس سے بڑھ کر ہی آپ کو پایا۔ اگر عبدالرحمٰن اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتا تو ہم ہرگز آپ کو زحمت نہ دیتے۔ بس کل صبح ہی ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس زحمت کے لیے بہرحال ہم معذرت خواہ ہیں۔"

"ارے نہیں بیٹا فرہاد!" سعود صاحب بولے۔ "یہ بھلا زحمت کی کیا بات ہے! تم مرغوب کے دوست ہو۔ جیسے مرغوب میرے لیے ہے ویسے تم ہو۔ کیوں عقیل میاں!" انہوں نے مجھ سے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اب میرا نیا نام عقیل ہے اور نیپو' فرہاد بن چکا ہے۔ جوگیندر نے غلط نہیں کہا تھا۔ ہمارے لیے واقعی ناموں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسی جلالی میں اب تک میں کئی نام اختیار کرچکا تھا۔ مقصد اس کا محض اپنی اصل شناخت کو پردے میں رکھنا تھا جس سے مجاہد اوّل کے سوا جلالی میں کوئی اور واقف نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مجاہد اوّل ابھی تک جلالی میں موجود تھا یا جا چکا تھا۔

"یہ سب آپ کی محبت ہے۔" میں نے سعود صاحب سے کہا۔ "میں تو اس کے حق ہی میں نہیں تھا کہ آپ کو تکلیف دی جائے مگر فرہاد نہیں مانا۔ یہ یہ ضد ہوگیا کہ اب جلالی آئے ہیں تو عبدالرحمٰن سے مل کر جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ پھر رہنے کی کوئی جگہ تو چاہیے تھی۔" مجھے عبدالرحمٰن کے متعلق بھی کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کس مصیبت میں گرفتار ہوگیا ہے! میں نے تو نیپو کا جملہ سن کر یہ بات کہہ دی تھی۔ مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ میری بات مناسب تھی بھی کہ نہیں!

مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ سعود صاحب کچھ بے چین سے تھے۔ چند مزید باتیں کرکے وہ چلنے لگے۔ "اچھا بیٹا فرہاد! میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ جلالی میں ان دنوں ہندو مسلم کشیدگی بڑھ رہی ہے' اسی سلسلے میں ایک میٹنگ ہے۔ تم دونوں یہاں آرام سے رہو۔ میں ملازمین سے کہہ جاؤں گا۔ وہ تمہارا خیال رکھیں گے۔"

"تم نے یہ کہاں لاکر پھنسا دیا؟" سعود صاحب کے جاتے ہی میں نے نیپو سے کہا۔

"میں نے جو کچھ کیا ہے' مجاہد اوّل کی ہدایت ہی پر کیا ہے۔" نیپو نے جواب دیا۔ "جلالی کے حالات اچانک ہی ہمارے لیے خراب ہوگئے ہیں۔"

"اتنے مختصر عرصے میں؟" میں نے حیرت کے ساتھ کہا۔ "حیدر صاحب کے یہاں اجلاس میں ڈھائی تین گھنٹے سے زیادہ تو نہیں ہوئے!"

"اچانک حالات نے ایسی کروٹ لی ہے کہ مجاہد اوّل کا سارا لائحہ عمل درہم برہم ہوکر رہ گیا ہے۔" نیپو نے بتایا۔

"مگر مجھے تو یہاں بھی کچھ اچھے آثار نظر نہیں آرہے۔" میں نے نیپو کی طرف جھک کر بہت دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ سعود صاحب کون ہیں؟ مرغوب' فرہاد' عقیل اور عبدالرحمٰن کون ہیں؟ میں نے سعود صاحب سے جو باتیں کی تھیں' ٹھیک بھی تھیں یا نہیں؟"

"مرغوب' انہی سعود صاحب کا بیٹا ہے جو علی گڑھ میں پڑھتا ہے۔ آج کل وہ دہلی گیا ہوا ہے۔ مجاہد اوّل اسے جانتے ہیں۔ مرغوب' عبدالرحمٰن کا بھی دوست ہے۔ وہ بھی علی گڑھ ہی میں پڑھ رہا ہے۔ فرہاد اور عقیل کی حیثیت سے ہم بھی وہیں علی گڑھ میں پڑھتے ہیں۔ یوں سمجھو' ہم دونوں گویا مرغوب اور عبدالرحمٰن کے دوست ہیں۔ ہم عبدالرحمٰن سے ملنے یہاں آئے تھے مگر آج اسے پولیس نے گرفتار کرلیا۔ ان دنوں وہ علی گڑھ سے جلالی آیا ہوا تھا۔ ہمیں اسی لیے سعود صاحب کے یہاں ٹھہرنا پڑا کیوں کہ عبدالرحمٰن کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔"

"آخر اتنے ہیر پھیر کی ضرورت کیا تھی! ہم سیدھے مرغوب ہی کے گھر کیوں نہیں آگئے؟" میں بولا۔

"حقیقت کا رنگ گہرا کرنے کی غرض سے۔" نیپو نے جواب دیا۔ "ہم دونوں اس وقت دہلی سے آرہے ہیں۔ ہم یہاں ایک عمارت میں دھماکے ہونے اور اڑ جانے کی خبریں سن کر یہاں آئے ہیں۔ مرغوب سے ہماری ملاقات دہلی ہی میں ہوئی تھی۔ یہ تمام باتیں ثابت کرتی ہیں کہ مرغوب ہمارا گہرا دوست ہے۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے نیپو' مگر مجھے یہاں حالات بہتر دکھائی نہیں دے رہے۔ لگتا ہے کہ ہم کسی مصیبت کا شکار ہونے والے ہیں۔" میں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

"محسوس تو مجھے بھی یہی ہو رہا ہے۔" نیپو بولا۔ "سعود صاحب کا رویہ بڑا پُراسرار ہے۔ وہ کچھ پریشان اور تذبذب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے وہ ہماری طرف سے مطمئن نہ ہوں یا انہیں کسی طرح ہم پر شک ہوگیا ہو' مگر مجاہد اوّل کی یہی ہدایت تھی کہ ہم سعود صاحب ہی کے یہاں ٹھہریں۔"

"میرا مطلب یہ نہیں کہ تم نے غلطی کی ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں بہرحال ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے۔ مجاہد اوّل سے بھی اندازوں کی غلطی ہوسکتی ہے۔ ہاں یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس کچھ سامان بھی ہے یا نہیں؟" میرے اس سوال کا جواب نیپو نے انکار میں دیا تو میں بولا۔ "یہ بات بھی تو سعود صاحب کو شک میں ڈال سکتی ہے کہ دہلی سے جلالی آنے والے دو نوجوانوں کے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔ نہیں نیپو' مجھے یقین ہے کہ انہیں ہم پر شبہ ہوگیا ہے۔ جلالی کے بچے بچے کی زبان پر ان چار اجنبیوں کا تذکرہ ہے جن کی پولیس کو تلاش ہے اور جو وطن پرست نامی ایک تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"پھر ان حالات میں کیا قدم اُٹھایا جائے؟" نیپو نے مجھ سے سوال کیا۔

"فی الحال تو صرف محتاط اور پوری طرح چوکنا رہو!" میں نے جواب دیا' پھر پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ مجاہد اوّل کو اچانک حالات بگڑنے کا احساس کس طرح ہوا؟"

جواب میں نیپو نے مجھے کئی پریشان کن خبریں سنائیں۔ تیتو میر کو پولیس نے حراست میں لے لیا تھا۔ وہ دوسرا تانگے والا قمر بھی پکڑا گیا تھا جو قاسم ہی کے ساتھ ہمیں لالہ ملی دھر کی حویلی سے ایک ٹھکانے تک لے کر آیا تھا۔ وہ مکان رؤف صاحب کا تھا جہاں پولیس نے چھاپا مارا تھا۔ رؤف صاحب کے بیٹے کا نام ہی عبدالرحمٰن تھا جسے پولیس نے پوچھ گچھ کے لیے روک لیا تھا۔ گرفتاری تو رؤف صاحب ہی کی ہونا تھی مگر وہ ان دنوں اپنی "زمینوں" پر گئے ہوئے تھے۔ ان کی گرفتاری کا سبب یہ تھا کہ رادھا اور ساوتری کو اغوا کرکے انہی کے مکان میں رکھا گیا تھا۔ ایک تشویش ناک خبر یہ بھی تھی کہ قاسم کی لاش پر ہم نے جو پرچہ چھوڑا تھا اسے پولیس نے چھپا لیا تھا اور یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ قاسم کو ہندوؤں نے قتل کیا ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو مشتعل کرنا تھا کہ ہندو مسلم فساد کی راہ ہموار ہوسکے اور اس بہانے مسلمانوں کا قتل عام کیا جاسکے۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ علی گڑھ سے پولیس کی بھاری جمعیت جلالی طلب کرلی گئی تھی۔ فوج کا ایک دستہ بھی جلالی پہنچ گیا تھا۔ جلالی کی ناکا بندی کردی گئی تھی۔ جلالی سے جانے والی ہر گاڑی' مسافروں اور سواریوں کو چیک کیا جارہا تھا۔ یہ بات عام تھی کہ پولیس چار اجنبیوں کی تلاش میں ہے جو جلالی کے باشندے نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ چاروں' میں' نیپو' حیدر علی اور سراج الدولہ ہی تھے۔ آخری خبر یہ تھی کہ اب وہ مکان بھی ہمارے لیے خطرناک ہی سمجھا گیا تھا جہاں ہم رؤف صاحب کے گھر سے فرار ہوکر پہنچے تھے۔ اندازہ یہی تھا کہ قمر تانگے والے اور تیتو میر کی گرفتاری' مقتول قاسم ہی کی نشان دہی پر ہوئی تھی۔ قاسم اس مکان سے بھی واقف تھا جہاں ہم نے فرار ہوکر پناہ لی تھی۔ بہ طور احتیاط اسی لیے وہ مکان بھی خالی کردیا گیا تھا۔ حیدر علی اور سراج الدولہ کو جلالی کی حدود سے بہ حفاظت باہر نکال دیا گیا تھا۔ وہ دونوں اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہوچکے تھے۔

"اور ہم دونوں کو آج رات جلالی سے فرار ہوجانا ہے۔" نیپو نے بتایا۔ "یہاں سے نکلنے کے لیے ہمیں کیا طریقہ اختیار کرنا ہے' اس کا فیصلہ تم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس وقت تک ہمیں یہیں سعود صاحب کے یہاں رہنا ہے۔" نیپو نے ان الفاظ کے ساتھ ہی اپنی بات ختم کردی۔

"اس کا مطلب تو یہ نکلا ۔۔۔ مجاہد اوّل یہاں نہیں ہیں؟" میں نے ساری بات سن کر کہا۔

"تم نے یہ مطلب کیسے نکال لیا؟" نیپو مجھ سے قدرے بے تکلف ہوچکا تھا اور مجھے "آپ" کہنا چھوڑ دیا تھا۔

"اس طرح کہ اب جلالی میں ان سے ہماری ملاقات نہیں ہوگی۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "اگر وہ یہاں ہوتے تو ان سے ہماری ملاقات یقینی تھی۔ ایسی صورت میں یہاں سے فرار ہونے کے لیے ہمیں اپنے طور پر فیصلہ کرنے کو نہ کہا گیا ہوتا۔ یوں سمجھو کہ اب ہم اپنے ہر عمل کے خود مختار ہیں۔ ہمیں خود اپنی حفاظت کرنا ہے اور پناہ بھی تلاش کرنا ہے۔ ان کی طرف سے ہمارے لیے یہ آخری بندوبست تھا۔"

"ممکن ہے کہ تمہارا خیال درست ہی ہو۔" نیپو بے یقینی کے سے انداز میں بولا۔

"ایسا ہی ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "اور اب ہماری ذمے داری بڑھ گئی ہے۔"

جواب میں نیپو کچھ نہ بولا اور خاموشی چھاگئی۔ مجھے سعود صاحب کا رویہ کسی بھی طرح اطمینان بخش نہیں لگ رہا تھا۔ میں ان کی طرف سے کھٹک گیا تھا۔ مجھے خطرات اپنے اردگرد محسوس ہو رہے تھے۔ اچانک دور کہیں سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اُبھری۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہی بگھی کہیں جارہی تھی جس میں بیٹھ کر ہم وہاں پہنچے تھے۔ میں کھڑکی سے پلٹا ہی تھا کہ ایک ملازم چائے لے کر آگیا۔ چائے کی ٹرے اس نے میز پر رکھ دی اور کمرے سے باہر کرسی پر جا بیٹھا۔

میں کمرے سے نکل کر ملازم کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ "سعود صاحب کہیں گئے ہیں؟" ملازم نے اقرار میں سر ہلایا تو

میں نے دوسرا سوال کیا۔ "وہ کہاں گئے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم صاحب!" ملازم نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"کب تک آئیں گے؟" میں نے پوچھا۔ اس کا جواب بھی لاعلمی میں ملا تو میں نے ایک چال چلی اور ملازم سے بولا۔ "ہم سے تو وہ کہہ رہے تھے ڈاکٹر کے پاس دوا لینے جا رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ واپسی آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہو جائے گی۔"

"جی۔۔۔ جی ہاں صاحب! وہ۔۔۔ وہ دوا ہی لینے گئے ہیں۔" ملازم گڑبڑا کر بولا۔ "میں بھول ہی گیا تھا۔ بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہے ناجی!"

"بیگم صاحبہ کی بھی طبیعت خراب ہے!" میں نے حیرت سے کہا۔ "مگر وہ تو اپنی طبیعت خراب بتا رہے تھے!"

"وہ۔۔۔ وہ جی۔ ان کی بھی طبیعت خراب ہے۔" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے' تم ایسا کرو کہ ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے آؤ!"

ملازم میری بات سن کر وہاں سے فوراً دوڑ لیا۔ وہ یقیناً میرے مزید سوالات سے گھبرا رہا ہوگا۔

میں تیزی سے کمرے میں آیا اور نیپو کو مخاطب کیا۔ "فوراً یہاں سے نکل چلو! ہمیں جلد از جلد یہاں سے دور نکل جانا ہے۔ خطرے کی تصدیق ہو گئی ہے۔"

نیپو موقع محل کی نزاکت دیکھ کر فوراً میرے ساتھ چل دیا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے ملازم اور میرے درمیان کمرے کے دروازے پر ہونے والی گفتگو سن لی ہو۔ ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے پھاٹک سے گزر گئے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ کسی نے ہمیں وہاں سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پھاٹک سے نکلتے ہی ہم اور تیزی سے چلنے لگے۔ حویلی کی چاردیواری کا موڑ گھوم کر ہم ایک نیم پختہ گلی میں پہنچ گئے۔ گلی میں کوئی نہ تھا اس لیے ہم دوڑتے ہوئے اس سے گزر کر ایک اور تنگ گلی میں مڑ گئے۔ شام اب رات سے گلے مل رہی تھی۔

"اب کدھر چلنا ہے؟" نیپو نے مجھ سے سوال کیا۔

مجھے خود علم نہیں کہ کہاں جانا چاہیے۔ میرے ذہن میں حیدر صاحب کا نام آیا مگر اسے میں نے رد کر دیا کیوں کہ وہ تو مجھے خود ہی ڈرے سے نظر آئے تھے۔ جب انہوں نے مجھے پیغام دیا تھا تو یوں لگا تھا جیسے جلد از جلد مجھ سے جان چھڑانا چاہتے ہوں۔ "بس فی الحال چلے چلو!" میں نے نیپو کے سوال کا جواب دیا۔ میرے ذہن میں اچانک جوگیندر کا خیال آیا۔ میرے دل و دماغ نے اسی کے حق میں فیصلہ دیا۔ ہمیں وہاں پناہ مل سکتی تھی۔ پھر میں نے راستہ بدل دیا۔ اتنے عرصے جلالی میں رہ کر میں نے وہاں کے گلی کوچے اور راستے اچھی طرح اپنے ذہن میں محفوظ کر لیے تھے۔ چند قدم چلتے ہی بوندا باندی شروع ہو گئی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم دونوں جوگیندر کے گھر پہنچ چکے تھے۔ دونوں بہن بھائی ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پوری روداد سن کر جوگیندر بولا۔ "تمہارا فیصلہ درست ہے۔ ویسے مجھے اس پر خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ تم نے مجھے اپنا قابل اعتماد دوست سمجھ لیا ہے۔"

میں نیپو کا تعارف بھی اپنے ساتھی کی حیثیت سے کرا چکا تھا۔ جوگیندر' نیپو کو نام کی حد تک پہلے سے جانتا تھا۔

"مگر آپ کے دو ساتھی اور بھی تو تھے' وہ کہاں ہیں؟" سیتا نے پوچھا۔

"وہ دونوں جلالی سے جا چکے ہیں۔" میں نے بتایا۔ "اگر میں نے جوگیندر سے آج ملنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا تو ہم دونوں بھی یہاں نہ ہوتے۔"

"تم یہیں ٹھہرو! میں معلوم کر کے آتا ہوں کہ سعود صاحب کے یہاں کیا ہوا تھا۔" جوگیندر نے کہا۔ "نیپو! تم میرے ساتھ چلو!"

"اور میں؟۔۔۔ میں۔"

"تم یہیں ٹھہرو گے۔" جوگیندر میری بات کاٹ کر بولا۔ "سیتا بڑی خوبصورت اور دلچسپ گفتگو کرتی ہے' تمہیں کوفت نہیں ہوگی۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ۔" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ "سیتا اکیلی یہاں رہے گی اور۔"

"اکیلی!۔ اکیلی کہاں رہے گی سیتا! تم جو ہو گے یہاں!" جوگیندر ہنسا۔ "ویسے مجھے تم پر اعتماد ہے اور اپنی بہن پر بھی بھروسا ہے۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم لڑکیوں سے اتنے ڈرتے ہو تو پھر تم نے رادھا اور ساوتری کو کیسے اغوا کیا ہوگا!" سیتا نے شوخ لہجے میں کہا۔

"رادھا اور ساوتری نے جس انداز میں تمہارا تذکرہ کیا ہے اس کے بعد کون کافر تم پر اعتماد نہیں کرے گا!" جوگیندر نے لفظ کافر پر زور دیا۔

پھر جوگیندر مجھے اور سیتا کو چھوڑ کر چلا گیا۔ نیپو اس کے ساتھ تھا۔ اس نے جانے سے قبل نیپو کو اپنا ایک جوڑا پہنا دیا تھا جس سے نیپو ہندو معلوم ہو رہا تھا۔

سیتا واقعی بہت عمدہ گفتگو کرتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں بلا جھجک میں اس سے بات کرنے لگا۔ سیتا کا باطن اس کے ظاہر سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اس کی باتوں سے خوشبو سی آتی تھی۔ وہ بڑی کومل اور نازک سی لڑکی لگتی تھی مگر اس کے سینے میں شیر کا دل تھا۔ ہم باتیں کرتے رہے اور ہمارے درمیان حجابات کے پردے اٹھتے گئے۔ کئی بار میں نے اس کا لمس محسوس کیا اور میرا سارا جسم جھنجھنا اٹھا۔ اس کے دراز گیسو بھی کئی بار میرے چہرے سے ٹکرائے اور میں نے خود کو کالی گھٹاؤں کے درمیان پرواز کرتا محسوس کیا۔ سیتا ایک ایسے نشے کی مانند تھی جو بہت آہستہ آہستہ چڑھتا ہے اور پھر حواس پر اپنا قبضہ جما لیتا ہے۔ پہلی بار اسے دیکھ کر میرا دل اس طرح قطعی نہیں دھڑکا تھا جس طرح کلونت کور کے لیے دھڑکنے لگا تھا۔ دوسری بار وہ مجھے قبول صورت اور اس ملاقات میں حسین معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کی رعنائیاں رفتہ رفتہ مجھ پر عیاں ہو رہی تھیں۔ کلونت کور محض دل کا معاملہ تھی مگر سیتا نے تو ذہنی سطح پر بھی مجھے متاثر کیا تھا بلکہ وہ تو ذہن ہی کے راستے میرے دل میں آتری تھی۔ رادھا نے تو بس کچھ دیر کلونت کور کی یاد کا جادو جگایا تھا مگر سیتا کا اپنا الگ ہی جادو تھا۔ وہ بے خود تھی۔ اب وہ مجھے اپنا ایک البم دکھا رہی تھی۔

"یہ دیکھو!" اس نے مجھے اپنی ایک تصویر دکھائی۔ "یہ تصویر مجھے بہت پسند ہے۔ میری ایک سہیلی نے یہ تصویر کھینچی تھی۔" اس تصویر میں سیتا ایک درخت کی ٹہنی پکڑے ہوئے کھڑی تھی۔ تیز ہوا کی وجہ سے ساری اس کے شانوں' پیٹ اور سینے سے بالکل چپکی ہوئی تھی۔ درختوں کے پس منظر میں وہ خود بھی گلاب کی طرح لگ رہی تھی۔ میں اس تصویر کو دیکھتا رہا کہ صاحب تصویر کو یوں ابھی براہ راست دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے حسن کا نشہ میری رگ رگ میں اترتا جا رہا تھا۔

"کیوں' کہاں کھو گئے؟" سیتا کی آواز مجھے جیسے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"خوابوں میں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "مجھے بنا رہے ہو؟"

"یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس وقت تو کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟ بتاؤ نا کہ کیا سوچ رہے تھے؟"

"برا مان جاؤ گی۔"

اس نے اپنی بڑی بڑی حسین آنکھوں سے مجھے دیکھا' رخساروں پر بجلی سی سرخی دوڑ گئی اور آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی۔ "کیسی باتیں کرتے ہو تم! میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مان سکتی۔" اس کے لہجے میں لرزش تھی اور یہ لرزش مجھے اچھی لگی تھی۔ اس کے گرم گرم سانس میری پیشانی کو بوسہ دے رہے تھے۔

میں خاموش رہا۔

"بولو نا شاہین! تم خاموش کیوں ہو گئے؟ سچ سچ بتاؤ تم کیا کہنے والے تھے۔" اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

"وہ بات کہنے کی میرے اندر ہمت نہیں ہے سیتا!۔ ہم دونوں دو کناروں پر کھڑے ہیں اور۔ کنارے کبھی آپس میں نہیں ملتے۔ درمیان میں فاصلہ بھی بہت ہے' اتنا فاصلہ کہ سرگوشیاں سنائی نہیں دیں گی اور میں۔ میں تم سے جو بات کہنا چاہتا ہوں' وہ سرگوشی ہی میں کی جا سکتی ہے۔"

"شاہین جی! کچھ باتیں ان کہی اچھی لگتی ہیں' پھر بھی آدمی انہیں سننا چاہتا ہے اور۔ اور میری بھی یہی خواہش ہے۔"

"تو تم سمجھ گئیں کہ میں تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں!" میں نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" اس نے خمار آلود نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے گردن ہلائی۔

ہم دونوں بہت دیر تک اسی کیفیت میں بیٹھے رہے۔ پھر وہ یوں ایک دم چونک کر الگ ہو گئی جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگ اٹھی ہو۔ میں بولا۔ "کیوں' کیا ناراض ہو گئیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلا کر میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور خواب آلود سی آواز میں کہا۔ "تم۔ تم میرے بھگوان ہو۔ میرے رام ہو! سیتا بھلا اپنے رام سے ناراض ہو سکتی ہے! کوئی پجارن اپنے بھگوان سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی!"

"میری دیوی! مجھے اتنا بڑا درجہ نہ دو!" میں نے یہ کہتے ہوئے اسے خود سے قریب کر لیا۔

وہ عجب سرور' عجب نشہ تھا جس میں ہم دونوں ہی ڈوبے جا رہے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھتا میں نے خود کو سنبھال لیا۔

"سیتا! مجھے۔ تم مجھے برا نہ سمجھنا! معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے!" میں آہستہ سے بولا۔

اس نے اپنی لرزتی ہوئی مخروطی انگلیاں میرے ہونٹوں پر رکھ دیں۔ "نہیں!۔ اگر تم برے ہو میرے رام تو پھر سیتا بھی بری ہے۔"

"نہیں سیتا' تم... تم تو بہت اچھی ہو۔" شدت جذبات سے میری آواز بار بار ٹوٹ رہی تھی۔ "تم نے مجھے... مجھے نہال کردیا ہے۔"

"میرے دیوتا... دیوتا!" اس کے ہونٹ لرزے اور اس مرتبہ وہ خود میرے قریب تر ہوگئی۔ "اب تم بچھڑ جاؤ گے اور میں برہا کی آگ میں جلتی رہوں گی۔"

"میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔" میں نے کہا۔

وہ مجھ سے الگ ہوگئی اور مجھے وہ تصویر البم سے نکال کر دے دی جو دکھائی تھی۔ "یہ تصویر تمہیں میری یاد دلاتی رہے گی۔"

میں نے تصویر کو ہونٹوں سے لگالیا' پھر شکریہ ادا کرکے تصویر جیب میں رکھ لی جسے اس نے ایک کاغذ میں لپیٹ دیا تھا۔ "پانی پلاؤ گی؟" میں بولا۔ وہ پانی لے آئی تو میں نے کہا۔ "پہلے تم پانی پیو!" اس نے میرے کہنے سے تھوڑا سا پانی پی لیا۔ میں نے بڑی احتیاط سے گلاس لیا اور ٹھیک اسی جگہ اپنے ہونٹ رکھ دیے جہاں سے اس نے پانی پیا تھا۔ پانی پینے کے بعد گلاس کو میں نے میز پر رکھ دیا اور اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔ اس کا چہرہ میرے چہرے پر جھک آیا۔

"اب نہ جانے ہم کب ملیں گے! اور... اور مل بھی سکیں گے یا نہیں!" وہ بولی اور اس کا چہرہ مزید قریب آگیا۔

"میں پھر تم سے ملنے آؤں گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے یہی امید ہے۔" اس کی انگلیاں میرے ہونٹوں پر لرز رہی تھیں۔ "اس ملاقات کی یاد کے طور پر!" اس نے اپنے ہونٹ میری پیشانی پر رکھ دیے۔ میرے جسم میں گہرا نشہ سا اتر گیا۔ شاید ہم دونوں کے اس اضطراب کا سبب یہ تھا کہ ہمیں پھر کبھی ملاقات کا یقین نہیں تھا۔ غالباً اسی لیے ہم نے پہلی ہی ملاقات میں اپنی محبت کے کئی مراحل طے کرلیے تھے۔

"میں ہمیشہ انتظار کروں گی۔" سیتا خوابیدہ سی آواز میں بولی۔

"اور... اور میں بھی!" میں نے کہا اور پھر ہم نے اپنے پیمانِ وفا پر اپنے گرم سانسوں اور کانپتے ہونٹوں کی مہر ثبت کردی۔

ہم دونوں اسی لذت' سرور اور کیف کے عالم میں تھے کہ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سارے بدن میں کوئی تیز برقی رو سی دوڑ گئی ہے۔ اسی وقت سیتا ایک جھٹکے سے دور جاگری۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ بالکل یوں لگا تھا جیسے سیتا کو بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ میں اسی نامانوس کیفیت و اذیت کے باوجود آگے بڑھ کر سیتا کو اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ میرے جسم کو بھی زبردست جھٹکا لگا اور میں چکرا کر فرش پر گرا۔

"شاہین!" سیتا مجھے گرتے دیکھ کر چیخ اٹھی اور فرش سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے آخری بار اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اس کا چہرہ زرد سا پڑ گیا تھا۔ پھر میرے جسم کو پے در پے جھٹکے لگنے لگے۔ اس سے مجھے بے پناہ اذیت اور کرب محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے جھٹکے کھا کھا کر میرے جسم کی ساری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی' میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا' دماغ کی رگیں جیسے پھٹنے والی تھیں اور دل کو جیسے کوئی مٹھی میں لے کر زور سے بھینچ رہا تھا۔ میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا اور پھر میرا سانس رکنے لگا۔ میرے بدن کو پھر ایک شدید جھٹکا لگا اور میرے منہ سے تیز چیخ نکل گئی۔

"میرے دیوتا!" کسی نے مجھے پکارا تھا مگر میں کچھ دیکھنے کا اہل نہیں رہا تھا۔ میری آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ سانس پھر رکتا ہوا لگا تو میں نے سوچا کہ شاید میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ کسی نادیدہ قوت نے ایک بار پھر میرے دل کو اپنی مٹھی میں لے کر بھینچا' مگر اب مجھ میں چیخنے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ مجھ پر جاں کنی کا سا عالم طاری تھا۔ کوشش کے باوجود میں اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ شدید کرب و اذیت کے باوجود میں کلمہ پڑھنے لگا' اس یقین کے ساتھ کہ اب میرا آخری وقت ہے۔ میرا سانس رک رک کر چل رہا تھا اور دماغ پر اندھیرے کی چادر پھیلتی جا رہی تھی۔ کلمے کے الفاظ بھی اب میرے ذہن سے محو ہوتے جا رہے تھے۔ میرا آخری احساس یہ تھا کہ جن پراسرار دشمنوں نے میرے باپ ہاموس کو قتل کردیا تھا' وہ اب مجھ تک پہنچ چکے ہیں اور مجھے بھی قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اسنیٰ مجھے پہلے ہی اُن کی طرف سے خبردار کرچکی تھی۔

↓↓↓↓

ان لمحوں کی اذیت شاید وہ لوگ محسوس کرسکیں جنھوں نے موت سے پنجہ کشی کی ہو۔ ہوش و حواس کھونے سے پہلے مجھ پر جاں کنی کی سی کیفیت طاری تھی' مجھے یقین تھا کہ میں زندہ نہیں بچ سکوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے اپنے اردگرد خوشبو محسوس کی تو خاصی دیر تک مجھے اپنے ہونے کا گمان تک نہ ہوا۔

"میں سوچتا ہوں اس لیے ہوں۔" میرے ذہن میں کسی فلسفی کے الفاظ گونجے۔

میں بھی تو سوچ ہی رہا تھا!

اپنے ہونے کے احساس نے میرے خوابیدہ احساس کو جھنجوڑ دیا۔ گزرا ہوا کرب ناک واقعہ مجھے یاد آنے لگا۔ جن پُراسرار دشمنوں نے میرے باپ ہاموس کو قتل کردیا تھا' وہ مجھ تک پہنچ چکے تھے اور مجھے قتل کردینا چاہتے تھے۔ ان قاتلوں کی جھلک میں نہیں دیکھ سکا تھا کیوں کہ وہ نادیدہ تھے۔ میں نے انھیں صرف محسوس کیا تھا۔ اسنیٰ نے مجھے بتایا تھا کہ جو نیک ہوتے ہیں' ان کی خوشبو ہوتی ہے اور ہم میں سے جو بد ہوتے ہیں' ان کے قریب آنے سے بدبو محسوس ہونے لگتی ہے۔

میں نے اسی سے انھیں پہچانا تھا۔

بے ہوشی سے ہوش کی طرف یہ سفر صرف چند لمحوں کا تھا۔ یہی لمحے مجھے موت کی دہلیز سے زندگی کی سرحد تک کھینچ لائے۔ میں اندھیروں سے اُجالوں میں آگیا۔ اپنے قریب میں نے جو مانوس خوشبو محسوس کی تھی' اسے میں نے اپنے انفاس میں اُتار لیا۔ وہی خوشبو تو میرے لیے زندگی کی خوش خبری بن کر آئی تھی۔

کوئی مجھے پکار رہا تھا۔ "طارنوش!... طارنوش بیٹے!"

اس آواز میں التجا بھی تھی اور دکھ بھی' غم انگیز دیوانگی بھی تھی اور دبی دبی سسکیاں بھی تھیں۔ میں' وہ بھرائی ہوئی سی آواز سن رہا تھا۔ "میری جان' ہوش میں آؤ! سنو بیٹے! تمہاری اسنیٰ تمہیں پکار رہی ہے۔ خدا کے لیے ہوش میں آؤ! خدانخواستہ تمہیں... اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو... تو پھر اسنیٰ بھی نہ جی سکے گی۔ آنکھیں کھولو بیٹے!"

اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسی لمحے مجھے اپنی پیشانی پر اس خوشبو کے بوسے کا احساس ہوا۔ یہ میرا انعام تھا۔ ایسی تازگی' ایسی فرحت' زندگی سے بھرپور۔ ایسی حرارت اور محبت اس سے پہلے کبھی میں نے محسوس نہیں کی تھی۔

پھر وہ جلد آنے کے لیے کہہ کر چلی گئی۔ کچھ دیر مجھے نقاہت سی رہی۔ میں فرش سے نہیں اٹھا اور لیٹے لیٹے ہی سیتا کی طرف کروٹ لی۔ میں نے اسے انگڑائی لے کر اُٹھتے دیکھا۔ اس پر مجھے حیرت ہوئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ گہری نیند سے اٹھی ہو۔ اس کی نظریں میری طرف نہیں تھیں۔

"سیتا!" میں نے اسے پکارا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر وہ لپک کر قریب آگئی۔ "کیا ہوا تھا؟... ہمیں کیا ہوگیا تھا شاہین؟" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔

"معلوم نہیں۔" یہ کہہ کر میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ "شاید ہم دونوں بہت دور نکل گئے تھے۔" میں نے دانستہ بات کا رخ تبدیل کردیا تھا۔

لمحے بھر کو اس کے حسین چہرے پر حیا کی سرخی نظر آئی۔

"ہاں شاید!... مگر مجھے کچھ یاد سا آرہا ہے۔" وہ اپنی پیشانی رگڑنے لگی۔ "میں اور تم... ہم دونوں فرش پر... یہاں ہم کیوں... کیوں لیٹ گئے تھے؟" وہ میرے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

"شاید ہمیں نیند آگئی تھی۔ ہم سو گئے تھے۔" بڑی حد تک اب میری نقاہت ختم ہوچکی تھی۔ "تم ایسا کرو کہ چائے بنالاؤ!... جوگیندر اور رنبیر کو اب تک لوٹ آنا چاہیے تھا۔ ہے نا؟" میں نے اس کے ذہن کو ایک اور طرف لگا دیا۔

"بھیا کی طرف سے فکر نہ کرو۔ وہ آجائیں گے۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"اپنے لیے بھی۔" وہ اٹھنے لگی تو میں بولا۔

سیتا چائے بنانے چلی گئی اور اسی وقت اسنیٰ لوٹ آئی۔

"حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کے ذہن سے وہ واقعہ محو کردیا ہے۔"

"مگر مجھے تو سب کچھ یاد ہے۔" میری آواز بہت دھیمی تھی۔ "مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے وہی تھے نا جنھوں نے...؟"

"ہاں وہی ہوسکتے ہیں مگر جب میں تم تک پہنچی وہ فرار ہو چکے تھے۔ میں انہی کی تلاش میں گئی تھی۔ مجھے اسی وقت خطرے کا احساس ہوگیا تھا جب میں نے خاشع کو دیکھا تھا۔ وہ دوغلا' جنات کے اس قبیلے سے ہے جنھیں ہم منافق کہتے ہیں۔ خود کو وہ مسلمان کہتا ہے مگر حقیقتاً مسلمان نہیں ہے۔ خاشع میرے پاس سردار ملیقا کا پیغام لے کر آیا تھا کہ میں سردار سے مل لوں۔ میں تمہاری طرف سے غافل نہیں تھی۔ تمہاری سرگرمیوں کا مجھے علم تھا۔ آج خاشع کی غیر متوقع آمد نے مجھے چونکا دیا۔ میری نظر میں وہ بھی مشتبہ رہا ہے۔ میں اسی لیے سردار ملیقا سے مل کر تمہارے پاس فوراً پہنچی اور وہ اثرات زائل کردیے جو تمہارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتے تھے۔ نہیں طارنوش! اس وقت مجھ سے کچھ نہ پوچھو! پہلے مجھے تمہاری حفاظت کا بندوبست کرنا ہے۔ میں پھر آؤں گی۔"

اسنیٰ کی مخصوص خوشبو معدوم ہوگئی۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر کچھ نہ پوچھ سکا تھا۔ حفاظت کے

بندوبست کا مطلب یہی ممکن تھا کہ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ مجھ پر دوبارہ بھی قاتلانہ حملہ ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں گھبرایا نہیں۔ میرے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ بزدل سامنے نہیں آرہے تھے اور اسیٰ ان کی تلاش میں تھی۔ چھپ کر وار کرنے والے بزدل ہی تو ہوتے ہیں! چاہے ان کا تعلق عالمِ جنات سے ہو یا وہ انسانوں میں سے ہوں۔ میرے جسم کی کھوئی ہوئی توانائی اب پوری طرح بحال ہو چکی تھی۔ سیتا چائے بنا کر لے آئی پھر جب ہم چائے کے آخری گھونٹ لے رہے تھے تو نیپو اور جوگیندر بھی لوٹ آئے۔

"تو یہ عیش ہو رہے ہیں!" جوگیندر ہنس کر بولا۔ "اکیلے اکیلے چائے پی جا رہی ہے۔"

"تم لوگوں کے لیے چائے بناؤں بھیا؟" سیتا نے پوچھا۔

جوگیندر اور نیپو دونوں ہی نے انکار کر دیا۔

"کیا رہا؟" میں نے نیپو اور جوگیندر کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"تمہارا شک بالکل درست نکلا۔ سعود صاحب کوتوالی ہی گئے تھے۔" جوگیندر بتانے لگا۔ "کوتوال شرما انہی کے ساتھ ان کی حویلی پہنچا تھا اور اپنا سر پیٹ کے رہ گیا تھا۔"

"اب کیا ارادے ہیں؟" میں مسکرا کر بولا۔

"نیک ارادے ہیں!"

"یعنی؟" میں نے وضاحت چاہی۔

جوگیندر نے جلالی سے اسی رات ہم دونوں ساتھیوں کے فرار کا جو منصوبہ بنایا تھا، میں اس سے مطمئن تو نہیں تھا مگر ان حالات میں کچھ اور ممکن بھی کب تھا! پولیس، جلالی کی ناکا بندی کیے ہوئے تھی۔ فرار کا انحصار پولیس کی حماقت اور ہماری ذہانت پر تھا۔

○☆☆☆○

نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی کہ میں اور نیپو انہی پولیس والوں میں شامل ہو گئے جو گشت پر تھے۔ ہم دونوں کے جسموں پر پولیس کی وردیاں تھیں۔ ان وردیوں کے حصول کی خاطر ہمیں دو پولیس والوں کو تختۂ مشق بنانا پڑا تھا۔ انہیں ہم نے بے ہوشی کی حالت میں منہ میں کپڑا ٹھونس کے امرودوں کے ایک باغ میں ڈال دیا تھا جو چھوٹے بمبے (چھوٹی نہر) کے قریب تھا۔ وہ دونوں اسی طرف گشت پر تھے۔ ان کی سائیکلیں بھی اب ہمارے قبضے میں تھیں، نیز دوسرا سامان بھی! اس سامان میں ہمارے لیے "قیمتی شے" ایک ٹارچ تھی۔ بارش کے موسم میں سائیکل پر سفر ٹارچ کے بغیر ذرا مشکل ہو جاتا۔

پولیس کی حماقت آخر رنگ لائی۔ ہمارے جسموں پر وردیاں دیکھ کر کسی نے پوچھ گچھ ضروری نہیں سمجھی۔ ہم دونوں ہی سائیکلوں پر سوار تھے۔ ٹارچوں کی روشنی کئی جگہ ہم پر پڑی مگر ہمیں روکا نہیں گیا، انہوں نے یہی سمجھا کہ ہم بھی انہی کی طرح گشت پر ہیں۔ ہم پولیس کا گھیرا توڑنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

"شاہین! ہم ٹھیک سمت میں تو جا رہے ہیں نا؟" جلالی سے کافی دور نکل آنے کے بعد نیپو نے سوال کیا۔

"لگتا تو یہی ہے، آگے اللہ مالک ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ سڑک پلیٹی ہی کی طرف جا رہی ہے۔ پلیٹی پہنچ گئے تو سمجھو آدھا راستہ طے ہو گیا۔"

جلالی اور علی گڑھ کے درمیان ایک جگہ کا نام پلیٹی تھا۔ اس جگہ علی گڑھ اور جلالی کے درمیان آنے جانے والے کچھ دیر ستا لیتے تھے۔ اسے پلیٹی کا اڈا کہا جاتا تھا۔ جلالی سے یہاں تک کچی سڑک تھی پھر پکی سڑک شروع ہو جاتی تھی۔ بارش کی وجہ سے پلیٹی تک کا راستہ خاصا دشوار گزار تھا۔ جگہ جگہ کچی سڑک دلدل کا نمونہ بنی ہوئی تھی پھر بھی ہم جیسے تیسے اس اڈے تک پہنچ ہی گئے۔ اڈا سنسان پڑا تھا۔ ابھی صبح ہونے میں خاصی دیر تھی۔

اڈے سے نکل کر ہم نے پولیس کی وردیوں سے جان چھڑائی۔ وردیوں کے نیچے ہمارے جسموں پر دوسرا لباس موجود تھا۔ وردیوں کو ہم نے سڑک کے کنارے دفنا دیا تھا۔ اپنے پیچھے ہم کوئی سراغ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔

صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تو ہم نے ایک قریبی گاؤں کا رخ اختیار کیا۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر دونوں سائیکلوں اور پولیس والوں سے حاصل ہونے والے سامان کو بھی ہم نے ٹھکانے لگا دیا۔ اس کے لیے ہمیں پانی سے بھرا ہوا ایک بڑا سا گڑھا مل گیا تھا۔ وہاں سے واپسی کا سفر ہم نے پیدل کیا۔ تقریباً نصف گھنٹے تک پیدل چلنے کے بعد ہم پھر اس پکی سڑک تک پہنچ گئے جو علی گڑھ کی طرف جا رہی تھی۔ سڑک پر آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جلالی کی طرف سے ایک یکا آتا نظر پڑا۔ اس میں صرف دو سواریاں تھیں۔ ہم نے اسے روک لیا۔ وہ علی گڑھ ہی جا رہا تھا۔

علی گڑھ پہنچنے کے بعد اچل تالاب کے اڈے پر میں اور نیپو جدا ہو گئے۔ رخصت ہونے سے پہلے وہ مجھ سے گلے ملا تھا اور میں نے اس کی آنکھوں میں نمی بھی دیکھی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "ساتھی! اگر خدا نے چاہا تو ہم کبھی مل بھی سکیں یا نہیں، بھول میں کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا!"

"پاگل!" یہ کہہ کر میں نے اسے پھر ایک بار گلے لگا لیا تھا۔

نیپو بھیڑ میں گم ہو گیا تو میں نے دودھ پور کی راہ لی۔ نیپو کو کہاں جانا تھا، نہ اس نے بتایا تھا نہ میں نے پوچھا تھا۔ جذبات کی رو میں آ کر تنظیم سے متعلق ارکان کبھی غیر ذمے داری کا ثبوت نہیں دیتے تھے۔ ہم سب ہی تنظیم کے اصول و ضوابط کا پورا خیال رکھتے۔ مجاہدِ اوّل کی ہدایات ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہتی تھیں۔

●●●✱✱●●●

میں کوٹھی پر پہنچا تو خالہ مجھے دیکھ کر لپٹ ہی گئیں۔ "طارنوش! تو خیریت سے تو ہے نا بیٹے؟" ان کی آواز بوجھل تھی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

مجھے علم تھا کہ خالہ سعیدہ مجھ سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتی ہیں مگر اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو میرے لیے خلافِ توقع تھے۔ "خیریت ہے خالہ مگر آپ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں؟ بیٹھیں کیا بات ہے؟" میں نے انہیں سہارا دے کر چوکی پر بٹھا دیا۔ ان کا جسم کانپ رہا تھا۔

"تیرے خالو کل ہی دہلی سے آئے تھے۔" خالہ نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔ "انہیں کسی نے بتایا تھا کہ تو جلالی میں ہے اور پولیس تجھے تلاش کر رہی ہے۔"

"پولیس کو میری تلاش کیوں ہونے لگی خالہ؟ کسی نے ایسے ہی خالو سے بے پر کی اڑا دی ہو گی۔" میں دانستہ انجان بن کر بولا۔ "آپ یقین کریں کہ میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ پولیس مجھے تلاش کرتی پھرتی۔ میں جلالی گیا ضرور تھا مگر صرف گھومنے کے لیے۔ خالو جان کہاں ہیں؟"

"وہ تیری ہی طرف سے فکرمند ہیں اور اسی چکر میں کہیں گئے ہیں۔" خالہ نے جواب دیا۔

خالہ کو مطمئن کر کے اور نہا کر کھانا کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس وقت تک بھائی عطا اللہ خان اور بھائی رحمت علی کالج سے واپس نہیں آئے تھے۔ میری خالہ زاد شگفتہ بھی گرلز کالج گئی ہوئی تھی۔ ملازمین کے علاوہ گھر میں صرف خالہ تھیں۔

بستر پر دراز ہو کر میں نے آنکھیں بند کر لیں تو سیتا کا چہرہ تصور میں آ گیا۔ چند ہی گھنٹوں کی رفاقت میں وہ میرے لیے حسین خواب بن گئی تھی پھر مجھے پُراسرار اسیٰ کا خیال آیا۔ وہ میری حفاظت کا بندوبست کر کے گئی تھی اور اب تک نہیں لوٹی تھی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔ بہت دن بعد مجھے گھر کا سکون ملا تھا۔ میں سارے دن سوتا رہا۔ مغرب سے کچھ پہلے مجھے ایک ملازم نے جگایا اور بتایا کہ میرے خالو خان بہادر ثناء اللہ خان بلا رہے ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں تھے۔

ابھی ملازم میرے کمرے سے گیا ہی تھا کہ بھائی عطا اللہ خان یعنی میری خالہ کے بیٹے آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔ "طارنوش! ابا جان سے دب کر بات نہ کرنا۔ میں تم سے صرف یہی کہنے آیا تھا، باقی باتیں تم سے رات کو ہوں گی۔" بھائی عطا اللہ خان میرے قریب بستر پر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے سے قدرے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ یقیناً ان کے علم میں بھی تمام باتیں آ چکی تھیں۔ "اکثر وہ خان بہادری کے زعم میں یہ بھول جاتے ہیں کہ انگریز کبھی ہمارا دوست نہیں ہو سکتا۔"

میں نے ان سے بھائی رحمت علی یعنی اپنے ماموں زاد کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا، وہ شہر گئے ہوئے ہیں۔

منہ ہاتھ دھو کر میں خالو جان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ میرے سلام کا جواب دے کر انہوں نے حقے کے لمبے لمبے کش لیے پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "تو آ گئے آپ؟ کہاں کہاں گھومے پھرے؟"

میں ان کے قریب ہی ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ "صرف جلالی گیا تھا۔" میں نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

"جلالی! کس لیے گئے تھے تم وہاں؟" ان کا لہجہ بدل گیا۔ اندازِ جواب طلبی کا تھا۔

"میں نے سنا تھا کہ جلالی کے قریب ہی کوئی بڑی سرکاری عمارت دھماکوں سے اُڑ گئی ہے، وہی دیکھنے گیا تھا۔"

"اس عمارت کو دیکھنے گئے تھے یا جلالی میں لوٹ مار کرنے اور کم عمر کی لڑکیوں کو اغوا کرنے؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں خالو جان؟" اس کے سوا میں کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ اتنے باخبر ہوں گے۔

"آپ نے ایک وطن پرست تنظیم بھی بنائی ہے! بہت خوب!" ان کی آواز میں چبھن تھی۔

"آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے خالو جان!" بھائی عطا اللہ خان کی ہدایت کے باوجود میں اب تک ان سے حفظِ مراتب کے تحت گفتگو کر رہا تھا۔ وہ بہرحال میرے بزرگ تھے۔ اپنے نانا جان کے سلسلے میں خود سری کا نتیجہ میں دیکھ چکا تھا۔ بعد میں مجھے پچھتانا پڑا تھا۔

"جھوٹ مت بولو!" میری بات سن کر خالو جان نے مجھے

ڈانٹ دیا۔ "مجھے سب کچھ معلوم ہے۔"

"میں یہی تو کہہ رہا ہوں خالو جان کہ آپ کو غلط معلوم ہوا ہے۔ مجھے بتایئے کہ آپ تک یہ اطلاعات کس نے پہنچائی ہیں؟"

"تمہارا کیا خیال ہے، مجھے بلا سبب حکومت نے خان بہادر کا اعزاز دیا ہے!"

"مجھے تو بس یہ معلوم ہے خالو جان کہ انگریز اپنے وفاداروں ہی کو اعزازات اور خطابات سے نوازتے ہیں۔"

"بکواس!" وہ غصے میں آ گئے۔ "مت بھولو کہ تم اس شخص سے گفتگو کر رہے ہو جسے خالو جان کہتے ہو۔ وطن پرستی کے نام پر تمہیں لوٹ مار کرتے اور لڑکیوں کو اغوا کرتے ہوئے شرم نہیں آئی؟"

"آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں خالو جان! مجھے بتایئے تا کہ آپ کو یہ باتیں کس سے معلوم ہوئی ہیں؟"

"بتا دوں گا۔" وہ کچھ نرم پڑ گئے۔ "پہلے تم یہ بتاؤ کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ سچ ہے؟"

"آپ نے جو کچھ کہا، سچ بھی ہے اور غلط بھی! انگریز حکومت اور ہندوؤں کے نقطہ نظر سے اسے سچ کہا جا سکتا ہے اور غلط اس بنا پر کہ حقیقت سے آپ ناواقف ہیں۔"

"الفاظ کے گورکھ دھندوں سے تمہارے جرائم پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ مجھ پر اغوا اور لوٹ مار کے الزامات عائد نہ کیجیے! اگر میں مجرم ہوں خالو جان تو پھر ماضی میں وہ سارے لوگ مجرم کہلائیں گے جنہوں نے بدیسی غاصب حکمرانوں سے ٹکر لی، جو وطن کی خاطر قربان ہو گئے۔" میری آواز پُرجوش ہو گئی۔

"تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟ کیا تم نے مرلی دھر کی بیٹیوں کو اغوا نہیں کیا؟ اس کی تجوری خالی نہیں کی؟"

"جوان لڑکیوں کو اغوا کرنے کا مقصد انہیں بے آبرو کرنا ہوتا ہے اور ڈکیتی کا مقصد حرام کی دولت کو اپنے تصرف میں لانا ہوتا ہے۔ میں اپنے خدا سے شرمندہ نہیں خالو جان! مجھ سے یہ گناہ سرزد نہیں ہوئے۔"

"ہر مجرم کے پاس اپنے جرم کی کوئی نہ کوئی تاویل ضرور ہوتی ہے مگر جرم ہر حال میں جرم ہے۔ قانون کی نظر میں کسی کی لڑکیوں کو اغوا کر کے لے جانا اور کسی کی تجوری، طاقت کے بل پر خالی کر دینا، اغوا اور لوٹ مار ہی کے زمرے میں آتا ہے۔" خالو جان کے لہجے کی سختی اب خاصی کم ہو گئی تھی۔

"میں کسی ایسے قانون کو نہیں مانتا جو مولانا حسرت اور مولانا محمد علی جوہر کی جدوجہد کو جرم اور انگریز حکومت کے ظلم کو جائز قرار دیتا ہو!"

"تم اچھی بحث کر لیتے ہو طارنوش! مگر تم نے جو کچھ کیا ہے، اس سے دکھ پہنچا ہے مجھے۔"

"لالہ مرلی دھر کے جرائم ایسے تھے کہ اسے اس سے کہیں زیادہ سخت سزا ملنی چاہیے تھی جو ملی! اس نے دھنساری کے ایک کسان خیر محمد کی بہن کو اغوا کیا تھا۔ میں نے مرلی دھر کا اصل چہرہ بے نقاب کر دیا۔ میں نے ... میں یہ بھی کہا۔ "اور وہ دولت جو لوٹی گئی، مرلی دھر نے ... کے ہندو سیٹھوں سے بٹوری تھی۔ اس نے جلالی کے ہندوؤں سے مل کر مسلمانوں کو قتل کرنے اور شدھی ... منصوبہ تشکیل دیا تھا۔ وہ دولت اسی لیے جمع کی گئی تھی۔ اسی سبب اس کی تجوری خالی کر دی گئی۔ اب وہ دولت ... سے بہتر کام پر صرف ہو گی۔ یقین کریں خالو جان کہ میں نے اس میں سے ایک پائی نہیں لی۔"

"تم کچھ بھی کہو طارنوش مگر مجھے تمہاری یہ روش ... نہیں ہے۔ تمہیں خبر نہیں کہ جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ ... جلالی میں ہو اور پولیس تمہاری تلاش میں ہے، تو میری ... حالت ہوئی! تمہاری خالہ کا کیا حال ہوا! تمہیں اندازہ ہے، وہ تم سے کتنی محبت کرتی ہیں!"

"لیکن آپ کو یہ کس طرح معلوم ہوا کہ پولیس میری تلاش میں ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔"

"تمہاری سیدھی کلائی کے پنچے پر زخم کا یہ بڑا سا ... پہلے ہی روز مجھے نظر آ گیا تھا۔" انہوں نے میرے سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جس شخص نے مجھے اطلاع دی تھی کہ تم نے جلالی میں حیدر عباس کے گھر ... کانفرنس کے مندوب کی حیثیت سے شرکت کی، اسی نے ... جلالی میں پیش آنے والے واقعات سے بھی آگاہ کیا تھا۔ ... بتایا تھا، پولیس ایک ایسے نوجوان کی تلاش میں ہے جس ... سیدھے ہاتھ کی کلائی کے پنچے پر زخم کا نمایاں نشان ہے۔ مجھے عطا اللہ سے جب یہ معلوم ہوا کہ تم اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کہیں سیر و تفریح کے لیے گئے ہو تو میں سمجھ گیا ... جلالی ہی گئے ہو گے۔ کلائی کے پنچے پر زخم کا نشان تمہاری طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ شاہین کا فرضی نام تم ہی نے اپنایا ہے اور پولیس کو دراصل تمہاری ہی تلاش ہے۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا، میں اب تمہاری یہ فضول حرکتیں آئندہ برداشت نہیں کروں گا، سمجھ گئے!"

"لیکن خالو جان! کیا آپ کی مشورہ مولانا جوہر اور

... جی کو نہیں دے سکتے؟" میرا لہجہ مودبانہ ہی تھا۔

"زبان نہ چلاؤ! بس کہہ دیا میں نے کہ آئندہ تم ان فضولیات میں حصہ نہیں لو گے! چلے ہیں بڑے وطن پرست بننے! جاؤ!" وہ پھر حقے کے کش لینے لگے مگر اب ان کی تیوریوں پر بل نہیں تھے اور چہرہ بھی پُرسکون تھا۔ وہ شاید میری وضاحت سے مطمئن ہو گئے تھے۔ میں کمرے سے نکل آیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد اسی روز ٹہلنے کی غرض سے بھائی عطا اللہ اور بھائی رحمت علی کے ساتھ میں کوٹھی سے نکلا۔ ٹہلنا تو خیر بہانہ تھا مگر اصل بات کچھ اور تھی۔ وہ دونوں یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ خالو جان سے میری گفتگو کا کیا نتیجہ نکلا! اس کے علاوہ انہیں یہ فکر بھی تھی کہ پولیس کس طرح میری طرف سے مشتبہ ہو گئی؟ بھائی ہونے کے علاوہ وہ میرے ... سیاسی ساتھی بھی تھے۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ میں مجاہد اول کے حکم پر کہیں گیا ہوں مگر یہ خبر نہیں تھی کہاں گیا ہوں! جو باتیں انہیں خالو جان کے توسط سے یا خالہ جان سے معلوم ہوئی تھیں، وہی ان کی معلومات کا ذریعہ بنی تھیں۔ مختصراً میں نے انہیں صرف وہی واقعات بتائے جو کسی حد تک پہلے ہی ان کے علم میں آ چکے تھے۔

"پولیس کو کسی نوجوان شاہین کی تلاش ہے، میری نہیں!" میں نے ہنس کر کہا۔ "رہی پنچے پر زخم کے نشان کی بات تو ایسے نشانات نہ جانے کتنے لوگوں کے جسموں پر ہوں گے۔ اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ نوجوان جسے جلالی میں دیکھا گیا تھا، ہندوستان کی بائیس کروڑ آبادی میں کہاں گم ہو گیا، کسے معلوم!" میرے انداز گفتگو سے وہ دونوں ہی مطمئن ہو گئے۔ انہیں میں نے خالو جان سے ہونے والی گفتگو بھی اختصار کے ساتھ بتا دی تھی۔

"حیرت ہے طارنوش کہ ابا جان کو تم نے رام کر لیا ورنہ ہم تو بہت پریشان تھے۔" بھائی عطا اللہ بولے پھر انہوں نے ایک بند لفافہ جیب سے نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "تمہارے لیے اس میں مجاہد اول کا کوئی پیغام لگتا ہے۔ سبز رنگ کا یہ لفافہ عموماً وہی استعمال کرتے ہیں۔"

میں نے ان سے وہ لفافہ لے کر جیب میں رکھ لیا جس پر میرا نام لکھا تھا۔ "آپ تک یہ لفافہ کس طرح پہنچا؟" میں نے پوچھا۔

"جب ہم دونوں کالج سے لوٹ کر آ رہے تھے تو راستے میں ایک بچہ یہ لفافہ پکڑا کر چلا گیا۔ مخصوص لفافہ اور تمہارا نام دیکھ کر اسے میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ دوپہر کو تم سو رہے تھے پھر سو کر اٹھے تو ابا جان نے تمہیں طلب کر لیا اور اب موقع ملا کہ میں تم تک یہ لفافہ پہنچا دوں۔" بھائی عطا اللہ نے وضاحت کی۔

اس لفافے میں کوئی فوری نوعیت کا پیغام بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے یہ سوچا ضرور مگر کچھ کہا نہیں، نہ وہ لفافہ کھول کر سرِ راہ پڑھا۔

"طارنوش! میں نے موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بندوبست کر دیا ہے کہ کالج سے تمہاری غیر حاضری ثابت نہ کی جا سکے۔" بھائی رحمت علی نے بتایا۔

"آپ نے ٹھیک ہی کیا مگر غیر حاضریاں تو اب آئندہ بھی ہوتی رہیں گی" میں نے کہا۔ "چلیں اب واپس چلتے ہیں۔"

ہم کوٹھی واپس آ گئے اور میں نے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی جیب سے لفافہ نکال لیا۔ لفافہ چاک کر کے میں نے پرچہ نکالا۔ وہ مختصر سا پیغام تھا۔ "کمپنی باغ میں رات کو دس بجے ملو!" اس فقرے کے نیچے ہاتھ سے بنائے ہوئے مختصر نقشے میں اس جگہ کی نشان دہی کی گئی تھی جہاں مجھے مجاہد اول سے ملنا تھا۔

اس وقت آٹھ بجنے والے تھے اور ابھی دس بجنے میں دیر تھی اس لیے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پیغام فوری نوعیت کا ثابت نہیں ہوا تھا۔ دودھ پورے سائیکل کے ذریعے کمپنی باغ تک کا راستہ آدھے پون گھنٹے سے زیادہ کا نہیں تھا پھر بھی میں نو بجے کے قریب کوٹھی سے نکل گیا۔ جلدی نکلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کمپنی باغ میں نے اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے باغ کا وہ حصہ بھی تلاش کرنا تھا جہاں نقشے کے مطابق پیڑوں کا جھنڈ تھا اور اسی کے پیچھے چھوٹا سا سبزہ زار تھا۔

جب میں وہاں پہنچا تو باغ کا صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں سائیکل اندر لے گیا۔ دائیں جانب باغ کے عقبی حصے میں مجھے پیڑوں کا جھنڈ تلاش کرنے میں دقت نہ ہوئی۔ باغ کے گرداگرد اقامتی علاقہ تھا۔ اس وقت بھی لوگ باغ میں تھے مگر تعداد خاصی کم تھی۔

میری توقع کے مطابق وہ سبزہ زار نیم تاریک ہی تھا۔ میں نے سائیکل کو تالا لگا کر ایک پیڑ کے سہارے کھڑا کر دیا اور قریب ہی گھاس پر بیٹھ گیا۔ مجاہد اول کا مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مقررہ وقت پر وہ پہنچ گیا۔ وہاں دور تک میرے سوا کوئی نہیں تھا۔

"ادھر آ جاؤ!" وہ یہ کہتا ہوا میرے عقب سے گزرا تھا اور میں نے اس کی بھاری آواز پہچان لی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سبزہ زار کے اس گوشے کی طرف بڑھ رہا تھا جو

تقریباً تاریک تھا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔

اس تاریک گوشے میں بیٹھ جانے کے بعد مجاہد اوّل نے جلالی سے بہ حفاظت نکل آنے پر مجھے شاباش دی' سعود صاحب کی حویلی سے فرار کے فیصلے کو سراہا اور موقع محل کے مطابق فیصلے کرنے کی تعریف کی پھر وہ کہنے لگا۔ "جوگیندر' نیپو اور تم نے سیٹھ مہیش' پنڈت گردھاری مل نیز دیگر متعصب اور بااثر ہندوؤں کو ہراساں کرنے کے لیے کل رات جو کچھ کیا' وہ مناسب نہیں تھا۔ وہ تمہاری ہی تجویز تھی؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ہم نے فرار ہونے سے قبل ان بااثر متعصب ہندوؤں کو اغوا کر لیا تھا جو جلالی اور اس کے گرد و نواح میں فسادات کی آگ بھڑکانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں جوگیندر اور اس کے ساتھیوں نے ہماری مدد کی تھی۔ انہیں ہم نے دھمکی دی تھی کہ اگر جلالی' دھنساری یا ارد گرد کے کسی بھی گاؤں میں فساد ہوا تو ان سب کو قتل کر دیا جائے گا۔ دھمکی دینے کے بعد انہیں ضربیں پہنچا کر بے ہوش کر دیا گیا تھا پھر ان کے ہاتھ پیر باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا ہم نے انہیں اناج منڈی کے صدر دروازے کے سامنے ڈال دیا تھا۔ یہ معلوم ہو کہ اس جگہ غلہ وغیرہ پڑا ہے' ایک ترپال بھی انہیں اُڑھا دیا تھا۔ اس کارروائی کے کچھ ہی دیر کے بعد میں اور نیپو' جوگیندر کے گھر سے روانہ ہو گئے تھے۔

مجاہد اوّل کو اس واقعے کی اطلاع دینے والا تنظیم ہی کا کوئی رکن ہو سکتا تھا۔

میرا جواب اثبات میں سن کر مجاہد اوّل نے برہمی کا اظہار کیا۔ "آئندہ کے لیے ایک بات ذہن نشین کر لو کہ تم اپنی سرگرمیاں صرف اپنی مہم تک محدود رکھو گے! تمہیں اس کا اندازہ تو ہو گا ہی کہ تم نے لالہ مرلی دھر کے خلاف اپنے طور پر قدم اٹھا کر تنظیم کو کتنے خطرے میں ڈال دیا تھا!"

"تیتو میر اور دوسرے تانگے والے کا کیا ہوا؟" میں نے دریافت کیا۔

"دونوں کو پولیس نے چھوڑ دیا ہے۔ واردات کے وقت اور سارے دن تیتو میر کی موجودگی دوسری جگہ ثابت ہو گئی۔ دوسرے تانگے والے قمر اور قاسم کے درمیان پرانی دشمنی تھی۔ یہ موقف اختیار کیا گیا کہ قاسم نے قمر کا نام دشمنی کی وجہ سے لیا تھا۔" مجاہد اوّل نے بتایا۔ "تمہاری کوشش کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جلالی پر سے بلا ٹل گئی ہے جس کی تیاری سیٹھ مہیش نے کی تھی۔" یہ تمام باتیں میرے لیے اطمینان بخش تھیں۔ "اور اب ۔۔۔ اب کچھ دن تمہیں کوئی مہم سپرد نہیں کی جائے گی۔ اگر ضرورت ... تمہیں کسی دور دراز علاقے میں بھیجا جائے گا۔ اس ... ہے کہ پولیس کو جس شاہین کی تلاش ہے' وہ کم از کم ... کے علاقے میں کہیں سرگرم نظر نہ آئے۔ وضاحت اس لیے کی ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ میں ... بتانے کے لیے تمہیں بلایا تھا۔ دوسری بات تمہیں ... کہ ذہنی طور پر کسی طویل سفر کے لیے تیار رہنا۔ ممکن ... تمہیں ملتان یا کلکتہ بھیجنا پڑے۔ ان دونوں ہی شہروں ... تشویش ناک خبریں ملی ہیں مگر ابھی کوئی جلدی نہیں ... پوچھنا تھا کہ کیا اس طرح تمہاری تعلیم کا نقصان ... گا؟"

"نہیں جناب!" میں نے جواب دیا۔ "اگر ... درپیش ہوا تو میں کالج سے چھٹی لے لوں گا۔ تعلیم ... یقیناً ضروری ہے مگر نصابی تعلیم میری نزدیک ایک ... ہے۔ آپ کی طرف سے جب بھی مجھے کوئی ایسا ... فوراً اس کی تعمیل کروں گا۔"

"تمہاری بابت اس کا اندازہ مجھے بھی ہو چکا ... تک کہ علم کو تم نصابی کتابوں تک محدود نہیں سمجھتے ... اس وقت تم سے یہی گفتگو کرنا تھی۔ اچھا خدا حافظ ..."

پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ کوٹھی پہنچ کر میں ... میں داخل ہوا ہی تھا کہ مجھے اسنٰی کی مخصوص خوشبو ... ہوئی۔

"طارنوش! تمہاری حفاظت کا بندوبست ہو گیا ..." اسنٰی کی پر اسرار سرگوشی سنائی دی۔ "کمرے کا دروا... کے میں بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ "مجھے اپنی زندگی کی ... میں اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتا ہوں ..."

"اس کا جواب میں تمہیں پہلے بھی دے چکی ... ابھی تم اس کے اہل نہیں ہوئے۔"

"اور تم نے یہ بھی تو کہا تھا کہ روحانی ریاضتوں ... میں اس کا اہل بن سکتا ہوں۔"

"بچوں کی طرح ضد نہ کرو طارنوش' تم اب ... چکے ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہارے دشمن کتنے ... ان سے انتقام لینا تو بہت دور کی بات ہے میرے ... ان کی تلاش ہی تمہارے لیے ممکن نہیں۔ فی الحال ... کے نادیدہ حملوں سے بچے رہو یہی بہت بڑی کامیابی ..." اسنٰی نے مجھے سورۂ جن کی چند آیات کا ورد کرنے ... تاکید کی۔ یہ آیات میں نے ذہن نشین کر لیں۔

"ہر علم کے حصول کی ایک عمر ہوتی ہے۔" اسنٰی کی ...رگوشی ابھری۔ "سنو طارنوش! ذہنی بلوغت اور جسمانی ...غت میں فرق ہوتا ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ میں نے تم سے ...ی بلوغت کا ذکر بھی کیا تھا۔ جب میں نے یہ محسوس کر لیا کہ ...نی طور پر بھی تم بالغ ہو تو تمہیں وہ روحانی ریاضتیں تعلیم کر ...ی جائیں گی۔ اُداس ہونے کی ضرورت نہیں میرے بچے! ...ں تمہارے جذبات سمجھتی ہوں۔ تمہارا اور میرا دکھ ایک ...ے تم سے تمہارے باپ اور مجھ سے میرا بھائی بچھڑ گیا ...ے صبر کرو' اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" اسنٰی کی ...رگوشی معدوم ہوتی چلی گئی۔

اسنٰی کی خوشبو رخصت ہوئی تو میں سورۂ جن کی ان ...ات کے مفہوم پر غور کرنے لگا جن کے ورد کی اس نے ...ید کی تھی۔

❁❁❁❁**❁❁❁❁

کالج میں ان دنوں توسیع کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ ...ے معلوم ہوا کہ اس کا آغاز بہت پہلے نواب محسن الملک ہی ...ے زمانے سے ہو چکا تھا۔ سرسید کی وفات کے بعد محسن ...ملک' حیدر آباد دکن سے علی گڑھ آ گئے تھے اور نواب وقار ...ملک بھی انہی کے ساتھ تھے۔ یہ دونوں ہی سرسید کی زندگی ...ں اور انہی کے ایما پر حیدر آباد گئے تھے۔ ریاست حیدر آباد ...کن میں محسن الملک' مدار المہام سالار جنگ اوّل کے زمانے ...ں گئے تھے اور پھر سالار جنگ دوم کے زمانے میں وہ مشیر ...ل کے عہدے پر فائز تھے۔ سرسید ہی کے ایک اور رفیق ...ی نذیر احمد نے بھی سرکار دکن کی ملازمت قبول کر لی تھی' ...ردہ اپنے مزاج کی تیزی کے سبب محسن الملک سے پہلے ہی ...رسید کی زندگی میں علی گڑھ آ گئے تھے۔ سرکار دکن میں ان ...ی ملازمت کا بندوبست سرسید کے ایما پر محسن الملک ہی نے ...یا تھا۔

کالج کی توسیع کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم کا آغاز ...ہوں نے ہی کیا پھر وقار الملک (مولوی مشتاق حسین) نے ...ر ان کے بعد آنے والوں نے بھی اس مہم کو جاری رکھا۔ ...ن الملک اورینٹل کالج کو مسلم یونی ورسٹی بنانا چاہتے تھے ...ر اب یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا تھا۔ علی گڑھ کالج کا ...ک طالب علم ہونے کی حیثیت سے اس پر مجھے بھی خوشی ...ہ۔ علی گڑھ آ کر مجھے پہلی بار علی گڑھ تحریک کی اہمیت کا ...ساس ہوا تھا۔ یہ جان کر بھی مجھے بے پناہ مسرت ہوئی تھی ...میرے پہلے سیاسی آئیڈیل مولانا محمد علی جوہر نے بھی اسی ...ے بی اے کیا تھا۔ جہاں اب میں زیر تعلیم تھا۔ مشہور و معروف ادیب سجاد حیدر یلدرم بھی مولانا جوہر ہی کے ساتھیوں میں سے تھے' میری مراد علی گڑھ کے ساتھیوں سے ہے۔

اب میں کالج کے معاملات میں گہری دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس کا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مجاہد اوّل نے اب تک مجھے کوئی مہم نہیں سونپی تھی۔ مطالعے کے علاوہ میرا زیادہ تر وقت کالج کے دوستوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ انہی دوستوں میں سے ایک کریم الدین تھا۔ اس کا تعلق اڑیسہ سے تھا۔ ہم دونوں میں قدر مشترک یہ تھی کہ وہ بھی انگریزوں کے سخت خلاف تھا۔ دوسرا سبب سیاست سے اس کی دلچسپی تھی۔ کریم الدین کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا۔ ایک روز میں اور کریم الدین کالج کے نو تعمیر حصے کی سیر کر رہے تھے۔ ہمارا موضوع گفتگو وہی تھا جو عموماً ہوتا تھا۔ کریم الدین کو فیکر اینڈ فیکس جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ عموماً وہ اپنی گفتگو میں ہندسے ضرور استعمال کرتا تھا۔ وہ دھواں دھار بول رہا تھا۔ بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی عیاشیاں زیر بحث تھیں کیوں کہ انگریز لٹیروں نے پہلے بنگال ہی کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا تھا۔

کریم الدین کہہ رہا تھا۔ "بنگال کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی عیاشیوں کا سب سے زیادہ نشانہ بننا پڑا۔" اپنی عادت کے مطابق وہ فوراً بہ طور ثبوت کہنے لگا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ بنگالی عوام پر قرضوں کا بوجھ سات لاکھ پونڈ اسٹرلنگ سے تیس لاکھ اسٹرلنگ تک پہنچا دیا گیا تھا اور یہ عرصہ صرف سینتیس سال یعنی سترہ سو بانوے سے اٹھارہ سو انتیس تک کا تھا۔"

میں اس کی حوصلہ افزائی کے لیے بولا۔ "یقیناً برادر عزیز' یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔"

میری حوصلہ افزائی پر اسے اور جوش آ گیا۔ "ان لٹیروں نے سترہ سو اکنانوے سے اٹھارہ سو سینتیس تک کے عرصے میں بتیس لاکھ پونڈ اسٹرلنگ ہندوستان سے برطانیہ منتقل کیے حتیٰ کہ جب کمپنی کے تجارتی حقوق اٹھارہ سو ... میں معطل ہوئے تو اسے ہندوستان میں اپنے سرمائے پر ساڑھے دس فی صد سود کی ادائیگی سے نوازا گیا۔ برطانوی حکومت نے پینتیس ہزار جاگیریں ضبط کر لیں اور ان سب کے عوض مسلمان بنگالی کو کیا ملا' صرف تین پیسے روزانہ!"

"جانِ عزیز! اگر تحریک آزادیٔ ہند ناکام نہ ہوتی تو سارا قرض اُتر جاتا۔ میرے خیال میں اس تحریک کا خاتمہ' غلط منصوبہ بندی اور عدم اتحاد کی وجہ سے ناکامی کی صورت میں نمودار ہوا اور بعد میں اسی کی سزا مسلمان قوم کو بھگتنا پڑی۔"

کریم الدین پھر اپنے موقف کی تائید میں بولا۔

"ہندوستان بھر کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بنگال کا مسلمان بھی اس سے متاثر ہوا۔ اڑیسہ کے مسلمانوں نے اپنے کمشنر کے ذریعے ایک یادداشت ملکہ وکٹوریہ کو بھیجی تھی۔ اسے پڑھ کر دل کٹنے لگتا ہے۔" اس کے بعد جیسے کریم الدین کہیں کھو گیا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ خواب کے عالم میں یا کسی سحر زدہ شخص کی طرح بول رہا ہو۔ ۱۸۵۷ء میں جب تحریک آزادیِ ہند کا خاتمہ ہوا اور اقتدار براہِ راست برطانیہ کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اڑیسہ کے مظلوم مسلمانوں نے اسی کے کچھ عرصے بعد یہ یادداشت ملکہ وکٹوریہ کو بھجوائی تھی جس کے الفاظ کریم الدین کے زخمی دل سے میری سماعت میں منتقل ہو رہے تھے۔ یہ آواز کریم الدین کی نہیں بلکہ ان تمام مظلوموں کی آواز تھی جنہیں انگریز لٹیروں نے کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیا تھا۔ کریم الدین اس یادداشت کے الفاظ دہرا رہا تھا۔ "ہم مسلمان وہ مچھلی ہیں جو پانی سے باہر ہو اور مزید یہ کہ ہم لوگ اس زمین کے دور دراز کونوں تک جا سکتے ہیں، ہمالہ کی فلک بوس برف سے ڈھکی چوٹیوں پر چڑھ سکتے ہیں۔ سائبیریا کے بے آباد علاقے میں گردش کر سکتے ہیں۔ اگر ہم لوگوں کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ اس طرح سفر کرنے سے ہمیں ایک سرکاری نوکری مل سکتی ہے جو شخص دس شلنگ بچنے کی ضمانت دیتی ہو۔ ہمارے پاس ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ ہم چلتے ہوئے سمندر میں کود جائیں اور ڈوب مریں یا پھر اڑیسہ کی پہاڑیوں میں کہیں گم ہو جائیں۔" یادداشت کے آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے کریم الدین کی آواز بھرا گئی۔ اس روز ہم دیر تک نوحہ کرتے رہے۔

میرے حلقۂ احباب میں کریم الدین کے علاوہ میرا ایک دوست مظہر علی بھی تھا۔ اس کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ مظہر علی مجھ سے سینئر تھا۔ وہ علی گڑھ سے قانون کی سند لینے آیا تھا۔ کچھ عرصے وہ کلکتے میں بھی رہا تھا جہاں اس کے والد کا کاروبار تھا۔ اس کی سیاسی وابستگی مسلم لیگ سے تھی اور قائدِ اعظم کے مداحوں میں تھا۔ مظہر علی ہی نے مجھے مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاسوں کا آنکھوں دیکھا حال سنایا جس نے مسلم لیگ اور کانگریس کے بارے میں معلومات میں اضافہ کیا۔ اسی کے ساتھ قائدِ اعظم کی پُرکشش شخصیت سے میری دلچسپی بڑھی۔ مظہر علی نے مجھے رفتہ رفتہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کا مداح بنا لیا۔ میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں، اس وقت تک جناح صاحب کو "قائدِ اعظم" کا لقب نہیں ملا تھا۔ یہ بہت بعد کی یعنی ۱۹۳۸ء کی بات ہے کہ "الامان" دہلی کے مدیر مولانا مظہر الدین نے جناح صاحب کے لیے "قائدِ اعظم" کا لقب تجویز کیا پھر پاکستان کے قیام سے صرف دو ... مجلس قانون ساز نے یہ قرارداد منظور کی کہ جناح صا... تمام دستاویزات اور قانونی کاغذات میں "قائدِ اعظ... جائے۔ جناح صاحب سے لگاؤ کا سبب علی گڑھ تحر... تھی۔ جس کے نتیجے میں مسلم لیگ وجود میں آئی ... ہندوستانی سیاست کے سارے رخ اب میری نظر میں ... تھے۔ علی گڑھ تحریک ہر سطح پر مسلمانوں کے حقوق کی ... تھی اور اب یہی جنگ ایک بے تیغ سپاہی (محمد علی جنا... رہا تھا۔ اس سپاہی کا نعرہ وہی تھا جو سرسید کا نعرہ تھا ... اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔

خلافت تحریک بھی مسلمانوں پر ظلم کے خلاف ز... آواز تھی۔ مولانا جوہر کا منشا یہ تھا کہ اس معرکے میں ... ان کے ساتھ انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائیں او... بڑی حد تک اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے تھے۔ جوہر اور جناح صاحب کا مقصد ایک ہی تھا، یعنی مسلما... بقا، مگر راستے مختلف تھے۔ سازشی ہندو سیاست کو جسے ... سید نے اور پھر جناح صاحب نے محسوس کر لیا تھا ... جوہر نے سات سال بعد (۱۹۲۹ء) محسوس کیا اور وہ ... سے الگ ہو گئے۔

انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ ہندو بھی تھے اور ... بھی مگر پہلا نشانہ مسلمان بنے کیوں کہ انہوں نے ... ہی سے حکومت چھینی تھی۔ کانگریس اور خلافت تحریک ... لیگ اور علی گڑھ تحریک سب ہی انگریزوں کے خلاف ... اس کے علاوہ زیرِ زمین وطن پرست مسلح تنظیم بھی انگریز... خلاف جدوجہد میں مصروف تھی۔ اب میرے ... مولانا جوہر اور مجاہد اوّل کے ساتھ ساتھ جناح صاح... تھے۔ یہ تینوں میرے نزدیک ایک ہی منزل کے مسافر ... میں نے ان خیالات کا اظہار نہ اپنے خالہ زاد عطا... سے کیا، نہ ماموں زاد رحمت علی سے۔ اس موضوع پر ... مظہر علی سے جب میری ملاقات ہوئی تو جناح صاحب ... پہلے (۱۹۳۴ء) مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو چکے تھے ا... مسلم لیگ کی قیادت کر رہے تھے۔

❂❂❂**❂❂❂

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ میں ایک روز سیتا کو خط ... تھا۔ سیتا کی تصویر میرے سامنے تھی۔ یہ وہی تصویر ... اس نے مجھے البم سے نکال کر دی تھی۔ جلالی سے آ... بعد سیتا اور جوگیندر سے میری خط و کتابت جاری تھی ... ان دونوں بہن بھائی کو نہیں بھول سکا تھا اور پھر سیتا کیسے بھول جاتا جو میری خاطر مسلمان ہونے تک پہ راضی تھی۔ اس نے مجھے خط میں لکھا تھا۔ "شاہین جی! میرا دھرم تو آپ ہیں۔ آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ ہمارے بیچ مذہب کی دیوار ہے تو جب آپ کہیں گے، میں یہ دیوار گرا دوں گی۔ میں سیتا ہوں تو آپ کی ہوں اور آپ کا دھرم اپنا کر کسی اور نام سے جانی پہچانی جاؤں گی تو بھی آپ ہی کے چرنوں کی دھول رہوں گی۔" پھر اس نے ہجر کی لمبی راتوں کا احوال لکھا تھا اور پوچھا تھا، کب ملیں گے؟

تنظیم کے سخت اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ابھی تک میں نے سیتا پر اپنی اصل شخصیت ظاہر نہیں کی تھی کہ کیا خبر مجاہد اوّل کو یہ بات پسند نہ آئے۔ سیتا سے ملنے کو بہت جی تڑپ رہا تھا مگر میں جلالی کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔ ہر چند کہ جلالی کی مہم کو خاصا عرصہ گزر چکا تھا مگر مجاہد اوّل نے واضح الفاظ میں مجھ سے کہا تھا کہ اب شاہین کی حیثیت سے مجھے کم از کم ملک کے کسی شمالی علاقے میں نظر نہیں آنا چاہیے۔ یوں بھی جلالی کی پولیس کو میری تلاش تھی۔ اگر معاملہ صرف ذاتی ہوتا تو شاید میں اپنے دل کا کہا مان لیتا اور جلالی جا کر سیتا سے مل لیتا مگر اس معاملے کا تعلق تنظیم سے بھی تھا۔ انفرادی مفاد پر اجتماعی مفاد کو قربان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جلالی سے چلتے وقت میں نے سیتا کا پتا تو لے لیا تھا مگر اپنا پتا اسے نہیں دیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ علی گڑھ جا کر پتا بھیج دوں گا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد جب کریم الدین سے میری گاڑھی چھننے لگی تو "شاہین معرفت کریم الدین" خط و کتابت شروع ہو گئی۔ کریم الدین کی معرفت مجھے سیتا اور جوگیندر کے خطوط مل جاتے تھے۔ کریم الدین کو میں نے اعتماد میں لے لیا تھا۔ اسے میں نے بتا دیا تھا کہ ایک ہندو دوشیزہ سے میرا عشق چل رہا ہے اور میں کوٹھی کے پتے پر اس سے خط و کتابت کرنا نہیں چاہتا۔ بہ طورِ احتیاط میں نے یہ فرضی نام اختیار کیا ہے۔ کریم الدین نے بھی ... سیتا یا جوگیندر کا خط اسی سبب مجھے کسی اور کی موجودگی میں نہیں دیا۔

میں اس شام سیتا کے حسین خیالوں میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب میری خالہ زاد شگفتہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی اور کب میری کرسی کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں چونکا اس وقت جب شگفتہ نے مجھے مخاطب کیا۔

میں اس وقت سیتا سے "ہم کلام" تھا اور جب کوئی اپنے محبوب سے ہم کلام ہو تو پھر محبوب کے سوا اسے کوئی نظر نہیں آتا۔ میں اس خط کے الفاظ کو ذریعہ بنا کر اپنی سیتا سے کہہ رہا تھا۔ "جاناں، اداس کیوں ہو، ہجر کی یہ لمبی رات بہت جلد صبحِ وصال بن جائے گی اور..."

"اچھا تو جناب کسی کو لو لیٹر لکھا جا رہا ہے۔" خلافِ توقع شگفتہ کی آواز سن کر میں تقریباً اچھل پڑا اور غیر ارادی طور پر سیتا کی تصویر اور خط پر کتاب رکھ دی۔ "اب کیا فائدہ ہم نے تو خط پڑھ بھی لیا!" وہ بولی۔ "ابھی ہم امی جان کو جا کر بتاتے ہیں۔"

"اے لڑکی! یہ کیا بدتمیزی ہے! کسی کا خط پڑھ لینا غیر اخلاقی حرکت ہے اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ میں کسی کو لو لیٹر نہیں لکھ رہا تھا، ایک افسانہ لکھ رہا تھا جس میں ہیرو اپنی محبوبہ کو خط لکھتا ہے۔ یہ خط اسی افسانے کا حصہ ہے۔" میں نے حواس بجا ہونے پر بات بنائی۔

مگر شگفتہ بھی آفت کی پڑیا تھی، ہنس کر کہنے لگی۔ "او یہ تو میں بھول ہی گئی تھی کہ جناب طارنوش اس ملک کے عظیم افسانہ نگار بھی ہیں۔"

"بکو مت اور فوراً یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ۔ مجھے افسانہ مکمل کرنے دو!"

"میرا خیال ہے کہ اس افسانے کا عنوان وہ تصویر ہے جو حضور نے افسانے کے ساتھ ساتھ کتاب کے نیچے چھپا دی ہے۔ تصویر دکھا دیں شرافت سے ورنہ سارا بھانڈا پھوڑ دوں گی۔ بولیں دکھا رہے ہیں تصویر کہ بتا دوں امی جان کو سب کچھ!"

"پاگل لڑکی! یہ تصویر میری نہیں میرے ایک ہندو دوست کی ہے۔ یہ لڑکی اس کی منگیتر ہے۔"

"اگر آپ افسانہ نگار نہیں بھی ہیں تو مستقبل میں اس کے بڑے روشن امکانات ہیں۔ گھڑی بھر میں وہ افسانہ تراشتے ہیں کہ سننے والا اگر کاٹھ کا الّو ہے تو فی الفور افسانے کو حقیقت سمجھ لے۔ ویسے آپ کے اس افسانے پر مجھے کامل یقین ہے۔ دراصل آپ کے دوست کو یہ خطرہ ہو گا کہ کہیں اس کے پاس کوئی یہ تصویر دیکھ نہ لے اسی لیے اس نے اپنی منگیتر کی تصویر آپ کے پاس رکھوا دی ہو گی۔ یہی بات ہے نا؟" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیسے جان چھڑاؤں؟ مجبوراً مجھے سیتا کی تصویر اسے دکھانا ہی پڑی۔

"یہ ہوئی نا بات!" اس نے تصویر میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "اب سچ سچ ایک بات اور بتا دیں! ایمان سے کسی سے نہیں کہوں گی، پکا وعدہ!"

"بکو!"

"ہم فرمایا کرتے ہیں، بکتے نہیں ہیں۔" وہ ایک ادا سے

بھلی اور اس وقت وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ آج میں نے پہلی بار اسے نظر بھر کے دیکھا تھا۔

"اچھا فرمادیں۔ ارشاد!" میں نے بھی اسے گھسنا شروع کردیا۔

"جی! بندی یہ فرماتی ہے کہ حضور جو افسانہ خونِ دل سے رقم کر رہے ہیں کیا اس کا امکان ہے کہ یہ افسانہ مکمل ہو جائے۔"

"جب افسانہ شروع ہو گیا ہے تو ایک نہ ایک روز مکمل بھی ہو ہی جائے گا۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ سیتا کی تصویر اور خط وہ دیکھ چکی تھی اور اتنی بھولی بہرحال نہیں تھی کہ میری باتوں میں آجاتی۔

"نیک خواہشات کے ساتھ رہی ٹرن!" اس نے تصویر واپس کردی۔

"اپنا پکا وعدہ یاد رکھنا!"

"ہاں ہاں یاد رکھیں گے۔ یہ افسانہ جب تک خود ہی اشاعت پذیر نہیں ہو جائے گا کسی کے علم میں نہیں آئے گا تاکہ کوئی سرقہ نہ کرلے۔ ارے میں وہ بات تو اس افسانے کے چکر میں بھول ہی گئی جو کہنے آئی تھی۔ امی جان آپ کو یاد کر رہی ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اپنا دھنک رنگ دوپٹا شانوں پر سنبھالتی ہوئی چلی گئی۔

شگفتہ کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ آئندہ سیتا کو خط لکھتے ہوئے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا کروں گا۔ بقیہ خط رات کو لکھنے کا فیصلہ کر کے میں خالہ جان سے ملنے ان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ "جی خالہ جان؟" میں ان کے قریب چوکی پر ہی بیٹھ گیا۔

"طارنوش بیٹے! تم میری مرحومہ بہن کی واحد نشانی ہو۔ رات کو مجھے ایک خیال آیا تھا۔ آج صبح میں تمہارے خالو جان سے بھی اس سلسلے میں بات کر چکی ہوں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ میں پہلے دہلی جا کر بھائی ڈیسوزا اور اپا حضور سے بات کروں' اس کے بعد ہی وہ کوئی فیصلہ کریں گے مگر میں۔ بیٹے میں پہلے تمہاری مرضی جاننا چاہتی ہوں۔ تمہاری مرضی کے بغیر میں بات آگے بڑھانا نہیں چاہتی۔" خالہ بڑی محبت سے بولیں۔

میرا ماتھا ٹھنکا کہ آخر ایسی کیا بات ہے جس کے لیے خالہ جان اتنی تمہید باندھ رہی ہیں! "بتائیں تو خالہ جان' کیا بات ہے؟" میرے دل میں ایک اندیشہ سا پیدا ہوا! پھر خالہ جان نے جو کچھ کہا' اس سے میرے اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ شگفتہ سے میری شادی کرنا چاہتی تھیں اور اسی سلسلے میں میری مرضی معلوم کر رہی تھیں۔

"ابھی۔ خالہ جان' ابھی تو میں ہرگز اس پر آمادہ نہیں ہوں۔ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔" میں بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکا۔

"ابھی نہ سہی پھر سہی مگر اتنا تو بتا دو بیٹے کہ تمہیں یہ رشتہ قبول تو ہے نا؟"

"میں ابھی کچھ۔ کچھ نہیں کہہ سکتا خالہ جان!" میں فوری طور پر انکار کر کے ان کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ "میں سوچ کر بتاؤں گا۔ فی الحال آپ۔ آپ دہلی نہ جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ کچھ بجھ سی گئیں۔ "جب سوچ لو تو بتا دینا۔"

میں ان کے کمرے سے چلا آیا اور قدرت کی اس ستم ظریفی پر غور کرنے لگا۔ وہ لڑکی جو نادانستگی میں میرے عشق کی رازدار بن گئی تھی' اسی سے میری شادی کی بات ہو رہی تھی! میرے لیے یہ صورتحال خاصی پریشان کن تھی۔

رات کو میں نے سیتا اور جوگیندر کو خط لکھے۔ جوگیندر مجھے جب بھی خط لکھتا تھا' اس میں یہ استفسار ہوتا تھا کہ مجاہد اول سے میری ملاقات ہوئی یا نہیں؟ میں نے جلالی کے دوران قیام میں جوگیندر سے یہ وعدہ کیا تھا کہ تنظیم کے ساتھ اس کا یا اس کے ساتھیوں کا اشتراک اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مجاہد اول اس کی اجازت نہ دے دے' میں اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔

جلالی سے علی گڑھ آنے کے بعد مجاہد اول سے میری صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا تھا کہ یہ بات کر سکوں۔ اس کا ایک سبب مجاہد اول کی برہمی بھی تھی۔ جلالی سے روانگی کے وقت میں نے جوگیندر سے اور اس کے ساتھیوں کی مدد سے جن متعصب اور بااثر ہندوؤں کو اغوا کیا تھا' ان کے اغوا کیے جانے پر ہی مجاہد اول نے میری سرزنش کی تھی۔ اس موقع پر جوگیندر سے اشتراک کی بات مناسب نہ ہوتی پھر اس کے بعد مجاہد اول کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا! جوگیندر کو میں نے ایک خط میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ مجاہد اول سے فی الحال میرے رابطے کی کوئی صورت نہیں لیکن اب جب بھی ملاقات ہو گی' میں اس سے ضرور بات کروں گا۔ جوگیندر کے حالیہ خط میں بھی یہی ذکر تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ کوئی نئی مہم درپیش ہو تو میں اسے اور سیتا کو ضرور مطلع کروں۔ وہ دونوں ہی کسی ایسی مہم میں میرا ساتھ دینے کے آرزو مند تھے۔ خود میری خواہش بھی تھی کہ سیتا سے

ملاقات کا کوئی بہانہ بنے۔

اسی دوران میں امتحانات شروع ہو گئے اور میں ان کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں میرا ارادہ دہلی جانے کا تھا۔ خالہ جان کو ابھی تک میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا' نہ ہی خود انہوں نے کوئی بات کی تھی۔ وہ شاید میرے امتحانات ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔

❁❁❁❁✱✱❁❁❁

اس روز میں آخری پیپر دے کر لوٹ رہا تھا کہ ایک اجنبی سائیکل سوار مجھے سبز لفافہ دے کر تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔ طویل عرصے کے بعد مجاہد اول نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ میں سبز رنگ کے اس مخصوص لفافے کو پہچان گیا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس وقت میں یہی سمجھا کہ مجاہد اول علی گڑھ آچکا ہے اور شاید آج ہی اس سے میری ملاقات ہو جائے مگر کوٹھی پہنچ کر جب میں نے اس کا پیغام پڑھا تو میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ علی گڑھ میں نہیں تھا۔ پیغام یہ تھا۔ "آج سے تین روز بعد دہلی میں بعد نمازِ مغرب مزارِ سرمد کے سامنے پہنچ جاؤ۔"

یہ پیغام پڑھ کر مجھے کچھ تعجب سا ہوا۔ اس سے پہلے کبھی مجاہد اول کسی ایسے مقام پر نہیں ملا تھا جہاں دوسرے لوگوں کی آمدورفت بھی ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی ایسی جگہ اپنا چہرہ نقاب کے پیچھے کس طرح چھپا سکتا تھا! دہلی میں ملاقات کا مطلب یہی تھا کہ اسے اندازہ تھا کہ میں امتحانات کے بعد دہلی ہی جاؤں گا۔" بھائی رحمت علی بھی امتحانات سے فارغ ہو چکے تھے۔ ان کا ارادہ بھی دہلی جانے کا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ ساتھ ہی چلیں گے۔"

اگلے ہی روز میں نے دہلی جانے کا پروگرام بنا لیا اور بھائی رحمت علی کو بھی اس سے آگاہ کردیا۔ خالہ جان کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھ سے وہی سوال کیا جس کی مجھے توقع تھی۔ وہ خود ہی میرے کمرے میں آگئی تھیں۔ اس وقت میں اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔ میرے اور ان کے سوا کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

"خالہ جان! معاف کیجیے گا' امتحانات کی تیاری میں مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ آپ نے مجھ سے کوئی بات کہی تھی اور مجھے اس کا جواب بھی دینا تھا۔ میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ آپ۔ آپ مطمئن رہیں' اب جو چھٹیوں کے بعد میں آؤں گا۔"

"طارنوش بیٹے!" انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ "لگتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو یا پھر یہ سوچ رہے ہو کہ تمہارے جواب سے مجھے تکلیف نہ پہنچے تو بیٹے ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمہاری ماں کی جگہ ہوں' مجھ سے صاف کہہ دو جو تمہارے دل میں ہے۔"

"یہ بات نہیں خالہ جان! دراصل میں نے شگفتہ کے بارے میں کبھی اس طرح سوچا نہیں۔ میں آپ سے اسی لیے مزید کچھ وقت چاہتا تھا۔" میں نظریں جھکا کر بولا۔

"مجھے تمہاری بات سے انکار نہیں' قریبی رشتوں میں ایسا ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے' تم چھٹیاں گزار کر آجاؤ۔ ہاں تم سے یہ بات ضرور کہنا تھی کہ میرے لیے جیسی شگفتہ اور عطا اللہ ویسے تم۔ میں نے نہ کبھی ان دونوں پر اپنی مرضی مسلط کی نہ تمہارے معاملے میں ایسا چاہتی ہوں۔ تمہارا بھائی عطا اللہ بھی ابھی تک تمہاری ہی طرح شادی کرنے پر رضامند نہیں۔ اسے بھی میں نے مجبور نہیں کیا۔ میری جو خواہش تھی وہ میں نے تمہیں بتا دی' آگے تم جانو۔ یقین کرو میں اس وقت تک بات آگے نہیں بڑھاؤں گی جب تک تم ہاں نہیں کر دو گے البتہ یہ ضرور کہوں گی کہ کوئی فیصلہ کرنے میں بہت زیادہ دیر نہ لگا دینا۔"

میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا اور پھر وہ مجھے دعائیں دیتی ہوئی چلی گئیں۔ اس وقت میں نے اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس کیا اور سوچا' کاش میں انہیں یہ خوشی دے سکتا اور سیتا درمیان میں نہ آئی ہوتی۔ میری ماں زندہ نہ سہی خالہ تو تھیں! میں اکثر ان کے چہرے میں اپنی ماں کا چہرہ تلاش کیا کرتا تھا۔

اس رات میں دیر تک اپنی ماں ہی کے بارے میں سوچتا رہا اور اسی تعلق سے مجھے اپنے مقتول باپ ہاموس اور اسنی کا خیال آیا۔ میں نے کافی عرصے سے اسنی کی پُراسرار سرگوشیاں نہیں سنی تھیں۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ میرے باپ کے قاتل اور میرے دشمن' اسنی کو بھی تو کوئی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں ایسے ہی خیالات آ رہے تھے کہ اچانک مجھے اپنے قریب اسنی کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی۔

"طارنوش!" اسنی کی پراسرار سرگوشی ابھری۔ "اب تم میری طرف سے بھی فکرمند رہنے لگے! میں تم سے زیادہ دور نہیں تھی۔ سنو! تمہارے ذہن میں پیدا ہونے والے اندیشے غلط ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنی حفاظت کرنے کی اہل ہوں۔ میرا بھائی اور تمہارا باپ اس لیے مارا گیا کہ وہ دشمنوں کی طرف سے غافل تھا مگر میں چوکنا ہوں۔ انشاء اللہ وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔"

"اتنے دن سے تم میرے پاس کیوں نہیں آئیں؟" میں نے پوچھا۔
"میں تو اکثر تمہارے پاس ہی رہتی ہوں۔" اس نے بتایا۔
"لیکن مجھے تمہاری خوشبو تو محسوس نہیں ہوتی۔" میں بولا۔
"میری خوشبو تمہیں اسی وقت محسوس ہوتی ہے جب میں تمہارے بالکل قریب آجاتی ہوں۔" اس نے وضاحت کی۔
"بہت دن سے میرے ذہن میں ایک بات اٹکی ہوئی تھی کہ کبھی اسنیٰ سے پوچھوں گا۔ اس نے ایک منافق خاشع پر شک کا اظہار کیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب مجھ پر میرے پُراسرار دشمنوں نے پہلی بار قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ میں اسنیٰ سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ اگر اسے خاشع پر شبہ تھا تو اس نے خاشع کے ذریعے دشمنوں کا سُراغ لگانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ یا کوشش کی تھی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ پھر اس سے پہلے کہ میں اسنیٰ سے کچھ دریافت کرسکتا اس نے میرے خیالات پڑھ لیے۔ مجھے اس کی سرگوشی سنائی دی۔ "خاشع کا مطلب عاجزی کرنے والا اور چاپلوس ہے۔ اس سے کچھ معلوم کرنا بہت مشکل ہے پھر بھی میں نے کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوئی اور عالمِ جنات میں ایک خاشع ہی کیا' اب تو منافقوں کی خاصی تعداد ہو چکی ہے۔ وہ بس نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ خیر چھوڑو یہ ایک الگ قصہ ہے' آدم زادوں میں بھی تو منافقوں کی کمی نہیں۔ میں تمہیں ان سے بچے رہنے کی تاکید کرتی ہوں۔ ہاں مجھے اس پر خوشی ہے کہ میں نے تمہیں سورۂ جن کی جن آیات کا ورد کرتے رہنے کے لیے کہا تھا' تم اس پر عمل کر رہے ہو۔ میری طرف سے آئندہ فکرمند نہ ہونا! جب میں ضرورت محسوس کروں گی یا تمہیں جب میری ضرورت محسوس ہوگی' تم مجھے اپنے قریب پاؤ گے۔ اب آیات کا ورد کرکے سو جاؤ' خدا حافظ!"
اسنیٰ چلی گئی اور پھر میں اس طرف سے مطمئن ہو کر کچھ ہی دیر بعد نیند کی مہربان آغوش میں پہنچ گیا۔
دوسرے دن میں' بھائی رحمت علی کے ساتھ دہلی کے لیے روانہ ہوگیا۔
دہلی پہنچ کر بھائی رحمت علی نے تو حویلی کی راہ لی اور میں تانگے سے اپنے گھر کے سامنے اتر گیا۔ شام کا وقت تھا اور ڈیڈی اپنے دفتر سے آچکے تھے۔ میری آمد سے سارے گھر میں جیسے عید سی ہوگئی۔ ممی اور ڈیڈی دونوں ہی بہت خوش تھے۔

پھر جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو ممی میری طرف دیکھ کر ڈیڈی سے کہنے لگیں۔ "تم دیکھ رہے ہو ڈیسوزا' میرا بیٹا کتنا دبلا ہو گیا ہے' میں کہہ رہی تھی نا تم سے کہ یہ اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتا ہوگا۔"
"کوئی دبلا وبلا نہیں ہوا۔ ہر ماں کو اپنا بیٹا تمہاری طرح دبلا نظر آتا ہے۔" ڈیڈی مسکرا کر بولے پھر مجھ سے کہنے لگے۔ "کیوں بھئی طارنوش' دبلے ہوگئے ہو تم؟"
"ہاں یہ تو ضرور تمہیں بتائے گا۔" ممی مجھ سے پہلے بول اٹھیں۔ "تمہیں تو بس میری بات سے اختلاف کا کوئی موقع ملنا چاہیے۔"
"دیکھو بھئی ایلین' آج میں ہرگز تم سے لڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں' آج میرا بیٹا بہت دنوں بعد گھر آیا ہے۔"
"میں لڑتی ہوں تم سے یا۔"
"تم بالکل نہیں لڑتیں' میں لڑتا ہوں تم سے! بس خوش!"
ڈیڈی کی بات پر ممی نے بُرا سا منہ بنایا اور ڈیڈی مجھے مسکراتا دیکھ کر ہنس پڑے۔ "اب یہ بڑا ہو گیا ہے۔ تمہیں..." ڈیڈی نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اکیلے میں لڑ لیا کرو!" کہہ کر پھر ڈیڈی ہنسنے لگے۔
کھانا کھانے کے بعد میں نانا جان کی حویلی کی طرف نکل گیا۔ ڈیڈی ہی نے مجھ سے وہاں جانے کو کہا تھا کہ اپنے نانا جان کو سلام کر آؤ! وہ نہ بھی کہتے تو میں وہاں جاتا۔ نانا جان ان دنوں کچھ علیل تھے۔ اس کا علم مجھے علی گڑھ ہی میں ہو چکا تھا۔ بھائی رحمت علی نے نانا جان کی علالت کے بارے میں مجھے بتایا تھا۔ حویلی پہنچ کر سب سے پہلے میں نانا جان ہی سے ملا۔ وہ واقعی بیمار نظر آرہے تھے۔ میں نے مزاج پرسی کی اور بیماری کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے۔ "بڑھاپا خود ایک بیماری ہے طارنوش بیٹے! گھٹنوں میں درد رہنے لگا اور بس خاص کوئی خاص بات نہیں۔ تم سناؤ تمہارے خالو جان اور خالہ جان کیسے ہیں؟"
"خیریت سے ہیں۔" میں نے بتایا اور پھر مزید کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر اٹھ آیا۔
پھر میں گھر کے تمام ہی افراد سے ملا۔ عظمت علی تو میرا پیچھا چھوڑنے ہی کو تیار نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اس وعدے پر میری جان چھوڑی کہ کل صبح اس کے ساتھ شطرنج کی کم از کم تین بازیاں لگیں گی۔ زاہدہ اور رابعہ دونوں نے مجھے خلوت کے اشارے کیے مگر میں ایسا بن گیا جیسے ان کا اشارہ سمجھا ہی نہیں۔ دونوں میں سے میں کسی کے کمرے میں

نہیں گیا۔ وہ دونوں ہی مجھے نانی اماں کے پاس مل گئیں تھیں اور وہیں میں نے ان کی خیر خیریت پوچھ لی تھی۔ لگتا تھا وہ ابھی مجھے بھلا نہیں سکی تھیں۔
دوسرے دن صبح جب میں حویلی پہنچا تو رابعہ کو مجھ سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع مل گیا' کہنے لگی۔ "طارنوش! تم ہو بہت سنگ دل!"
"مگر یہ تو بڑے راز کی بات تھی چندا' تمہیں کیسے معلوم ہوگئی؟"
"تم مجھے یوں چٹکیوں میں نہیں اُڑا سکتے' سمجھے! کل تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلے؟ میں نے تمہیں اشارہ بھی کیا تھا!"
"اس لیے مائی ڈیئر کزن کہ میں تم سے ڈرتا ہوں۔ اب کچھ آیا عقل شریف میں!۔ اچھا ذرا سا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو جاؤ' بھائی رحمت علی ادھر آرہے ہیں۔" وہ مجھ پر لدتے لدتے چونک کر پیچھے ہٹ گئی اور میں ہنس پڑا۔ وہ اس وقت مڑ کر دیکھ رہی تھی۔
"دیکھا ڈر گئیں نا!" میں بولا۔ "جس کے دل میں چور ہوتا ہے' اسی طرح ڈر جاتا ہے۔"
اس کا منہ بن گیا اور میں یہی چاہتا بھی تھا۔ اسی وقت عظمت علی شطرنج کی بساط اور مہرے لے کر آگیا۔ میں نشست گاہ میں اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ادھر وہ اپنے کمرے سے بساط اور مہرے لائے گیا' ادھر رابعہ نشست گاہ میں آگئی تھی۔
"ہاں بھئی رابعہ' اب تم تو دو گیارہ ہو جاؤ! آج بہت دن بعد طارنوش کو شکست دینے کا موقع ملا ہے۔" عظمت علی نے بساط بچھاتے ہوئے کہا۔
رابعہ پہلے ہی میری باتوں سے خفا ہوگئی تھی' بولی۔ "جی' جا رہی ہوں! میرے پاس فضول وقت نہیں ہے ضائع کرنے کو!" اس نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور چلی گئی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہنا چاہتی ہو' اچھا پھر سمجھوں گی تم سے! عظمت علی مہرے لگانے میں مگن تھا۔
دہلی پہنچ کر دوسرا پورا دن حویلی ہی میں گزرا مگر میں رابعہ کے ہتھے نہیں چڑھا۔ تیسرے دن میں خود اس کے کمرے میں چلا گیا اور اسے سنجیدگی سے سمجھایا کہ جو بات ختم ہو چکی سو ہو چکی' اب دبی ہوئی چنگاریاں کریدنے سے کچھ حاصل نہیں۔
"تم نے ختم کی ہوگی بات' میں نے نہیں!" وہ پھر اپنی پہلی روش پر آگئی۔
کافی دیر اسے سمجھانے بجھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اُداس

ہوگئی اور میں یہ موقع غنیمت جان کر اس کے کمرے سے نکل آیا۔
آج مجھے دہلی آئے تیسرا دن تھا اور آج ہی مغرب کے بعد مزارِ سرمد کے سامنے مجاہدِ اوّل سے ملنا تھا۔ میں اسی لیے حویلی سے دوپہر کے بعد ہی لوٹ آیا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر میں شاہی دروازے سے نکل رہا تھا تو میری نظریں سرمدؒ کے مزار ہی کی طرف تھیں۔
میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُتر کر مقررہ جگہ تک پہنچ گیا۔ وہاں ٹہلتے ہوئے مجھے ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ عقب سے کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور میں چونک اُٹھا پھر میں نے جیسے ہی مڑ کر دیکھا' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "ٹیپو!"
"شاہین!" اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا پھر بولا۔ "آؤ چلیں!"
"مگر کہاں؟۔۔ میں تو یہاں۔۔" میری آواز دھیمی ہو گئی۔ "مجاہدِ اوّل کا انتظار۔۔"
"انہی کے حکم پر میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" اس نے مسکرا کر بتایا۔
میں نے طویل سانس لیا اور مجھے جو حیرانی علی گڑھ میں ہوئی تھی' ختم ہوگئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "وہ کہاں ہیں؟"
"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن جہاں ان سے تمہاری ملاقات ممکن ہے' وہاں تک میں تمہیں ضرور پہنچا دوں گا۔"
میں ٹیپو کے ساتھ چل دیا۔ وہ سارا ہی علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ بازار رضیا محل سے گزر کر وہ چتلی قبر کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں چتلی صاحب کا مزار ہے' وہاں سے وہ دائیں جانب کو مڑا پھر کئی گلیوں سے گزر کر ایک تنگ سی گلی میں ٹھہر گیا۔ گلی میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ اس نے ایک گھر کے دروازے پر رُک کر دستک دی۔
"کون ہے؟" اندر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔
"شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔" ٹیپو نے شہید سلطان ٹیپو کا مشہور قول دھیمی آواز میں دہرایا۔
"آج بارش نہیں ہوگی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی بھاری دروازہ کھل گیا۔
اندر نیم تاریکی تھی۔ ٹیپو میرا ہاتھ تھامے اندر پہنچ گیا اور دروازہ بند کر لیا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ٹیپو اور دروازہ

کھولنے والے شخص نے جو الفاظ ادا کیے تھے' وہ شناختی رہے ہوں گے یعنی نئے کوڈ ورڈز!

مجھے جلالی کی یاد آ گئی۔ وہاں بھی کچھ ایسی ہی فضا تھی۔ ڈیوڑھی سے گزر کر ہم ایک راہداری میں پہنچ گئے۔ دائیں بائیں میں نے دو کمروں کے دروازے دیکھے۔ دائیں جانب والے دروازے میں نیپو اور دروازہ کھولنے والا مجھے ساتھ لیے داخل ہوئے۔ وہ بڑا سا چوکور کمرا تھا۔ ایک جانب دیوار سے لگے دو بڑے بڑے تخت بچھے ہوئے تھے جن پر گدے اور چاندنیاں بچھی تھیں' دیوار سے لگے دو تین گاؤ تکیے رکھے تھے ایک تخت کے سامنے تین چار مونڈھے پڑے تھے۔ ان میں پشت والا ایک مونڈھا بھی تھا' ساتھ ہی ایک میز رکھی تھی۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس کمرے کا جائزہ لے لیا۔ ایک طاقچے میں چمنی والا لیمپ روشن تھا۔

"بیٹھو شاہین!" نیپو نے ایک مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

میں دوسرے مونڈھے پر بیٹھ گیا تو نیپو نے دروازہ کھولنے والے سے میرا تعارف کرایا۔ نیپو نے مجھے اس کا نام بخت خان بتایا جو ظاہر ہے کہ فرضی ہی ہو گا۔ ویسے یہ نام اس شخص پر کھپتا تھا۔ چھوٹی سی خوبصورت داڑھی اس کے چہرے پر تھی اور بڑی بڑی روشن آنکھیں اس کی ذہانت کی طرف اشارہ کر رہی تھیں' قد لمبا اور جسم گٹھیلا تھا' سر پر بڑے بڑے بال تھے جو شانوں تک آ رہے تھے۔ عمر میں وہ مجھ سے بڑا تھا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی ساتھی!" میں نے گرم جوشی کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا۔

"اور مجھے بھی!" اس کی آنکھیں مسکرائیں۔

"کیا مجاہد اوّل بھی یہاں موجود ہیں؟" میں نے نیپو کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

میرے سوال کا جواب نیپو کے بجائے بخت خان نے دیا۔ "وہ بس آتے ہی ہوں گے۔ اس لیے میں اجازت چاہتا ہوں۔"

"بخت خان چلا گیا تو اس کمرے میں صرف میں اور نیپو رہ گئے۔

"تم یہاں کب آئے نیپو؟" میں نے پوچھا۔

"کل ہی پہنچا ہوں۔" وہ بولا۔

"مجاہد اوّل سے تمہاری ملاقات ہوئی؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں مگر شاید ملاقات ہو جائے اس لیے کہ تم بھی آ گئے ہو۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ مجاہد اوّل ہی کے حکم پر تم مزار سرمدؒ پہ مجھے لینے پہنچے تھے؟"

"غلط نہیں کہا تھا۔ مجاہد اوّل کا حکم مجھے بخت خان کے ذریعے ملا تھا۔"

میری اور نیپو کی گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ دور سے دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں ہی چپ ہو گئے پھر چند لمحے بعد میں نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ میں نے سوچا کہ شاید مجاہد اوّل آ گیا ہے۔ ذرا دیر گزری تھی کہ کمرے کے باہر قدموں کی چاپ اُبھری اور پھر معدوم ہو گئی۔ یقیناً کوئی اس راہداری سے گزرا تھا جو کمرے کے پہلو میں تھی۔

آہٹیں رک گئیں تو نیپو اور میں دوبارہ باتیں کرنے لگے۔ میں بولا۔ "تم شاید اسی گھر میں ٹھہرے ہو؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "اور حیدر علی بھی یہیں ہے۔"

"حیدر علی!۔ مگر مجھے تو وہ نظر نہیں آیا۔ اور کیا سراج الدولہ بھی ہے؟" میں نے جلالی کی مہم میں شریک اپنے ایک اور ساتھی کے متعلق سوال کیا۔

"نہیں' وہ نہیں ہے۔" نیپو نے بتایا۔ حیدر علی مجھ سے پہلے یہاں موجود تھا اور تم؟۔ میرا مطلب ہے کہیں اور قیام ہے تمہارا؟ کیوں کہ تمہارے ساتھ کوئی سامان۔"

"ہاں میں اور جگہ ٹھہرا ہوں۔" میں نے پُرسکون آواز میں کہا پھر حیدر علی کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ قدموں کی چاپ راہداری میں پھر سنائی دی۔

"یہ گھر خاصا بڑا ہے۔ اس کمرے کو تو تم ایک طرح کی نشست گاہ سمجھو' اندر اور بھی کئی کمرے ہیں۔ انہی میں سے ایک کمرے میں ہم دونوں یعنی میں اور حیدر علی ہیں۔ جب میں تمہیں لینے گیا تھا تو حیدر علی کو اسی کمرے میں چھوڑ گیا تھا' وہ وہیں ہو گا۔"

نیپو کے الفاظ ختم ہوئے تھے کہ بخت خان ایک سینی میں تین گلاس شربت لے کر آ گیا۔

"ارے ساتھی' اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے ایک گلاس اٹھا لیا۔

"ساتھیوں میں تکلف کیسا! ممکن ہے کہ کہیں اور یہ خدمت آپ کے سپرد ہو اور میں آپ کی جگہ ہوں۔" بخت خان مسکرا کر بولا۔

"کیا مجاہد اوّل آ گئے؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

اس دوران میں نیپو نے بھی شربت کا گلاس سینی سے اُٹھا لیا تھا۔

"جی ہاں' وہ تشریف لے آئے ہیں اور کچھ دیر بعد آپ کو طلب کریں گے۔" بخت خان نے جواب دیا اور پھر تیسرا شربت کا گلاس سینی میں رکھے وہاں سے چلا گیا۔ اپنی گفتگو سے وہ مجھے بڑا کھرا اور صاف گو شخص معلوم ہوا تھا۔ شربت کا تیسرا گلاس یا تو حیدر علی کے لیے تھا یا پھر مجاہد اوّل کے لیے۔ اگر خود بخت خان کو شربت پینا ہوتا تو گلاس کو سینی میں رکھ کر لانے کی ضرورت نہیں تھی یا اگر لایا ہی تھا تو ہمارے ساتھ بیٹھ کر شربت پیتا۔

شربت بڑا خوش ذائقہ تھا' اس سے گلاب کی خوشبو آ رہی تھی۔ گرمی کے موسم میں اس سے عمدہ مدارت کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے گلاس خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔ جلالی میں میزبانی کے فرائض تیتو میر نے ادا کیے تھے اور یہاں بخت خان تھا۔ بخت خان کے لب و لہجے سے مجھے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھی میری طرح دلّی کا رہنے والا ہے۔ بہرحال وہ کہیں کا بھی رہا ہو مگر اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ لباس اور وضع سے بھی وہ کسی اچھے گھر کا لگتا تھا۔ اچھے گھر سے میری مراد کسی مہذب گھرانے سے ہے۔

جلد ہی بخت خان لوٹ آیا اور اس نے مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا پھر وہ نیپو سے مخاطب ہوا۔ "آپ بھی چلیے!"

نیپو کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ میرے ساتھ اس کی طلبی بھی ہو گئی تھی۔ اس کمرے سے نکل کر راہداری سے گزرنے کے بعد ہم صحن میں پہنچے۔ بخت خان نے ہم دونوں کو رُکنے کو کہا اور دائیں جانب ایک کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا جس کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔

"بخت خان غالباً حیدر علی کو لانے گیا ہے۔ ہم دونوں اسی کمرے میں ہیں۔" نیپو نے آہستہ سے کہا۔

میں اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ بخت خان نے کمرے کا بھڑا ہوا دروازہ کھولا اور پھر اس کی دھیمی آواز سنائی دی۔ چند ہی لمحے کے بعد مجھے حیدر علی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بخت خان کے ساتھ ہی ہماری طرف آ رہا تھا۔ گھر میں عجیب سی پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی میں بخت خان اور حیدر علی کے قدموں کی چاپ کا تسلسل غیر فطری سی فضا پیدا کر رہا تھا۔ نیم تاریکی میں حیدر علی نے مجھے اور میں نے اسے دیکھا۔ قریب آ کر اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بعض اوقات ایک دوسرے کا لمس وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے جسے الفاظ ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

شاید اسی لیے نہ وہ کچھ بولا نہ میں نے کچھ کہا۔ بخت خان کی رہنمائی میں ہم تینوں آگے بڑھ رہے تھے' نیپو' میں اور حیدر علی! وہ ایک دالان سا تھا' دائیں اور بائیں جانب دروازے نظر آ رہے تھے۔ سامنے بھی بڑا سا دروازہ تھا۔

بخت خان بائیں جانب نظر آنے والے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا اور ہم تینوں اس کی تقلید کر رہے تھے۔ اس نے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔

"آ جاؤ!" اندر سے مجاہد اوّل کی بھاری آواز آئی۔

بخت خان کے ساتھ ہم نے بھی اس چھوٹے سے کمرے میں قدم رکھا جس میں برائے نام روشنی تھی۔ بہ مشکل مجھے دائیں بائیں دیوار کے قریب رکھے ہوئے مونڈھے نظر آئے۔ دو مونڈھے ایک طرف اور دو دوسری طرف رکھے تھے۔ سامنے پلنگ تھا اور قریب ہی طاقچے میں لیمپ جس کی لو انتہائی مدہم تھی۔ پلنگ کے پاس ہی پشت والے مونڈھے پر بیٹھا ہوا شخص مجاہد اوّل ہی ہو سکتا تھا۔ ہم چاروں کے علاوہ کمرے میں صرف وہی تھا۔ "بیٹھ جاؤ!" آداب و تسلیمات کے بعد ہمیں حکم ملا۔

ہم چاروں باری باری دائیں بائیں موجود مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ مجاہد اوّل نے بخت خان کے سوا باری باری ہم تینوں کی خیریت دریافت کی پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شاہین! مجھے تمہاری ذہانت پر بھروسا ہے۔ کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ نیپو اور حیدر علی اتنے عرصے کے بعد تمہیں پھر کیوں نظر آ رہے ہیں؟"

"اس لیے اے مجاہد اوّل کہ ان دونوں سے میری ذہنی مطابقت ہے۔" میں نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

"اور کوئی سبب؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"آپ مجھے پھر ایک بار اپنے اعتماد پر اُترنے کا موقع فراہم کرنا چاہتے ہوں گے۔"

"تم نے درست سمجھا۔" وہ بولا اور پھر چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ "اس مرتبہ جو مہم درپیش ہے اس کا نگراں بخت خان ہو گا۔ تمہیں یقیناً یاد ہو گا کہ میں نے خاصے عرصے پہلے تم سے کہا تھا کہ ممکن ہے تمہیں ملتان یا کلکتہ بھیجنا پڑے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے۔ بخت خان ایک بار پہلے بھی ملتان جا چکا ہے۔ تم چاروں ہی کو ملتان جانا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس مہم یا اس کے پس منظر کے بارے میں کچھ کہوں' تمہیں کچھ کہنا تو نہیں؟"

"مجھے کچھ عرض نہیں کرنا مجاہد اوّل! میں ذہنی طور پر اس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔ صرف ایک درخواست کرنا تھی

جس کا موقع مجھے پہلے نہیں مل سکا مگر "میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا' بخت خاں اور اپنے دوسرے دو ساتھیوں کے سامنے کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا اسی لیے بات پوری نہ کر سکا۔

میں چند ہی لمحوں کو خاموش ہوا تھا کہ مجاہد اوّل بول اُٹھا۔ "تم اپنے ساتھیوں پر اعتماد کر سکتے ہو شاہین! میرا قیاس ہے کہ تم شاید ان دونوں بہن بھائی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہو جن سے پہلی مہم میں تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟"

مجھے مجاہد اوّل کی بات پر شدید حیرت ہوئی۔ واقعی وہ بہت باخبر رہتا تھا۔ میں نے فوراً ہی اقرار کر لیا۔ "جی ہاں!"

"اس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ فی الحال تم لوگوں سے مجھے انتہائی اہم باتیں کرنا ہیں۔ پہلے میں تم لوگوں کو اس مہم کا پس منظر بتاؤں گا پھر مہم کے متعلق گفتگو کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحے توقف کیا پھر کہنے لگا۔ "جیسا کہ تم سب ہی جانتے ہو کہ متعصب ہندو خصوصاً برہمن طبقہ ہندوستان کی سرزمین میں اپنے ناپاک عزائم کی سیاسی فصل بو رہا ہے مگر ہماری اصل جنگ کا رخ ابھی صرف انگریز غاصبوں کے خلاف ہے۔ یہ ہندو طبقہ تو محض موقع سے فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ موجودہ سیاسی صورتحال یہ ہے کہ کانگریس' خلافت تحریک اور مسلم لیگ نے کم از کم ایک مسئلے پر اتحاد کر لیا ہے اور وہ مسئلہ ہندو مسلم اتحاد ہے۔ یہ ایک دانش مندانہ فیصلہ ہے۔ دانش مندانہ اس اعتبار سے کہ اس فیصلے سے ہمارے اصل دشمن انگریز پر ضرب پڑے گی۔ اس ملک کے رہنے والے اگر انگریز کے خلاف متحد ہو جائیں تو اس کے پیر بہت جلد اکھڑ جائیں گے مگر بدقسمتی کہہ لو یا تاریخی جبر کہ یہ اتحاد میری نظر میں دیرپا ثابت نہیں ہو گا۔ یہ اتحاد میرے نزدیک مصنوعی اتحاد ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ اس وقت کانگریس کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے' وہ مصلحتاً ہندو مسلم اتحاد کا راگ الاپ رہے ہیں۔ دل سے انہوں نے اس اتحاد کو قبول نہیں کیا۔ یقیناً تم سب بھی ان سیاسی حالات سے بے خبر نہیں ہو گے۔ بلا جھجک بتاؤ کہ کیا میرا تجزیہ غلط ہے؟"

کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر اس خاموشی کو سب سے پہلے بخت خاں نے توڑا' وہ بولا۔ "ہرچند کہ سیاست ہمارا میدان نہیں اور ہم خود کو اس جنگ کا گمنام سپاہی تصور کرتے ہیں جو ہم لڑ رہے ہیں لیکن کچھ باتیں ہم بھی جانتے ہیں۔ ہماری یہ جنگ انگریز حکمرانوں کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ اس سرزمین کے مستقبل کا تحفظ بھی ہے۔ یہی جنگ سیاسی سطح پر مسلمان سیاسی رہنما لڑ رہے ہیں۔ یعنی بالواسطہ ہم انہی کی راہ آسان کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود کل کیا صورت پیش آئے گی' ہم حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن موجودہ سیاسی صورت میں ہمیں اسی مصنوعی اتحاد کو تقویت دینا چاہیے۔ ہندو کانگریسی رہنماؤں کے متعلق یقیناً آپ کا تجزیہ درست ہے۔ رہے کانگریس میں شامل مسلمان رہنما یا خلافت تحریک تو یہ ایک الگ موضوع ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس وقت اس موضوع پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔"

مجھے بخت خاں کی بے لاگ بات پر قدرے حیرت ہوئی۔ اسی وقت مجاہد اوّل نے مجھے مخاطب کیا۔ "تم کچھ کہنا چاہتے ہو شاہین؟"

"جی ہاں اے مجاہد اوّل! پہلے تو میں یہ عرض کروں گا کہ بخت خاں کے خیالات سے مجھے پورا اتفاق ہے' دوم یہ کہ خلافت تحریک' مسلم لیگ اور دیگر چند مسلم رہنماؤں کی نیک نیتی پر مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا اپنی ذات پر ہے۔ دیگر مسلم رہنماؤں میں بہ طور مثال میں مولانا حسرت موہانی' مولوی اے کے فضل حق وغیرہ کے نام لے سکتا ہوں۔ ان ناموں کے علاوہ بھی اور بہت سے نام ہیں مثلاً مولانا ظفر علی خاں' شیخ غلام حسین ہدایت اللہ' سردار عبدالرب نشتر وغیرہ!" میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ بات کی۔

"مجھے خوشی ہوئی شاہین کہ تم موجودہ ہندوستانی سیاست اور مسلمان رہنماؤں سے پوری طرح باخبر ہو۔ تم نے جو چند نام لیے ان مسلمان سیاسی رہنماؤں کا تعلق ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہے۔ شمالی صوبے (یوپی) کے علاوہ پنجاب اور پھر سرحد سے بنگال تک جس میں سندھ کا علاقہ بھی شامل ہے' تمہارے احاطہ فکر سے باہر نظر نہیں آتا مگر تم شاید ایک بات بھول گئے۔ وہ اہم بات یہ ہے کہ سیاست سے براہ راست ہماری تنظیم کا کوئی تعلق نہیں۔ تمہارے جذبات و خیالات یقیناً قابل قدر ہیں اور وہ تمام مسلمان رہنما بھی قابل عزت ہیں۔ جن کے تم نے نام لیے مگر ہم اپنی عملی جدوجہد کے لیے سیاسی تجزیے تو کر سکتے ہیں' سیاست سے وابستگی ہمارا منصب نہیں۔ بخت خاں نے بالکل ٹھیک کہا کہ ہم انہی سیاسی رہنماؤں کی راہ آسان کر رہے ہیں جو یہی جنگ سیاسی سطح پر لڑ رہے ہیں۔" مجاہد اوّل کی آواز میں بڑا سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ اس نے شاید یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں عملاً نہ سہی ذہنی طور پر سیاست سے خصوصاً تحریک خلافت اور مسلم لیگ سے وابستگی رکھتا ہوں۔ اس نے اسی لیے یہ بات دہرائی تھی کہ تنظیم کا سیاست سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ اس کا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ میں واقف تھا' میں علی گڑھ میں زیر تعلیم ہوں۔

بخت خاں اور مجھے بولنے کا موقع دینے کے بعد مجاہد اوّل نے ٹیپو اور حیدر علی سے دریافت کیا کہ انہیں تو کچھ نہیں کہنا؟ ان دونوں ہی نے مجاہد اوّل کے سیاسی تجزیے سے مکمل اتفاق کیا اور مزید کوئی بات نہیں کی۔ پھر مجاہد اوّل نے بولنا شروع کیا۔ مجھے اس کی آواز یوں محسوس ہوئی جیسے وہ خواب میں بول رہا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "سنو! جب کوئی بلند و بالا عمارت تعمیر ہوتی ہے تو اس کی بنیادوں میں مضبوط پتھر رکھے جاتے ہیں کہ بنیاد کمزور نہ ہو۔ سو ہم سب ایسے ہی پتھروں کی طرح ہیں۔ وہ عظیم الشان اور بلند و بالا عمارت جو یقیناً مستقبل میں کبھی نہ کبھی ضرور تعمیر ہو گی' ہم۔ ہاں ہم ہی سب اس کی بنیاد کے پتھر ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دیکھنے والے صرف اس عمارت کو دیکھ سکیں گے اور بنیاد میں رکھے ہوئے پتھر انہیں نظر نہیں آئیں گے۔ وہ اس عمارت کے معماروں کو تو جان لیں گے اور نہیں جان سکیں گے تو ان پتھروں کو جو عمارت کی بنیاد بن گئے تھے۔ ہم نے یہ سودا جان بوجھ کر کیا ہے۔ کہو کیا یہ سودا مہنگا ہے؟ کیا ہم نے گھاٹے کا سودا کیا ہے؟ کیا ہم سودائی ہیں؟"

"نہیں!" ہم چاروں ہی کے منہ سے بہ یک وقت ایک ہی لفظ نکلا۔

"آفرین ہو تم پر کہ آنے والے زمانے تم ایسے گمنام سپاہیوں کی قبروں پر عقیدت کے پھول چڑھائیں گے۔ تم تاریخ کا حصہ نہ سہی وقت کا حصہ ضرور ہو اور وقت کبھی نہیں مرتا!"

مجاہد اوّل کے ان الفاظ کے بعد دیر تک سکوت چھایا رہا۔ ہم اس نیم تاریک کمرے میں ایک دوسرے کے سانسوں کی آواز سنتے رہے۔ مجاہد اوّل کے الفاظ نے میرے لہو کی گردش تیز کر دی تھی اور شاید یہی حال میرے ساتھیوں کا تھا۔ مجاہد اوّل بھی غالباً اسی کیفیت سے گزر رہا ہو گا۔ اس کی خاموشی بے معنی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہم سب ہی اس کے مزید بولنے کے منتظر تھے۔ مجھے یاد تھا کہ اس نے اپنی گفتگو کے آغاز میں ایک مہم کا ذکر کیا تھا اور ہم چاروں ساتھیوں کو وہ اسی مہم پر ملتان بھیجنا چاہتا تھا۔ سیاسی تجزیہ اسی مہم کی تمہید تھی۔ "تو میں کہہ رہا تھا کہ موجودہ سیاسی صورت حال میں مسلم اتحاد ایک دانش مندانہ فیصلہ ہے۔" مجاہد اوّل نے پھر بولنا شروع کیا۔ "اس فیصلے سے ہمارے اصل دشمن انگریز پر ضرب پڑے گی تو ان عیاروں نے اس بات کو محسوس کر لیا ہے اور اب وہ سارے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات کرانا چاہتے ہیں۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق میرپور خاص سے حیدر آباد (سندھ) اور کراچی تک کا سارا علاقہ اس کی لپیٹ میں آ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ملتان اور اس کا نواحی علاقہ ان فسادات کا ابتدائی مرکز ہو گا۔ ادھر جنوبی ہند اور بنگال اور بہار بھی ان فسادات کی زد سے نہیں بچ سکیں گے۔ صوبہ بمبئی اور ہندوستان کا شمالی علاقہ پہلے ہی سے ان کی زد پر ہے۔ موجودہ سنگین صورت حال میں ہماری پوری تنظیم کو سرگرم عمل ہونا ہے۔ پورے ہندوستان میں ہمیں ہر محاذ پر عیار دشمن کے اس سازشی منصوبے کو ناکام بنانا ہے۔ ہمارے پاس افرادی قوت اتنی نہیں ہے کہ ہم ایک علاقے میں زیادہ افراد کو بھیج سکیں۔ اس کے باوجود ہم اگر چند علاقوں کو بھی متوقع فسادات کی اس بھڑکنے والی جہنمی آگ سے بچا لے گئے تو یہ ہماری بڑی کامیابی ہو گی۔ تم چاروں کو میں نے ملتان بھیجنے کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ میں خود بنگال جا رہا ہوں۔ تمہارے کچھ ساتھیوں کو میں جنوبی ہند بھیج چکا ہوں۔ وہ اب تک مدراس پہنچ چکے ہوں گے۔ ملتان میں تمہیں کہاں ٹھہرنا ہے؟ کس کس سے ملنا ہے؟ اور کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہے؟ ان تمام تفصیلات کا علم تمہیں کل رات تک ہو جائے گا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں' تم میں سے بخت خاں اس مہم کا سربراہ ہو گا۔ اسی کے توسط سے کل رات اسی وقت تک تمہیں بقیہ ہدایات مل جائیں گی۔" یہ کہہ کر مجاہد اوّل خاموش ہو گیا۔

"ملتان کے لیے دہلی سے ہماری روانگی کب ہو گی؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس کا علم بھی تمہیں کل ہی بخت خاں کے ذریعے ہو جائے گا۔" مجاہد اوّل نے جواب دیا۔

"اے مجاہد اوّل! آپ نے ہم تک جو مصدقہ اطلاعات پہنچائی ہیں' اگر یہ اطلاعات کانگریس کے غیر متعصب لیڈروں' خلافت تحریک اور مسلم لیگ کے سرکردہ رہنماؤں تک بھی پہنچ جائیں تو کیا وہ اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال کر کے اس آگ کو بھڑکنے سے نہیں روک سکتے؟" میں نے کہا۔

"یقیناً وہ ایسا کر سکتے ہیں مگر شاید تمہیں ابھی عوام کی نفسیات کا علم نہیں اور یہ علم تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ سیاسی رہنما کبھی عوام کی ناپسندیدگی کا خطرہ مول نہیں لیتے۔ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور اس وقت ان دونوں قوموں کے جو لیڈر ہیں' ان کے پیچھے عوام ہی کی طاقت ہے۔ اس اہم نکتے کو سمجھنے کی کوشش کرو! ہندو عوام کی اکثریت ہندو لیڈروں کے ساتھ ہے' اسی طرح مسلمان عوام

فطری طور پر اپنے ہم مذہب سیاسی رہنماؤں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خلافت تحریک یا مسلم لیگ کی اصل روح مسلمان ہیں۔ اگر کانگریس خلافت تحریک کی حمایت کر رہی ہے تو یہ محض سیاسی مصلحت ہے' اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس سے غلط فہمی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک تمہاری اس نیک خواہش کا تعلق ہے کہ انگریز حکمرانوں کی اس سازش سے سیاسی رہنماؤں کو بھی آگاہ کر دیا جائے تو یہ کام ہو چکا ہے۔ انہیں مطلع کر دیا گیا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں' مولانا حسرت موہانی' علی برادران یعنی مولانا شوکت علی' مولانا محمد علی جوہر' مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بہت سے مسلم رہنما انگریزوں کی قید میں ہیں۔ کانگریس کے گاندھی جی اور مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح صاحب تک یہ اطلاعات پہنچا دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ خلافت تحریک کے جو رہنما ابھی تک گرفتاری سے بچے ہوئے ہیں' انہیں بھی خطرے سے آگاہ کیا جا چکا ہے۔ مثال کے طور پر سرزمین سندھ کے بزرگ اور معمر رہنما مولانا تاج محمود امروٹی کو بھی یہ خبر پہنچا دی گئی ہے جو ابھی بحمد اللہ حیات ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے بارے میں تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ ریشمی رومال تحریک کے خاتمے کے بعد وہ اس وقت جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں؟" مجاہد اول سے یہ سن کر میرے دل کو ایک ڈھارس سی بندھی کہ سیاسی رہنماؤں کو متوقع ہندو مسلم فسادات سے آگاہ کیا جا چکا ہے۔ "یاد رکھو کہ ہم اپنے مقاصد میں مخلص ہیں!" مجاہد اول کی آواز ذرا وقفے سے پھر بلند ہوئی۔ "ہمارا مقصد اس بھڑکنے والے الاؤ کو سرد کرنا ہے۔ ہم اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انا کے خول میں بند نہیں ہیں۔ ہم ہر وہ کوشش کر رہے ہیں اور کریں گے کہ بے گناہوں کا خون نہ بہے اور ظالم و عیار حکمراں اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ہم ہر امکانی کوشش کریں گے اور نتیجہ بلاشک اس کے ہاتھ میں ہے کہ جس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا!"

"آپ کے علم میں یقیناً یہ بھی ہو گا اے مجاہد اول کہ اسی ملک میں کچھ ایسے سرپھرے بھی تو ہیں جو اعلیٰ انسانی اقدار اور انسان پر یقین رکھتے ہیں۔ کیا وہ لوگ ہمارے لیے اس موقع پر سودمند ثابت نہیں ہوں گے؟" میں نے پھر ایک سوال کر دیا۔

"میں سمجھ گیا کہ تمہارا اشارہ کس طرف ہے۔" مجاہد اول نے کہا۔ "فرد اور جماعت دو الگ الگ چیزیں ہیں حالانکہ فرد سے ہی جماعت بنتی ہے۔ ہر افرادی گروہ میں سب پر ایک حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ان میں اچھے' کم اچھے' برے اور بہت برے ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو شاہین؟" مجاہد اول مجھے میرے تنظیمی نام ہی سے مخاطب کر رہا تھا۔ اتنی طویل گفتگو کے باوجود اس نے ایک بار بھی میرا تنظیمی نام لیتے ہوئے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

"جی ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔" میں بولا۔

"وہ دونوں بہن بھائی' سیتا اور جوگیندر' موہن لال کی اولاد ہیں۔ موہن لال جو عموماً کلکتے میں رہتا ہے۔ تمہیں شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ جلالی کی مہم میں موہن لال کی اولاد نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا' خود موہن لال کلکتے میں تمہارے کئی تنظیمی ساتھیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کر چکا ہے۔ وہ یقیناً ایک محب وطن شخص ہے' محب وطن بھی اور انگریز دشمن بھی! موہن لال اور اس کی اولاد کا نظریہ کچھ بھی ہو' ہمیں اس سے سروکار نہیں لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ خود وہ اور اس کی اولاد غیر متعصب ہیں۔ میں پھر وہی بات کہوں گا کہ فرد اور جماعت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ موہن لال' جوگیندر اور سیتا پر تو اعتماد کیا جا سکتا ہے مگر ضروری نہیں کہ ان کے گروہ کا ہر شخص یا ان کے سے نظریات رکھنے والا ہر فرد ہمارا دوست ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کر لینا چاہیے۔ مجھے علم ہے کہ گزشتہ دنوں ان دونوں سے تمہاری خط و کتابت بھی رہی ہے اور اس پر خوشی بھی ہے کہ تم نے تنظیم کے قوانین کا احترام کرتے ہوئے اپنی اصل شخصیت بھی ظاہر نہیں ہونے دی۔ انہیں ابھی مزید آزمائشوں سے گزرنے دو! تمہارے لیے غالباً اتنا اشارہ کافی ہے۔"

اس لمحے مجاہد اول سے مجھے خوف سا محسوس ہوا۔ وہ حیرت ناک حد تک باخبر آدمی تھا۔ وہ بات جو میرے' سیتا اور جوگیندر نیز میرے دوست کریم الدین کے سوا کسی کے علم میں نہیں تھی' اسے معلوم ہو گئی تھی۔ جب وہ یہ انکشاف کر رہا تھا تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کہیں وہ بھی تو پُراسرار قوتوں کا مالک نہیں؟! ایک ایسا شخص جو ہندوستان گیر ایک زیر زمین تنظیم کا سربراہ تھا اور جس کے متعلق کچھ خبر نہیں ہوتی تھی کہ کب وہ اتنے بڑے ملک میں کہاں ہو گا؟! اپنی تنظیم کے ایک رکن کے بارے میں کس طرح اتنا باخبر ہو سکتا ہے' خطرناک اور حیرت ناک حد تک باخبر!

مجاہد اول نے جس مرحلے پر اپنی بات ختم کی تھی' وہ میرے لیے سہارا بن گئی۔ اس نے یہ الفاظ کہہ کر سیتا اور جوگیندر پر اپنے اعتماد کا اظہار کر دیا تھا مگر انہیں فی الحال تنظیم

کارکن بنانے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کے لیے اس نے مزید آزمائشوں کی شرط رکھ دی تھی۔ دوم یہ کہ وہ جوگیندر اور سیتا کے ساتھیوں کو قبول کرنے پر راضی نہیں تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر اس کی بات ختم ہوتے ہی کہا "آزمائش کا وقت تو یہ بھی ہے۔ اگر آپ کو ان دونوں پر اعتماد ہے تو انہیں بھی ہمارے ساتھ ملتان جانے کی اجازت دے دیں۔ میں اور ٹیپو تو ان دونوں کے سامنے آ ہی چکے ہیں' حیدر علی سے بھی وہ واقف ہیں۔ صرف بخت خاں ان کے لیے نئے ہوں گے۔ اگر اس مہم میں وہ ہندو بھی ہمارے ساتھ ہوئے تو ممکن ہے کہ ہم اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب رہیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس مہم کا مقصد ہندو مسلم اتحاد کی فضا پیدا کر کے متوقع فساد کو روکنا ہے۔"

مجھے علم نہیں کہ میرے ان الفاظ کا ردعمل مجاہد اول پر کیا ہوا لیکن جب وہ بولا تو اس کی آواز سپاٹ تھی "تمہیں کل ہی اس کے بارے میں بھی معلوم ہو جائے گا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے ہم سب کو "خدا حافظ" کہہ دیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اسے مزید کچھ کہنا سننا نہیں۔

ہم سب اس کمرے سے باہر نکل آئے۔ صحن میں آکر ٹیپو اور حیدر علی نے مجھ سے مزید کچھ دیر رکنے کو کہا اور بخت خاں بھی بولا کہ اب آپ کھانا کھا کر ہی جایئے گا۔ میں راضی ہو گیا۔ ٹیپو اور حیدر علی مجھے اس کمرے میں لے آئے جہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ بخت خاں دروازہ بھیڑ کر چلا گیا تھا۔ کمرے میں زیادہ گرمی نہیں تھی' چھت اونچی تھی اور کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی۔ جس سے ہوا آ رہی تھی۔ ذرا فاصلے سے دو پلنگ بچھے ہوئے تھے جن کے درمیان میز تھی۔ بیٹھنے کے لیے مونڈھے بھی تھے۔ صراحی اور نقشین گلاس بھی ایک طرف رکھے ہوئے تھے۔ صراحی کے منہ پر ململ کا کپڑا بندھا تھا۔ دستی پنکھے بھی میز پر موجود تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں لکڑی کی الماری رکھی تھی۔ اسی کے قریب طاق میں لیمپ جل رہا تھا مگر اس کی لو مدھم تھی۔ ضرورت کی ہر چیز ہی مجھے وہاں نظر آ رہی تھی۔ "آؤ شاہین' یہاں بیٹھ جاؤ!" ٹیپو نے ایک پلنگ پر بیٹھتے ہوئے مجھے بھی اپنے قریب بٹھا لیا۔

حیدر علی ایک مونڈھا اٹھا کر قریب آ بیٹھا۔ ہم تینوں ایک عرصے کے بعد ملے تھے۔ کچھ دیر تو جلالی کی مہم پر باتیں ہوتی رہیں پھر جب ہم آیندہ مہم پر گفتگو کر رہے تھے تو بخت خان بھی آ گیا۔ وہ کھانا ساتھ لے کر آیا تھا۔ ہم چاروں ساتھیوں نے ایک ہی پلیٹ میں ساتھ ہی کھانا کھایا اور اس دوران میں بھی ہماری گفتگو جاری رہی۔ "میں نے ان دونوں بہن بھائی کو دیکھا تو نہیں ہے مگر مجاہد اول اور آپ کی گفتگو سے یہ اندازہ ضرور لگا سکتا ہوں کہ وہ ہماری اس مہم میں کارآمد ثابت ہوں گے۔" بخت خاں نے اپنے خیال کا اظہار کیا پھر بولا "بہرحال اس کا فیصلہ تو مجاہد اول ہی کو کرنا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ جائیں گے یا نہیں!"

"جی ہاں" میں نے کہا پھر پوچھا "کیا مجاہد اول بھی یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"جی نہیں" بخت خاں نے جواب دیا "انہیں تو گئے ہوئے بھی خاصی دیر ہو گئی۔ جانے سے پہلے انہوں نے مجھ سے عقبی دروازہ بند کرنے کے لیے کہا تھا۔"

"یہ اچھا ہے کہ اس گھر میں عقبی دروازہ بھی ہے۔" ٹیپو مسکرا کر بولا پھر وہ بخت خاں کو بتانے لگا کہ جلالی کی مہم میں ہم کس طرح ایک ایسے مکان میں گھر گئے تھے جس کا عقبی دروازہ نہیں تھا۔ ٹیپو نے اس "چوہے دان" سے نکلنے کا واقعہ بھی بیان کیا۔

"چھوڑو ٹیپو' کوئی اور بات کرو!" میں نے کہا کیونکہ اس واقعے سے میری ستائش کا پہلو نکلتا تھا۔

اس پر بخت خاں نے بھی مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا اور کہنے لگا "ہم ساتھیوں کے درمیان ایسے واقعات کا ذکر ہونا چاہیے! اس سے ایک دوسرے کی ذہنی تربیت ہوتی ہے۔"

اس روز ساتھ کھانا کھانے اور گفتگو کرنے کے بعد بخت خاں بھی میرے لیے اجنبی نہیں رہا۔ مجھے وہ شخص اچھا لگا تھا۔ ملتان کی مہم کے لیے اسے ہمارا نگراں بنا کر مجاہد اول نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہ اس کا اہل معلوم ہوتا تھا۔ آیندہ روز مغرب کے بعد آنے کا وعدہ کر کے میں وہاں سے چلا آیا۔ ٹیپو مجھے چھوڑنے بازار نیا گل تک آیا تھا پھر واپس چلا گیا تھا۔ بازار میں ابھی تک خاصی رونق تھی۔ حالانکہ رات کے نو بج رہے تھے۔ بازار سے نکل کر میں نے تانگا کیا اور قرول باغ کے لیے روانہ ہو گیا۔

راستے بھر میں' جوگیندر اور سیتا کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ دونوں جلالی میں تھے۔ انہیں ساتھ لے جانے کا مطلب یہ تھا کہ ان کو بھی دہلی بلانا پڑتا۔ اس میں کم از کم بھی ایک دن تو لگتا ہی۔ جلالی سے وہ علی گڑھ پہنچتے اور پھر وہاں سے دہلی آتے۔ آیندہ شب کوئی فیصلہ ہونے کے بعد انہیں میں تار دے کر دہلی بلا سکتا تھا۔ جامع مسجد کے علاقے میں کئی اقامتی ہوٹل تھے۔ وہ یہیں ٹھہرتے تو زیادہ مناسب تھا۔ میں تار میں کسی بھی ہوٹل کا نام لکھ سکتا تھا کہ وہ وہاں آکر ٹھہر

جائیں۔ اس طرح میری اصل شخصیت پردہ راز میں رہ سکتی تھی۔ میں ان سے ہوٹل میں جاکر مل لیتا اور پھر ہوٹل سے انہیں چپلی قبروالے مکان میں بھی منتقل کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ہوٹل ہی میں رہتے اور جب ہم ملتان کے لیے روانہ ہوتے تو انہیں ہوٹل سے اپنے ساتھ لے لیتے۔ جوگیندر کو میں نے ایک خط میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اگر کوئی مہم درپیش ہوئی اور ان دونوں بہن بھائی کو بھی ساتھ لے جاسکا تو بہ طور احتیاط ہردیال کے نام سے تار دوں گا اور تار میں لکھ دوں گا کہ انہیں کہاں اور کب پہنچنا ہے! وہ دونوں ایک عرصے سے میرے کسی ایسے ہی تار کے منتظر تھے اور اب تار دینے کا وقت آگیا تھا۔

دوسرے دن صبح میں نے دہلی سے غائب ہونے کی راہ ہموار کرلی۔ ڈیڈی کو میں نے بتادیا تھا کہ گرمیوں کی چھٹیاں شملہ، نینی تال یا کسی اور پہاڑی مقام پر اپنے دوستوں کے ساتھ گزاروں گا۔ ڈیڈی نے مجھے اجازت دے دی تھی البتہ ممی یہ سن کر کچھ اداس سی ہوگئی تھیں۔ "اتنے دن بعد تو علی گڑھ سے تو آیا ہے اور اب پھر جارہا ہے۔" انہوں نے کہا تھا۔

"ممی پلیز!" میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں "میں نے اپنے دوستوں سے وعدہ کرلیا ہے۔" بیٹوں کے لیے ماؤں کو منانا بہت آسان ہوتا ہے۔ سو ممی بھی مان گئیں اور میں گھر سے نکل کر اپنی ننھیال پہنچ گیا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ میرے ماموں زاد بھائی رحمت علی بھی کسی "تفریحی مقام" پر جانے کی تیاریاں کررہے ہیں۔ وہ بھی میری ہی طرح تنظیم کے رکن تھے۔ گزشتہ رات کو میں مجاہد اول سے یہ سن ہی چکا تھا کہ پورے ملک میں تنظیم اپنے ارکان روانہ کررہی ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی علی گڑھ سے آئے تھے۔ معلوم نہیں کب اور کہاں انہیں اس عرصے میں مجاہد اول کی ہدایات ملی ہوں گی! علی گڑھ ہی میں یا دہلی پہنچ کر؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ ہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات تنظیم کے اصولوں کے خلاف تھی۔ وہ میرے ماموں زاد تھے، یہ ایک الگ بات تھی اور تنظیمی ساتھی بھی تھے۔ یہ بالکل دوسری بات تھی۔

اس وقت میں انہی کے کمرے میں تھا۔ میرے اور ان کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے دھیمی آواز میں مجھ سے صرف اتنا ہی پوچھا "تم کب سیرو تفریح کے لیے جارہے ہو؟"

جو کچھ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ میں نے بتادیا یعنی میں بھی ا... کی طرح کہیں جارہا ہوں۔ "گڈ!" وہ آہستہ سے بولے اور ا... کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔

اس سے زیادہ میرے اور ان کے درمیان تنظیم ... متعلق اشاروں کنایوں میں بھی کوئی بات نہیں ہوئی پھر ... دونوں دوسری باتیں کرنے لگے تھے۔ اسی عرصے میں عظ... علی بھی مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں آگیا تھا۔ میں دراصل عظ... علی اور حویلی کے دوسرے باسیوں کو یہی بتانے آیا تھا کہ ا... کچھ علی گڑھ کے دوستوں کے ساتھ سیرو تفریح کی غرض ... جارہا ہوں اور تو کسی نے کچھ نہیں کہا البتہ عظمت ع... "کمبل" ہونے لگا۔ ماموں زاد ہونے کے علاوہ وہ میرا دوس... بھی تو تھا۔

"یار، پہلے سے بتایا ہوتا تم نے! میں بھی چلا چل... تمہارے ساتھ! اب اباجان سے اجازت ذرا مشکل سے ... گی کیوں کہ بھائی جان بھی گھومنے پھرنے جارہے ہیں پھر بھی ... اگر کہو تو کوشش کرلیتا ہوں۔ بس ایک بار دوستوں کے سا... مسوری گیا تھا۔"

"ابھی کچھ خبر نہیں عظمت علی کہ کب اور کہاں جا... ہے!" میں نے اسے ٹالا "جب میرے علی گڑھ کے دوس... دہلی پہنچ جائیں گے تب ہی پروگرام بنے گا پھر یہ کہ تم ان س... کے لیے اجنبی ہوگے۔ تمہیں زیادہ مزہ نہیں آئے گا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" وہ بولا۔

پھر وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں بول اٹھا "تمہار... دوست فرید احمد کا کیا حال ہے؟" اس سوال سے میرا مقص... موضوع گفتگو بدلنا تھا اور میں کامیاب رہا۔

"ٹھیک ہوگا، بہت دن سے میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ جس روز کلونت کور کا ق... ہوا اسی روز اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ تب ہی سے ... کسی کام کا نہیں رہا۔ مہینوں اسپتال میں پڑا رہا پھر اسپتال سے نکلا تو ایک ٹانگ سے محروم ہوچکا تھا۔ بیساکھی ... سہارے ایک ٹانگ سے چلتا ہے۔ کبھی کبھی رحم بھی آتا ... اس پر! اس کے باپ نے اسے بہت تنگ کر رکھا ہے کہ کو... کام کر! میں ایک دفعہ ملنے گیا تھا تو کچھ مدد کر آیا تھا۔ وہ کہہ ... تھا کہ اباجی ایک پیسا نہیں دیتے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ وہ کھائ...

"اچھا تو اب میں چلا، دیر ہورہی ہے۔" میں اس ... بات کاٹ کر بولا کیوں کہ مجھے فرید احمد کے ذکر سے اتنی دلچ... نہیں تھی۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا، یہ حقیقت ہے کہ ...

...احمد کا حال سن کر خوشی ہوئی تھی۔ اسی ظالم کی وجہ سے تو ...ی پہلی محبت کلونت کور قتل ہوئی تھی۔ اگر اسنی کی ...رار سرگوشی مجھے مزید کوئی خطرناک قدم اٹھانے سے ...ک نہ دیتی تو اس روز میں فرید احمد کو زندہ نہ چھوڑتا۔

"ایشے کیشے چلے جاؤ گے مہاراج!" عظمت علی نے ... ہندو غنڈے بھگو کی نقل اتاری جو سین کو شین بولتا ... اس سے میرا ٹکراؤ جی بی روڈ کے ایک کوٹھے پر ہوا تھا۔ ...ت علی اور فرید احمد ہی مجھے وہاں لے گئے تھے۔ میں ہنس ... تو عظمت علی بولا "کیا خیال ہے طارنوش، چلیں آج رات ...ر!"

"ہوست! اور یہ نہ بھولو کہ اب تم میرے ماموں زاد بھی ... بڑے ماموں کو بھنک لگ گئی تو تمہاری چندیا پہ ایک ... بھی نہیں چھوڑیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

حویلی سے لوٹتے ہوئے میں سوچ رہا تھا، یہ دنیا کتنی رنگ ...رنگی ہے! ایک عظمت علی ہے کہ اسے کوئی پروا ہی نہیں، ...وت وقت اس کے اور اس جیسے دوسرے بے خبروں کے ...لیے سازش کا کیا جال بن رہی ہے اور ایک اس کا بڑا بھائی رحمت علی ہے جو غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لیے اپنی زندگی ...داؤ پر لگانے کہیں جارہا ہے۔ شاید انہی تضادات کا نام زندگی ہے! میں نے سوچا اور طویل سانس لے کر اپنے گھر کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

خود میری زندگی بھی تو تضادات ہی کا مجموعہ تھی۔ میرا تو وجود ہی متضاد تھا۔ مجھے دیکھ کر بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ میں آدم زاد ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں۔ کسے معلوم تھا کہ میرے وجود میں کیا کیا قیامتیں چھپی ہوئی ہیں! بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ میں بہ یک وقت انسانی اور غیرانسانی صفات کا مالک ہوں۔ مجھ پر تو خود ابھی میرے اسرار پوری طرح نہیں کھلے تھے۔ میرے باپ کی بہن اسنی اور خود میرے سوا کسے یہ معلوم تھا کہ دراصل میں کیا ہوں۔ میرے اندر کیا پکار جاری ہے اور مجھے کس دکھ نے نڈھال کر رکھا ہے۔ بس اسنی ہی تو جانتی تھی۔ وہ پُراسرار اسنی جو اب میرے لیے پراسرار نہیں رہی تھی اور وہ جو بچپن سے اب تک قدم قدم پر میری رہنمائی کرتی رہی تھی۔ میں اپنے باپ ماموں کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتا تھا اور اسنی کہتی تھی کہ ابھی میں ذہنی طور پر بالغ نہیں ہوا۔ یہی تو دکھ تھا میرا! اور اس دکھ کا مداوا اسنی بھی نہیں کرسکتی تھی۔ جس دکھ کا کوئی مداوا ممکن نہیں ہوتا ...انی اس سے فرار کی خاطر مختلف حیلے بہانے تراش لیتا ...غیر محسوس طور پر شاید میں بھی ایسا ہی کررہا تھا۔

زیرزمین ایک خفیہ تنظیم سے میری اس قدر وابستگی بھی غالباً اسی کا شاخسانہ تھی مگر اس وقت میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا۔ میں تو ان دنوں تن من دھن سے انگریزوں کے خلاف برسرپیکار تھا اور میرے جذبات یہ تھے کہ اگر اس راہ میں میری جان بھی چلی جائے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ اپنے وطن، اپنے لوگوں پر جان قربان کردوں گا۔ جان کا کیا ہے یہ تو جانی ہے! زندگی کا کوئی مقصد تو ہو۔ اس کے کوئی معنی تو ہوں! بے مقصد جینا بھی کوئی جینا ہے پھر انسان اور حیوان میں فرق کیا ہوا اور میں انسان بھی تو تھا۔ میری ماں تو ایک آدم زادی ہی تھی۔ سو اس نسبت سے مجھ پر بھی تو کچھ قرض تھا اور میں وہ قرض اتارنا چاہتا تھا۔ آدم زادوں کا قرض، اپنی زمین کا قرض، مادر وطن کا قرض! اسی قرض کی ادائیگی کے لیے میں اس رات بھی چپلی قبر کے اس گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا جہاں گزشتہ شب مجاہد اول سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ دروازہ پہلی دستک پر نہیں کھلا تھا۔ ذرا دیر کے بعد میں نے دوبارہ دستک دی تھی۔ جس وقت میں اس تنگ سی گلی میں داخل ہوا تھا تو گزشتہ روز کی طرح وہاں مجھے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ دروازے پر دستک کے جواب میں آج مجھ سے نہیں پوچھا گیا تھا کہ کون ہے؟ اس کا سبب میں کیا سمجھا کہ شاید بخت خاں میرا ہی منتظر ہوگا۔ دوسری دستک پر دروازہ فوراً کھل گیا تھا اور مجھے شناختی الفاظ بھی ادا نہیں کرنے پڑے۔

عین اسی لمحے دو باتیں خلاف معمول ہوئیں۔ دروازہ کھلتے ہی اور میرے اندر قدم رکھتے ہی مجھے تاریک ڈیوڑھی سے اندر گھسیٹ لیا گیا تھا۔ مجھے گھسیٹنے والے وہ مضبوط ہاتھ کن لوگوں کے تھے۔ اندھیرے کے سبب میں نہیں دیکھ سکا لیکن یہ گرفت بہرحال دوستانہ نہیں تھی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ مجھے ایک دم انتہائی گرمی محسوس ہوئی اور میں پسینے میں ڈوب گیا۔ گھر کا دروازہ بند ہونے کی آواز بھی میں نے سنی۔

میں اس روح فرسا کیفیت سے گزر رہا تھا اور مجھے شدید گرمی کی وجہ سے اذیت محسوس ہورہی تھی۔ یوں جیسے میرے وجود کو دہکتے ہوئے انگاروں پر ڈال دیا گیا ہو۔ اسی دوران میں مجھے اپنی گرفت میں لینے والے کشاں کشاں اس نیم تاریک راہداری سے صحن کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں روشنی نظر آرہی تھی۔

"اسے اجالے میں لے آؤ!" صحن کی طرف سے ایک کرخت اجنبی آواز سنائی دی۔

یہی وہ لمحات تھے جب میں ایک اذیت ناک پُراسرار تجربے سے گزر کر اپنے حواس میں آچکا تھا۔ میرا وجود نادیدہ بن چکا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنے دونوں بازو چھڑا لیے اور جست بھر کر راہداری کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ اپنے پیچھے مجھے خوف زدہ سی آوازیں سنائی دی تھیں۔

"کیا ہوا؟" وہی کرخت آواز صحن میں پھر گونجی۔

"وہ بھاگ گیا سر۔ فرار ہو گیا۔" جواب میں نیم تاریک راہداری سے آواز آئی۔ اسی کے ساتھ آگے پیچھے دوڑتے ہوئے تین سادہ لباس افراد میرے قریب ہی سے گزر کر صحن میں پہنچ گئے۔ وہ تینوں ہی حواس باختہ نظر آ رہے تھے۔

میں اس عرصے میں صورت حال کا اندازہ لگا چکا تھا۔ صحن میں بھاری بھرکم ایک شخص پشت والے موڑھے پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موٹا سا لکڑی کا رول تھا اس موڑھے کے قریب ہی دوسرے موڑھے پر لیمپ رکھا تھا۔ سامنے ہی فرش پر حیدر علی بندھا پڑا تھا۔ وہ شخص بھی سادہ کپڑوں میں تھا۔

"الو کے پٹھو! وہ کیسے بھاگ سکتا ہے؟ کہاں فرار ہو سکتا ہے!" بھاری بھرکم شخص غصے میں اُٹھ کھڑا ہوا "تمہاری ہی حماقت سے اس کے دو ساتھی فرار ہو گئے! تلاش کرو اسے! وہ یہیں کہیں چھپ گیا ہو گا اگر وہ بھی نکل گیا تو تمہاری کھال کھنچواؤں گا میں!" یہ کہتے ہوئے اس شخص نے اپنی قمیص کا دامن اُٹھا کر پستول نکال لیا اور غصے میں حیدر علی کے ... ٹھوکر لگائی۔

مجھے یہ سن کر اطمینان ہوا کہ نیپو اور بخت خاں، سادہ لباس پولیس والوں کی گرفت سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

"تمہارا باپ بھی اب مجھے تلاش نہیں کر سکتا، انگریز کے ٹکڑوں پر پلنے والے غلام!" میں نے زیرِ لب کہا اور آگے بڑھا۔

وہ تینوں اپنے افسر کے حکم پر چلنے ہی تھے کہ ان میں سے ایک کی ٹانگ پکڑ کر میں نے گھسیٹ لی۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گر رہا تھا کہ دوسرے کے پیٹ پر میری لات پڑی وہ "اوغ" کر کے بیٹھا ہی تھا کہ تیسرے شخص کی کنپٹی پر میرا فولادی گھونسا پڑا وہ لہراتا ہوا زمین پر آ رہا۔ اب اس بھاری بھرکم شخص کی باری تھی جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ناقابلِ یقین نظارہ دیکھ رہا تھا۔

"وا... واقعی یہ... یہ مکان آ... آسیب زدہ لگ... لگتا ہے۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس بھاری بھرکم شخص کا جسم کانپنے لگا تھا جو چند لمحے پہلے "تارزن" بن رہا تھا۔ ... کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اسی وقت اس کے ہاتھ سے ... چھوٹ کر نیچے گرا۔

میں نے اس کی کمر پر لات ماری اور وہ بھی زمین ... گیا۔ گرتے ہی خوف کی زیادتی کے سبب وہ شاید ... ہو گیا تھا۔ اس کے دو ماتحت جو پہلے ہی زمین پر گرے ... انہوں نے اُٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان میں سے ... غالباً بے ہوش تھا، وہ جس کی کنپٹی پر میرا گھونسا پڑا تھا ... پیٹ پر ضرب کھا کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے بھی اُٹھنا نصیب ... میں نے اس کی کھوپڑی کو نشانہ بنا کر اسے بھی لمبا لٹا ... تھا۔ اوندھے منہ گرنے والے پہلے شخص کی طرف میں ... ہوا تو اس کے ہاتھ پیر بھی ڈھیلے ہو چکے تھے۔ دہشت سے وہ بھی اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔

ان چاروں کی طرف سے مطمئن ہو کر کہ وہ اب ... کھو چکے ہیں، میں حیدر علی کی طرف پلٹا کہ اسے ر... گرفت سے آزاد کر دوں۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ... اور آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

میں حیدر علی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک جا... مجھے خفیف سی آہٹ محسوس ہوئی پھر کسی کے دبے ... چلنے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا ... کچھ اور لوگ بھی اس گھر میں تھے یا داخل ہو چکے تھے ... قدموں کی آواز مجھے اس نیم تاریک دالان کی طرف ... دی تھی جس کی بائیں جانب ایک چھوٹے سے کمرے ... مجاہدِ اوّل سے گزشتہ رات میری ملاقات ہوئی تھی۔ ... سے اس طرف دیکھنے لگا۔ میں نے دو ہیولوں کو نیم تار... حرکت کرتے دیکھ لیا پھر وہ دونوں ہی چیتوں کی طرح ... بھر کے صحن میں آ گئے۔ ان دونوں کے چہروں پر نقابیں ... اور ہاتھوں میں پستول تھے۔ چہرے چھپے ہونے کے باو... ان دونوں کو پہچان گیا۔ وہ بخت خاں اور نیپو تھے اور ... بے صحن میں بے سدھ پڑے ہوئے پولیس والوں ... رہے تھے۔

"نیپو! شاید شاہین ہمارے فرار کے بعد یہاں پہنچ ... اور اسی نے ان حرام زادوں کو... مگر حیدر علی... یہ ... تک بندھا..."

بخت خاں کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ مجھے ا... ہلکی سی سردی محسوس ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ میرا جسم ... واپس ملنے والا ہے۔ تیزی کے ساتھ میں نے صحن ... اور پھر نیم تاریک راہداری سے گزرتا ہوا گھر کے ...

...ازے تک پہنچ گیا۔ اس وقت تک شدید سردی سے میں ...نے لگا تھا۔ اس کے باوجود میں نے بہ مشکل دروازے کی ...ی کھول دی۔ اسی کے ساتھ چند ہی لمحوں میں میرا جسم ...ال پر آ گیا۔ خطرو ٹل جانے کے بعد میرا جسم مجھے واپس ...گیا تھا پھر میں تیزی کے ساتھ پنجوں کے بل دوڑتا ہوا ...ی سے نیم تاریک راہداری میں پہنچ گیا۔

"کون ہے؟" بخت خاں کی سرسراتی ہوئی آواز میں نے ... "جہاں ہو وہیں رک جاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔" ... نیم تاریکی کے سبب وہ مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔ اس کے ...ں کا رخ راہداری ہی کی طرف تھا۔ میں رک گیا اور اسی ... ساتھ نسبتاً بلند آواز میں بولا "میں شاہین ہوں۔ کیا ہوا ... خاں؟"

"دروازہ بند کر دو شاہین!" میری آواز سنتے ہی بخت ... تیزی سے بولا "ہم خطرے میں ہیں۔"

میں پلٹا اور دوڑتا ہوا صدر دروازے تک دوبارہ پہنچا۔ ...ازہ اسی طرح بند تھا۔ میں نے دوبارہ کنڈی لگا دی۔ اس ...بھاگ دوڑ کا مقصد محض یہ تھا کہ میں ...نی ساتھیوں پر ...پُراسرار قوتیں ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب میں واپس ...میں پہنچا تو حیدر علی رسیوں کی گرفت سے آزاد ہو چکا ... بخت خاں اور نیپو بے ہوش پولیس والوں کو باندھ رہے ...

"ہوا کیا آخر؟" میں نے انجان بن کر حیدر علی کو مخاطب ... نڈھال سا اس موڑھے پر بیٹھا تھا جس پر کچھ ہی دیر ... بھاری بھرکم پولیس افسر بیٹھا تھا۔

... حیدر علی کی بجائے بخت خاں نے میرے سوال کا جواب ...ی الحال جلد از جلد یہاں سے ہمیں نکلنا ہے۔ باقی باتیں ...وں گی جب ہم دوسرے محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جائیں ..." پھر بخت خاں کے کہنے پر میں تو نیپو کا ہاتھ بٹانے لگا اور ... تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔

...چاروں بے ہوش پولیس والوں کو باندھنے میں زیادہ دیر ...لگی۔ اس عرصے میں حیدر علی بھی سنبھل چکا تھا۔ بخت ...نے اپنی مدد کے لیے ہم تینوں کو بھی بلا لیا۔

جب ہم چاروں ساتھی اس گھر کے عقبی دروازے سے ...لی گلی میں نکل آئے تو ہمارے پاس دو سوٹ کیس اور ...کس کے دو بڑے تھیلے تھے۔ بخت خاں نے اس گھر میں ...ضروری سامان نہیں چھوڑا تھا۔ میرے اور بخت خاں ...ہاتھ میں ایک ایک سوٹ کیس تھا۔ کینوس کے تھیلے نیپو ...حیدر علی نے اُٹھا رکھے تھے۔ بخت خاں وہاں سے ہمیں ترکمان گیٹ کے ایک گھر میں لے آیا۔ گھر کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا جو اسی نے کھولا تھا۔ وہ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں صرف تین کمرے تھے۔ جن میں سے ایک خاصا بڑا تھا۔ گھر کا دروازہ وہاں داخل ہوتے ہی بخت خاں نے اندر سے بند کر دیا تھا۔ بڑے کمرے کے آتش دان کے اوپر لیمپ جل رہا تھا۔ بخت خاں نے اس کی دھیمی لو کمرے میں آتے ہی بڑھا دی تھی۔ کمرے میں ایک طرف تخت پڑا تھا اور دوسری جانب ایک پلنگ۔

"بیٹھو ساتھیو!" بخت خاں نے تخت پر بیٹھتے ہوئے ہم تینوں ساتھیوں کو مخاطب کیا "اب ہم محفوظ ہیں۔" ہمارے ساتھ جو سامان تھا ہم نے وہیں ایک طرف رکھ دیا تھا۔ ہم بھی جوتے اُتار کر بخت خاں کے قریب تخت پر بیٹھ گئے۔ تخت پر قالین بچھا ہوا تھا۔

"ہاں بھئی حیدر علی، پہلے تم بتاؤ کہ ہمارے فرار ہونے کے بعد کیا ہوا؟" بخت خاں نے حیدر علی کو مخاطب کیا۔

"معاف کیجیے گا برادر بخت خاں، اگر ابتدا سے بات کریں تو زیادہ بہتر ہے تاکہ مجھے بھی معلوم ہو جائے، آپ اور نیپو کیوں اور کب وہاں سے فرار ہوئے نیز یہ کہ حیدر علی کیسے پھنس گیا؟" میں بول اُٹھا۔

بخت خاں نے چونک کر میری طرف دیکھا "شاہین! آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ حیدر علی وہاں پھنس گیا تھا؟"

میں بخت خاں کے اس سوال پر مسکرایا اور بولا "آپ ہی کے جملے سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے۔ ابھی تو آپ حیدر علی سے پوچھ رہے تھے کہ ہمارے فرار کے بعد..."

"ٹھیک ہے" یہ کہتے ہوئے بخت خاں نے ٹھنڈا سانس بھرا پھر کہنے لگا "میں بتاتا ہوں کیا ہوا تھا!" میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

"مجاہدِ اوّل کی طرف سے آج دوپہر ہی کو یہ ہدایت مل چکی تھی کہ ٹھکانا بدل دیا جائے کسی ایسے ہی موقع کے لیے یہ مکان پہلے ہی سے کرائے پر لے لیا گیا تھا۔" بخت خاں بتا رہا تھا "فوری طور پر ہم نے ٹھکانا بدلنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی وجہ یہ تھی شاہین کہ بعد مغرب آپ کو وہاں پہنچنا تھا۔ ہم نے سوچا یہ تھا کہ جب آپ آ جائیں گے تو وہاں سے اس گھر میں منتقل ہو جائیں گے اور یہی ہماری غلطی تھی۔ مجاہدِ اوّل کی ہدایت پر ہمیں فوراً عمل کرنا چاہیے تھا۔ رہا آپ کو یہاں لانے کا مسئلہ تو اس کی اور کئی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ بہرحال اب تو جو غلطی ہو گئی سو ہو گئی۔ چنگی قبر والا مکان کس طرح

خفیہ پولیس والوں کی نظر میں آ گیا' یقینی طور پر تو کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ یہ ضرور معلوم ہے کہ وہ کتے' حیدر علی کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک پہنچے تھے۔ میں نے شناختی الفاظ سننے کے بعد حیدر علی ہی کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ اس وقت میں غیر مسلح تھا۔ حیدر علی نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا ہی تھا کہ دو افراد نے تیزی کے ساتھ اندر داخل ہو کر اسے دبوچ لیا۔ اسی کے ساتھ باہر سے کسی کی کرخت آواز سنائی دی' پولیس! کوئی بھی بھاگنے کی کوشش نہ کرے ورنہ گولی ماردی جائے گی! میں سانس روکے قریب ہی کھڑا تھا۔ ایک بھاری بھرکم شخص کو میں نے پستول تانے ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑا دیکھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں نیپو کو تو کم از کم پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچالیتا جو اندر گھر کے ایک کمرے میں تھا۔ گھنٹا بھر پہلے حیدر علی کچھ ضروری خریداری کرنے جامع مسجد تک گیا تھا۔ نیپو اور میں اسی کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے آنے سے ذرا پہلے میں' نیپو سے یہی کہہ رہا تھا کہ اسے اتنی دیر نہیں لگانا تھی۔ مختصر یہ کہ نیپو کو ساتھ لے کر میں گھر کے عقبی دروازے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ وہاں سے فرار ہو کر میں' نیپو کے ساتھ اس مکان میں آیا یہاں سے ہم دونوں نے پستول لیے اور پھر دوبارہ چتلی قبر پہنچ گئے۔ واپسی میں ہم نے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ ہمیں توقع تھی کہ وہ اتنی جلدی وہاں سے نہیں نکلیں گے۔ ہم ہر قیمت پر حیدر علی کو ان کی گرفت سے آزاد کرانا چاہتے تھے' چاہے اس کے لیے ہمیں ان سب کو جہنم رسید ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔ چتلی قبر پہنچ کر ہمارا اندازہ درست ثابت ہوا۔ گھر کا صدر دروازہ اور عقبی دروازہ اندر سے بند تھا۔ مجھے اور نیپو کو گھر کے اندر پہنچنے کے لیے چھت پر چڑھنا پڑا پھر جب ہم دونوں چھت سے گھر میں اترے تو وہاں اور ہی منظر تھا۔ حیدر علی ہمیں بندھا ہوا ملا اور چاروں پولیس والے بے ہوش پڑے نظر آئے پھر ایک اور عجیب واقعہ رونما ہوا شاہین! آپ آ گئے ظاہر ہے کہ آپ کو گھر کا صدر دروازہ کھلا ہوا ہی ملا ہوگا تب ہی تو آپ اندر آئے ہوں گے۔ میں نے اسی لیے آپ سے دروازہ بند کرنے کو کہا تھا۔ آپ دروازہ بند کرنے گئے اور ہم نے حیدر علی کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کرکے ان چاروں بے ہوش پولیس والوں کو باندھنا شروع کردیا۔ ہم دونوں وہاں تھے نہیں' حیدر علی بندھا پڑا تھا اور آپ ہمارے بھی بعد وہاں پہنچے تھے۔ گھر کے دروازے اندر سے بند تھے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ وہ چاروں پولیس والے کس طرح بے ہوش ہوگئے؟" اپنی بات مکمل کرکے بخت خاں سوالیہ نظروں سے حیدر علی کی طرف دیکھنے لگا۔

اب حیدر علی نے بولنا شروع کیا "میں سخت... کہ میری وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ اوّل تو مجھے خریداری میں اتنی دیر نہیں لگانا تھی۔ دوم چوکنا... تھا کہ کہیں کوئی میرے تعاقب میں تو نہیں ہے۔"

"تم نے دونوں باتیں بالکل درست کہی ہیں..." بخت خاں بولا "یقیناً تمہیں اتنی بڑی حماقت کا ثبوت... چاہیے تھا۔ صرف تمہاری اس حماقت کی وجہ... کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ یہ الفاظ میں ا... نگراں کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں جو مجاہد اوّل... سپرد کی ہے۔ اس سنگین غلطیوں پر میں تمہیں ا... خارج کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہوں مگر میں تمہیں... ہوں۔ اس کی ایک وجہ خود میری بھی حماقت ہے... اوّل کی آخری ہدایات ملتے ہی ٹھکانا بدل دینا... جتنے قصوروار تم ہو اتنا ہی میں بھی ہوں۔ بس... کیا کہہ رہے تھے۔" میں نے بڑی بڑی روشن... بخت خاں کی طرف دیکھا۔ وہ بلا کا صاف گو تھا۔

حیدر علی نے اظہار معذرت کے بعد کہا... دونوں فرار ہوگئے تو پولیس افسر نے مجھے بند... ڈال دیا۔ اس کا ارادہ مجھ پر تشدد کرنے کا تھا... کھول دوں۔ اس نے مجھے ڈرانا دھمکانا شروع... اچانک صدر دروازے پر دستک ہوئی۔ پولیس ا... مجھ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ آپ لوگوں نے وہاں... کہاں پناہ لی ہوگی؟ دستک سن کر اس نے اپنے... کو ہدایت دی کہ آنے والا جو کوئی بھی ہو ا... جائے۔ اس کا خیال یہ تھا کہ دستک دینے والا... ساتھی ہوسکتا ہے۔ وہ تینوں تیزی کے ساتھ... وہاں سے چلے گئے پھر میں نے دروازہ کھلنے او... آواز سنی اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے معلوم تھا... شاہین کو آنا تھا۔ ذرا دیر کے بعد راہداری کی طر... زدہ سی آوازیں سنائی دیں۔" پھر حیدر علی نے... بیان کردیا جو اس نے بہ قید ہوش و حواس دیکھ... کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ ان تینوں ہی... شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیا وہ مکان واقعی آسیب زدہ تھا؟" خاموشی کو میری ہی آواز نے توڑا۔

"ان حالات میں تو ایسا ہی لگتا ہے۔ بہرحا... کی شہرت یہی تھی اسی لیے خالی پڑا تھا اور یہ آ... اسے کرائے پر حاصل کرلیا تھا۔" بخت خاں نے بتایا پھر کہنے لگا "اگر واقعی اس گھر میں آسیب یا جنات رہتے ہیں تو وہ نیک ہی رہے ہوں گے۔ ہمیں بہرحال انہوں نے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ ایک ہفتے سے زیادہ مجھے اس گھر میں رہتے ہوگیا تھا۔" میں نے بڑی خوب صورتی سے بات کا رخ تبدیل کردیا تھا۔ "آپ جب پہنچے تو کیا دروازہ کھلا ہوا ملا تھا؟" بخت خاں نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں' دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔" میں نے اپنی پردہ پوشی کی خاطر کہا "مجھے فوراً ہی کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا اسی لیے دوڑتا ہوا اندر پہنچا تھا اور پھر ـــ"

"حیدر علی نے بتایا ہے کہ آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے بھی دروازے پر دستک سنائی دی تھی پھر اس نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز بھی سنی تھی۔ اسی کے بعد وہ پُراسرار واقعہ پیش آیا تھا جو اس نے بیان کیا ہے۔ تینوں پولیس والوں نے اپنے افسر کو جس کے فرار ہوجانے کی خبر دی تھی' یقیناً وہ کوئی پُراسرار وجود ہی رہا ہوگا۔" بخت خاں اپنی دانست میں اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھا رہا تھا "میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا تھا کہ جنات انسانی قالب بھی اختیار کرلیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔"

پھر میں نے ہی گفتگو کا رخ حالیہ مہم کی طرف موڑ دیا۔ بخت خاں سے مجھے معلوم ہوا کہ مجاہد اوّل دہلی سے جاچکا ہے۔ دوپہر کے بعد وہ بخت خاں کو آخری ہدایات پہنچا کر بنگال روانہ ہوگیا تھا۔ ہم چاروں کو ایک ہفتے کے اندر اندر دہلی سے ملتان روانہ ہوجانا تھا۔ جوگیندر اور سیتا کو بھی اس نے ملتان ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی تھی اور یہی اطلاع میرے لیے بہت اہم تھی۔ مہم کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے بخت خاں کا ہر حکم ماننا اب ہم تینوں کا فرض تھا۔

"شاہین! آپ یہ بتائیں کہ جوگیندر اور سیتا یہاں کب تک پہنچ سکتے ہیں؟" بخت خاں نے مجھ سے سوال کیا۔

"اگر انہیں آج ہی رات تار دے دیا جائے تو وہ کل تک یہاں پہنچ جائیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پرسوں ملتان روانہ ہوسکتے ہیں۔" بخت خاں کا انداز خود کلامی کا سا تھا "مگر حیدر علی کو آج ہی رات یہاں سے روانہ ہوجانا چاہیے کیوں کہ یہ پولیس کی نظروں میں آچکا ہے۔ کیا خیال ہے شاہین؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے تائید کی پھر مشورہ دیا "آپ اور نیپو بھی احتیاطاً آج ہی رات کم از کم دہلی سے نکل جائیں تو بہتر ہے۔"

"آپ... وہ دونوں بہن بھائی؟ آپ تینوں ـــ"

"... یہاں سے پرسوں کسی وقت چل دیں گے۔" میں نے بخت خاں کی بات کاٹ کر تجویز پیش کی "اس طرح اس غلطی کا ازالہ ہوجائے گا جو نادانستگی میں آپ سے سرزد ہوچکی ہے۔ مجاہد اوّل کی یہ ہدایت کہ ٹھکانا بدل دیا جائے' ظاہر ہے بلا سبب نہیں ہوسکتی۔ اس کا سبب یہی ممکن ہے کہ وہ مکان کسی بھی وجہ سے پولیس کی نظر میں آگیا ہوگا۔ اس کی ایک وجہ اس مکان کی یہ شہرت بھی ہوسکتی ہے کہ آسیب زدہ ہے۔ کسی ایسے مکان میں کچھ لوگوں کی بود و باش پولیس کو اس طرف متوجہ کرسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اور نیپو بھی پولیس کی نظر میں آچکے ہوں۔"

"ہم دونوں آج دوپہر کے بعد اس مکان سے نہیں نکلے۔" بخت خاں نے بتایا "مگر شاہین' آپ کا یہ تجزیہ درست معلوم ہوتا ہے کہ پولیس اس مکان کے آسیب زدہ ہونے ہی کی بنا پر ادھر متوجہ ہوسکتی ہے۔"

"اور ایسا آج ہی ہوا ہے۔" میں نے مزید کہا "اگر اسے پہلے سے اس مکان میں کسی کے بود و باش کی اطلاع ہوتی تو گزشتہ رات بھی وہاں چھاپا پڑ سکتا تھا۔"

"آپ کا یہ قیاس بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ہم تینوں ہی آج رات دہلی سے نکل جائیں۔" بخت خاں بولا۔

پھر مزید کچھ دیر گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ بخت خاں' نیپو اور حیدر علی کے ساتھ لاہور میں رک کر میرے وہاں پہنچنے کا انتظار کرے گا۔ اس کے بعد ہی ہم سب یک جا ہو کر لاہور سے ملتان جائیں گے۔ لاہور میں بخت خاں مجھے کس وقت کہاں ملے گا' یہ اس نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں نہیں رکا کیوں کہ مجھے فوری طور پر جوگیندر کو تار دینا تھا کہ وہ سیتا کو ساتھ لے کر فوراً دہلی پہنچ جائے۔

○☆○

"میں تمہاری کنیز ہوں اور ـــ اور تم طارنوش ـــ تم میرے آقا ہو!" سیتا بڑبڑا رہی تھی۔ اس کی خواب ناک سی آواز مجھے اپنی روح میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر میرے شانے سے ٹکا ہوا تھا۔ اس کے لمس نے مجھ سے ہجر کا سارا احوال کہہ دیا تھا۔ وہ کس آگ میں جلی اور کس حال میں رہی' مجھ بن اس پر کیا بیتی' زبان سے اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا' کہا تھا تو صرف اتنا کہ وہ میری کنیز ہے اور میں اس کا آقا ہوں۔

سیتا نے آج ہی مجھ سے یہ نیا رشتہ قائم کیا تھا اور یہ میرے نزدیک اس کی بہت بڑی قربانی تھی۔ وہ سیتا سے "کنیز" بن گئی تھی۔ اس نے اپنی محبت پر سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ وہ میری خاطر سب کو چھوڑ آئی تھی بچپن کی یادوں کو اور اپنے ماضی کو!

یہ خود اسی کی خواہش تھی جس کا اظہار گزشتہ رات اس نے میری موجودگی میں اپنے بھائی جوگیندر سے کیا تھا۔

"اگر تم مسلمان ہونا چاہتی ہو تو کم از کم مجھے کوئی اعتراض نہیں اور جہاں تک پتا جی کا معاملہ ہے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انہیں بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" جوگیندر نے بلا جھجک کہہ دیا۔

وہ دونوں بہن بھائی کل شام دہلی پہنچ کر جامع مسجد کے اسی اقامتی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ جس کا نام میں نے تار میں لکھا تھا۔ صبح ہوتے ہی انہیں میرا تار مل گیا تھا اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ جالالی سے چل دیے تھے۔ میں مغرب کے وقت اس ہوٹل میں پہنچا تھا۔ مجھے ان کے پاس بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ سیتا نے یہ ذکر چھیڑ دیا تھا۔

"بھیا! میں بھی اپنے پتا جی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ انہیں مجھ پر پورا بھروسا ہے کہ میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی۔" سیتا نے اپنے بھائی کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

اسی کے نتیجے میں آج ہی صبح میں سیتا کو ساتھ لے کر جامع مسجد کے پیش امام صاحب کے پاس ان کے حجرے میں گیا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد کے پیش امام صاحب ہی نے سیتا کو کلمہ پڑھوایا تھا اور پھر وہ مسلمان ہو گئی تھی۔ اسی موقع پر سیتا نے کہا تھا کہ میں اب اپنا نام کنیز رکھنا چاہتی ہوں۔

"بیٹی! تم اپنا پورا نام کنیز فاطمہ رکھ لو تو زیادہ بہتر ہے۔" پیش امام صاحب نے نرمی سے کہا۔

"بہتر ہے۔" سیتا سر جھکا کر بولی۔

"امام صاحب! آپ سے ایک درخواست ہے۔" میں نے کہا "یہ آپ کو بتا ہی چکی ہیں کہ انہوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہے۔ دل سے انہوں نے کلمہ طیبہ پڑھا ہے اور زبان سے اس کا اقرار کیا ہے مگر خوفِ فسادِ خلق کے سبب میری یہ گزارش ہے کہ اس بات کی شہرت نہ ہو۔ ہماری خواہش، درخواست اور گزارش یہ ہے کہ دہلی میں یہ شہرت نہ ہو کہ ایک ہندو لڑکی نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ شرپسند لوگ اس نیک عمل کو بہانہ بنا کر کوئی ہنگامہ بپا کر سکتے ہیں۔ مجھ سے بہتر آپ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔"

"مجھے تم سے یہ باتیں سن کر خوشی ہوئی نوجوان!" امام صاحب بولے "تم یقیناً کوئی عام قسم کے جذباتی نوجوان نہیں ہو۔ مطمئن رہو، اس واقعے کی شہرت نہیں ہوگی۔" میں نے اور سیتا نے امام صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا اور پھر ہم دونوں ہوٹل میں واپس آ گئے جہاں جوگیندر ہمارا منتظر تھا۔

"نیا دھرم مبارک ہو سیتا!" بھائی نے بہن کو مبارک دی۔

"سیتا نہیں کنیز کہو بھیا! اب میرا نام کنیز ہے۔" سیتا نے اپنے بھائی کو ٹوک دیا تھا۔

"ارے پگلی، تو سیتا رہے یا کنیز بن جائے، رہے گی تو بھیا کی بہن ہی!" جوگیندر نے ہنس کر کہا تھا "دیکھ ہم سے دین دھرم کا جھگڑا نہیں چلے گا۔ ہم اور لوگ ہیں۔"

اس پر میں نے جوگیندر کو سینے سے لگا لیا تھا "تم بہت کمینے ہو میرے دوست، میری جان۔" میں بولا۔

"اور تم بھی کچھ کم کمینے نہیں نکلے طارنوش کہ میری بہن کو مسلمان بنا لیا۔" جوگیندر نے بھی میری محبت اور گرمجوشی کا جواب دیا پھر کہنے لگا "اچھا میں ذرا ریلوے اسٹیشن کا چکر لگا کے آتا ہوں معلوم تو کر لیں تاکہ لاہور کے لیے ٹرین یہاں سے کب روانہ ہوگی!"

اس کے بعد جوگیندر چلا گیا تھا اور اب۔ اب میں اور سیتا، ہوٹل کے کمرے میں اکیلے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی "داسی کنیز ہی کو تو کہتے ہیں نا!"

"نہیں تم۔ تم کنیز نہیں ملکہ ہو میری ملکہ!" میں بھی جذباتی ہو گیا اور جذبات کی زبان کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

"اگر۔ اگر میں ملکہ ہوں تو۔ تو پھر تم میرے بادشاہ ہو۔" اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں اور ان آنکھوں میں بڑی وسعت تھی۔ وہ اس وقت کسی اور ہی عالم سے گزر رہی تھی۔ ایک ایسا عالم کہ جس کے بعد کوئی عالم نہیں ہوتا۔

میں نے اس کی پیشانی پر جھولتی ہوئی ایک آوارہ لٹ سے کھیلتے ہوئے کہا "ملکہ کے غلام بھی تو ہوتے ہیں۔"

"ہوتے ہوں گے لیکن تم۔ تم تو میرے بادشاہ ہو آقا ہو۔"

پھر کچھ کہنے اور سننے کی منزل بھی گزر گئی۔ سب کچھ کہنا سننا ہی کب ہے! بن کہے بھی تو بہت کچھ کہہ دیا جاتا ہے اور سننے والا تو وہی سنتا ہے جو سننا چاہتا ہے! لمبی جدائی کے بعد ہم دونوں ایک عرصے کے بعد وصل کی راحتوں میں گم تھے۔ ہم اسی وقت چونکے جب دروازے پر دستک ہوئی۔

"شاید جوگیندر لوٹ آیا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا اور وہ اپنے آپ کو سمیٹنے لگی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول

دیا۔ آنے والا جوگیندر ہی تھا۔ دہلی سے وہ ہماری لاہور روانگی کے لیے ٹرین کا وقت معلوم کر آیا تھا۔

O☆O

داتا کی نگری لاہور آ کر مجھے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ دہلی اور لاہور مجھے جڑواں شہر لگے تھے۔ یہاں کے رستے، گلیاں اور خوشبو بالکل وہی تھی جو دہلی کی تھی۔ ہر شہر کی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سو دہلی اور لاہور کی خوشبو میں مجھے کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ عارضی طور پر ہم ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے تھے۔ سیتا، میں اور جوگیندر ہم تینوں ہی طویل سفر کے بعد خاصے تھک گئے تھے۔ اس وقت صبح ہو چکی تھی جب ہم لاہور پہنچے۔ دن بھر ہم نے آرام کیا تھا اور شام کو ٹہلنے نکلے تھے۔ سیتا اور جوگیندر تو کچھ دیر چہل قدمی کے بعد ہوٹل واپس چلے گئے تھے اور میں داتا دربار کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

سیتا اب مسلمان ہو چکی تھی مگر ابھی میں نے کنیز کہہ کر ابھی تک مخاطب نہیں کیا تھا۔ کنیز کی بجائے میں اس کا کوئی اور ایسا نام رکھنا چاہتا تھا جو اس پر سجے جو اس کی شخصیت کے حسن کو اپنے اندر سمیٹ سکے۔ وہ ایک جذباتی لمحہ تھا جب سیتا نے اپنے لیے یہ نام پسند کیا۔ میں اس کے جذبات کو مجروح کرتا کیسے قبول کر لیتا، سو چپ رہا پھر یہ کہ میں اپنے جذبات سے قطع نظر جس مقصد سے ان دونوں بہن بھائی کو ملتان لے جا رہا تھا وہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو تا کہ انہیں ہندو ہی ظاہر کیا جاتا۔ سیتا کا ذکر تو الگ جوگیندر ہی کون سا ہندو تھا! اگر وہ صحیح معنوں میں ہندو ہوتا تو اپنی بہن کو مسلمان ہو جانے کی اجازت کیسے دے دیتا۔

جوگیندر اور سیتا دونوں ہی کی سمجھ یہ بات آ گئی تھی کہ فی الحال سیتا کو سیتا ہی کہا جائے۔ مجاہد اول کے سامنے بھی میں نے ان دونوں کو ملتان کی مہم میں ساتھ لے جانے کا یہی جواز رکھا تھا کہ وہ ہندو ہیں، چاہے نام ہی کے ہندو سہی! ملتان کے انتہا پسند ہندو حلقوں میں بہ حیثیت ہندو وہ دونوں بہن بھائی ہمارے لیے کام کر سکتے تھے۔ یہ منافقت نہیں وقت کی ضرورت تھی لوہے سے ہی تو لوہا کاٹا جاتا ہے۔

لاہور آنے کے بعد ہماری اگلی منزل ملتان تھی۔ بخت خاں اور میرے دونوں ساتھی نیم اور حیدر علی کو لاہور ہی میں رک کر میرا انتظار کرنا تھا۔ دہلی میں ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا۔ ان تینوں سے رابطے کی صورت داتا دربار تھی اور اس وقت میں وہیں جا رہا تھا۔ بخت خاں نے دہلی میں مجھ سے کہا تھا کہ میں لاہور پہنچ کر روزانہ داتا دربار میں مغرب کی نماز کے بعد حاضری دیا کروں گا۔ تم جب بھی لاہور پہنچو، اس وقت مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہو۔ لاہور میں داتا صاحب کے مزار مبارک تک پہنچنا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔

میرے دل میں خود بھی داتا صاحب کے دربار میں حاضری کی خواہش تھی۔ میں نے پڑھا تھا کہ داتا صاحب ایسے بزرگوں کے قدموں کی برکت سے ہندوستان کی سرزمین پر اسلام کو فروغ حاصل ہوا تھا۔ حضرت بابا فرید گنج شکر کی کتاب "کشف المحجوب" میں نے فارسی زبان ہی میں پڑھی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں عربی اور فارسی زبانوں کا علم حاصل کر رہا تھا۔ حضرت بابا فرید (داتا صاحب) کے بارے میں میری معلومات کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ حضرت خواجہ غریب نواز (معین الدین چشتی) کے ایما پر ایران سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ پہلے انہوں نے کچھ عرصہ مدینۃ الاولیاء یعنی شہر ملتان میں قیام کیا اور پھر اپنے مرشد (خواجہ غریب نواز) کے حکم پر شہر لاہور کو رونق بخشی۔ یہیں ان کی وفات ہوئی۔ داتا صاحب نثر نگار ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔

داتا صاحب نے پہلے ملتان اور پھر لاہور میں رشد و ہدایت کے چراغ روشن کیے۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں انہی دونوں شہروں کی طرف آیا تھا۔ اس دربار میں حاضری کی خواہش کا سبب یہ تھا کہ میں صاحبِ دربار کے بارے میں پہلے ہی سے بہت کچھ جانتا تھا۔ لاعلمی میں بھی بڑا سکون ہے لیکن علم یعنی جاننا اس سے افضل ہے۔ سو یہی علم مجھے اس دربار کی طرف لے جا رہا تھا جہاں بخت خاں سے میری ملاقات ہونا تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے صدر دروازے ہی کے آس پاس مل جائے گا۔

میں اس وقت وہاں پہنچا جب مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ درگاہ ہی سے ملحق ایک مسجد تھی۔ میں نے وہاں مغرب کی نماز پڑھی پھر داتا صاحب کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھ کر میں باہر آ گیا۔ وہاں عجب سماں تھا۔ داتا صاحب کا لنگر جاری تھا اور ہر طرف سے "الـ۔ الـ" کی صدائیں آ رہی تھیں۔ لا الہ الا اللہ کی ضرب مجھے اپنے دل پر پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ لا الہ کہنے کے بعد الا اللہ کے ساتھ خصوصاً الا کے پہلے دو حروف یعنی "ال" کے ساتھ ہی آوازیں بلند ہوتی جاتی تھیں۔ حلقہ بنا کر کلمہ طیبہ کا ورد صوفیائے کرام کی تعلیم کا ایک حصہ تھا۔ میں انہی صداؤں کے حصار میں باہر آیا تھا اور مجھ پر ایک کیفیت سی طاری تھی۔ شاید یہ سبب ہوا کوئی اور کہ بخت خاں مجھے پہلی کوشش میں نظر نہیں آ سکا۔ اس

سے قطع نظر وہاں ہجوم بھی خاصا تھا۔ مرادیں پانے والے دھمال ڈال رہے تھے، چمٹے بج رہے تھے، فضا گلابوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ لنگر جاری تھا اور میری نگاہیں بخت خاں کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے یہیں تو مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

صدر دروازے کے آس پاس ہی میں چکرا تا پھر رہا تھا جب مجھے وہاں خاصی دیر ہو گئی تو میں اُلجھنے لگا۔ بخت خاں وعدہ خلافی نہیں کر سکتا تھا پھر وہ کیوں نہیں آیا؟ بار بار میرے ذہن میں یہی سوال گردش کر رہا تھا اس کے علاوہ مجھے جوگیندر اور سیتا کا خیال بھی آ رہا تھا کہ اگر مجھے واپسی میں مزید کچھ دیر ہو گئی تو وہ دونوں میری طرف سے فکرمند ہو جائیں گے۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ یہ بات تو میرے علم میں تھی کہ بخت خاں، نیچو اور حیدر علی اسی رات دلی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس رات ان سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی۔ دوسرے ہی دن صبح میں نے ترکمان گیٹ کا پھیرا لگا کر یہ دیکھ لیا تھا کہ رات کو ہم چاروں ساتھی جس مکان میں تھے اس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ بخت خاں یقیناً اپنے دونوں ساتھیوں کو لے کر وہاں سے رات ہی کو جا چکا تھا۔ ورنہ صبح مکان کے دروازے پر مجھے تالا پڑا نظر نہ آتا۔ مجھ سے پہلے بخت خاں نے دلی چھوڑ دیا تھا تو وہ لاہور کیوں نہیں پہنچ سکا؟ کہیں دلی سے نکل کر راستے میں تو اس پر کوئی اُفتاد نہیں پڑ گئی؟

میرے ذہن میں سوالات گردش کرتے رہے پھر آخر کار میں نے یہ سوچ کر واپسی کا فیصلہ کیا کہ کل دوبارہ اسی وقت یہاں آؤں گا۔ اس کے سوا میرے پاس اور چارہ کار بھی کیا تھا۔ ہجوم سے نکل کر میں اس طرف بڑھا جہاں تانگے سے اُترا تھا۔ وہاں سے میں ہوٹل واپس کے لیے تانگا لینا چاہتا تھا۔ ابھی میں نے چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ عقب سے کسی نے اپنا بھاری ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور جیسے پتھر کا ہو گیا۔ میرے سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی۔

مجھ سے کہا گیا "تمہیں بخت خاں کی تلاش ہے نا! اور ہمیں تمہاری تلاش تھی۔" یہ الفاظ سخت لہجے میں ادا کرنے والے کا چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ جو لوگ تھے وہ میرے گرد حلقہ بنا چکے تھے۔

▼▼▼

٭

ان کے تیور ایسے تھے جیسے میں اپنی مرضی سے نہ چلا تو وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ میں نے چند لمحے سوچ کر ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ مجھے صرف بخت خاں اور اپنے دونوں ساتھیوں کی فکر تھی کہ کہیں وہ ان کے ہتھے نہ چڑھ جائیں!

چند ہی قدم کے فاصلے پر ایک موٹر کھڑی تھی۔ مجھے اس میں بٹھایا گیا۔ میرے دائیں بائیں دو افراد بیٹھ گئے۔ ایک ڈرائیور کے قریب اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔

"شور مچانے یا کوئی ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں۔" ڈرائیونگ سیٹ سے ایک آواز ابھری اور میں چونک اٹھا۔ آواز نسوانی تھی اور لہجہ غیر ملکی تھا۔ "اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو!" ڈرائیونگ سیٹ سے حکم دیا گیا۔

"یہ شہر میرے لیے اجنبی ہے، اس کی ضرورت نہیں۔" میں پہلی بار بولا۔

"خاموش بیٹھو!" نسوانی آواز سنائی دی۔ لہجہ تحکمانہ ہی تھا۔

"ٹھیک ہے" میں نے طویل سانس لیا۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور اسی کے ساتھ موٹر چل پڑی۔

سفر کتنی دیر جاری رہا، مجھے اس کا کوئی خاص اندازہ نہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ میرا بازو پکڑ کر کار سے اُتار لیا گیا۔ میری آنکھوں سے ابھی تک پٹی نہیں کھولی گئی تھی۔ آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے یا اگر تھے تو خاموش تھے۔ ایک شخص میرا بازو تھامے چلتا رہا، پھر شاید اسی نے کچھ دور چل کر مجھے بتایا کہ آگے سیڑھیاں ہیں۔ میں سنبھل کر سیڑھیوں پر چڑھا۔ وہ چند ہی سیڑھیاں ہوں گی "اب سیدھے چلتے رہو! آگے فرش ہموار ہے۔" مجھ سے کہا گیا۔

وہ شاید کوئی کمرا تھا جس کا دروازہ کھولا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے وہاں ایک کرسی پر بٹھایا اور پھر میں نے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔

"اب تم چاہو تو اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھول سکتے ہو۔" آشنا نسوانی آواز ابھری۔

میں نے پٹی کھولنے میں دیر نہیں کی۔ میرے سامنے ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ وہ ایک لمبی سی میز تھی جس پر ٹیبل لیمپ رکھا تھا۔ الیکٹرک لیمپ کی روشنی میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس لیمپ کے سوا وہاں کوئی اور بلب روشن نہیں تھا اور لیمپ کی روشنی کا دائرہ بھی محدود تھا۔ مجھے میز کے

ایک سرے پر بٹھایا گیا تھا، دوسرے سرے پر میرے اندازے کے مطابق وہی بیٹھی تھی جو موٹر چلا کر مجھے یہاں تک لائی تھی۔ اس کا ہیولا مجھے نظر آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ میز کے دائیں بائیں کرسیوں پر دو دو افراد اور بیٹھے تھے۔ ان سبھی کے چہرے مجھے واضح نظر نہیں آ رہے تھے۔

"بخت خاں اور تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟" نسوانی آواز نے سوال کیا۔

"کون بخت خاں؟ میں تو اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔" میں نے صاف انکار کر دیا۔

"پھر تم کس کی تلاش میں داتا دربار گئے تھے؟"

"میں تو وہاں فاتحہ پڑھنے گیا تھا۔ مجھے تو کسی کی تلاش نہیں تھی۔"

"جھوٹ مت بولو طارزنوش!" نسوانی آواز کی نرمی غائب ہو گئی "ہمیں سب کچھ معلوم ہے کہ تم دلی سے یہاں کیوں آئے ہو!"

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے اس لیے سیتا اور جوگیندر کا خیال آیا۔ اگر وہ لوگ واقعی سب کچھ جانتے تھے تو سیتا اور جوگیندر بھی ان کی نظر میں آ چکے ہوں گے۔ بخت خاں مجھے داتا دربار میں کیوں نہیں ملا تھا، میں اب سمجھ چکا تھا۔ وہ مجھ سے بخت خاں اور میرے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے، اس کا مطلب یہی تھا کہ بخت خاں ان کے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ یقیناً اسے خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ یہ سوچ کر میرے دل کو قدرے اطمینان ہوا مگر سیتا اور جوگیندر کی طرف سے مجھے اب بھی فکر تھی۔

"چپ کیوں ہو! جواب دو کہ تم داتا دربار کیوں گئے تھے؟" سوال پھر کیا گیا۔

"میں اس سوال کا جواب دے چکا ہوں۔" میں سنبھل کر بولا۔ اب میں نے بڑی حد تک اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا۔

"میرا خیال ہے مس کیتھی، یہ اس طرح کچھ نہیں بتائے گا۔" ایک بھاری آواز ابھری۔ یہ شخص میز کی دائیں جانب بیٹھا تھا "ہمیں اس کی زبان کھلوانے کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔" اس کی آواز میں دھمکی تھی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" نسوانی آواز نے اتفاق کیا۔ اسی کو کیتھی کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ کیتھی نے میز کی بائیں جانب بیٹھے ہوئے دونوں افراد کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی کرسیوں سے اٹھے اور پھر میری کرسی کے پیچھے آ کھڑے ہوئے۔ اسی کے ساتھ بھاری آواز والے نے بھی اپنی نشست چھوڑ دی۔ میں نے اسے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھا۔ جیب سے اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک اُسترا تھا۔ میرے قریب آ کر اس نے اُسترا کھول لیا۔ اُسترے کا پھل روشنی میں چمک رہا تھا۔ کرسی کے پیچھے موجود افراد نے میرے دونوں بازو جکڑ لیے۔

"تم لوگ کیا کر رہے ہو؟" حیرت اور غصے کے سبب میں تقریباً چیخ اٹھا۔ مجھے ان سے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ وہ تشدد پر اُتر آئیں گے۔

بھاری آواز والے نے میری آنکھوں کے سامنے اُسترے کا پھل گھمایا، پھر بولا "اگر تم چاہتے ہو کہ میں اس اُسترے سے تمہارے جسم کی بوٹیاں نہ اُتاروں تو مس کیتھی جو کچھ معلوم کرنا چاہتی ہیں انہیں بتا دو!" اس کی آواز سے درندگی جھلک رہی تھی۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم اس کا مشورہ مان ہی لو تو بہتر ہے طارزنوش!" کیتھی نے مجھے مخاطب کیا۔

"اگر تم لوگ مجھے جانتے ہو تو پھر مجھ پر تشدد نہیں کر سکتے۔ مت بھولو کہ تمہیں اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔" میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔

"کس کے سامنے؟" کیتھی نے ہنستے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"انجان بننے کی کوشش نہ کرو مس کیتھی! تم خود اچھی طرح جانتی ہو کہ کس کو جواب دہ ہو!" میں نڈر ہو کر بولا "وہ مونچھوں والا کہاں گیا جو مجھے داتا دربار میں ملا تھا؟ وہی جس نے مجھے تمہاری موٹر میں بٹھایا تھا!" کیتھی سے میں اسی شخص کے بارے میں پوچھ رہا تھا جس نے داتا دربار میں میرے شانے پر ہاتھ رکھا تھا اور جس کا چہرہ میرے لیے آشنا تھا۔ اسے میں نے دلی میں کئی بار اپنے ڈیڈی کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ڈیڈی کا کوئی ماتحت تھا۔ وہ ڈیڈی کے سامنے مؤدب رہتا تھا اور انہیں "سر" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ جس روز میں دلی سے روانہ ہونے والا تھا، اس سے ایک دن پہلے بھی رات کو وہ ڈیڈی سے ملنے آیا تھا۔ میں جب میٹرک میں تھا تو بھی وہ ہمارے گھر آتا جاتا تھا۔ مجھے اس پر شبہ تھا کہ وہی شخص ڈیڈی کو میری سرگرمیوں سے آگاہ کرتا تھا۔ ان دنوں میں نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی ہی تھی اور مولانا محمد علی جوہر کے جلسوں میں شرکت کرنے لگا تھا۔ میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ ڈیڈی کا تعلق کسی اعلیٰ سرکاری عہدے سے ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا تھا جب کلکتے میں مولانا ابوالکلام آزاد پر مقدمہ چلا تھا اور

ڈیڈی لگتے گئے تھے۔ اس سے پہلے ڈیڈی کی زبان سے غصے میں ایک اور بات بھی نکل گئی تھی کہ مولانا جوہر پر بغاوت کا مقدمہ چلنے والا ہے اور پھر یہ بات درست ثابت ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی معمولی سرکاری افسر کے علم میں نہیں ہو سکتی تھی کہ مولانا جوہر پر بغاوت کا مقدمہ چلایا جانے والا ہے۔ یہ بات اسی طرف اشارہ کرتی تھی کہ ڈیڈی حکومت کے کسی اہم عہدے پر فائز ہیں۔ میرے خیال میں یہ لوگ جو مجھے تشدد کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے ان کا تعلق میرے ڈیڈی کے محکمے ہی سے تھا۔ اس خیال کا سبب وہی مونچھوں والا تھا جو نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا اور میں جس کے بارے میں کیتھی سے پوچھ رہا تھا۔

"مونچھوں والا کون؟ ہمارے ساتھ تو کوئی مونچھوں والا نہیں تھا۔" کیتھی صاف مکر گئی۔ پھر اس نے وہاں موجود دوسرے افراد کو مخاطب کیا "ہمارے ساتھ کیا کوئی مونچھوں والا بھی تھا؟" کیتھی کے سوال کا جواب ان لوگوں نے حسب توقع ہی دیا۔ انہوں نے بھی لاعلمی ہی کا اظہار کیا تھا۔

"اس طرح تم لوگ شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گے!" میری آواز میں سختی آگئی۔

"تو کس غلط فہمی میں مبتلا ہے!" بھاری آواز والے نے میز پر اُسترا رکھ کر میرے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے اور ایک جھٹکے سے میرا سر اوپر اٹھایا "اگر تو نے زبان نہ کھولی تو مار مار کے تیری کھال میں بھس بھر دوں گا میں!" اسی کے ساتھ اس نے میرے منہ پر زناٹے دار تھپڑ مارا۔

میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا۔ میں نے اپنے خون کا ذائقہ اپنی زبان پر محسوس کیا۔ بھاری آواز والے نے میرے سر کے بال چھوڑ کر دوبارہ میز سے اُسترا اٹھا لیا۔

"ٹھہرو!" کیتھی بول اٹھی "اسے ایک موقع دے دو!"

میں نے غصے میں آکر کرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر نہ اٹھ سکا۔ دو قوی الجثہ افراد نے مجھے بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ میرے بازو انہوں نے اس طرح موڑ رکھے تھے کہ اُٹھنے کی کوشش مجھے مہنگی پڑی۔ میں تھوڑا سا اُٹھتے ہی پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اُٹھنے سے میرے بازوؤں پر شدید دباؤ پڑا تھا۔

"فضول کوشش مت کرو طارنوش!" کیتھی مجھ سے مخاطب ہوئی "تم سے جو کچھ پوچھا جا رہا ہے' اگر تم نے بتا دیا تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

"مگر تم نے مجھے پکڑا ہی کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ تم اور تمہارے ساتھی' حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔" کیتھی نے جواب دیا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ میرا کوئی ساتھی نہیں!"

"کیا ان دونوں سے بھی تمہارا کوئی تعلق نہیں جو تمہارے ہی ساتھ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہیں؟" کیتھی نے چبھتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اس سوال کی روشنی میں میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ میرے ساتھ ہی سیتا اور جوگیندر بھی ان کی نظر میں آچکے ہیں۔ بخت خان اور اپنے دونوں تبتی ساتھیوں سے تو میں لاعلمی کا اظہار کر سکتا تھا مگر سیتا اور جوگیندر کا معاملہ مختلف تھا۔ میں ان کے بارے میں کہہ سکتا تھا کہ وہ میرے دوست ہیں۔ میرے خیال میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر فوری طور پر میں نے اس کا اقرار کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

"تم لوگ یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو کہ ان دونوں سے میرا کوئی تعلق ہے یا نہیں!" میری آواز میں غصہ تھا۔

"ہم کون ہوتے ہیں' کیا تمہیں پھر بتانا پڑے گا!" بھاری آواز والے نے میری ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے درشت انداز میں کہا۔

"حد سے تجاوز نہ کرو ورنہ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا! تمہیں یقیناً اس کی اجازت نہیں دی گئی ہوگی کہ مجھ پر تشدد کرو!"

"صرف تشدد!" بھاری آواز والا کریہہ انداز میں ہنسا "ہمیں تو اس کی اجازت بھی ہے کہ حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث افراد کو گولی مار دیں۔ سمجھا تو!" اس نے یہ کہتے ہوئے تیزی کے ساتھ میرے دائیں کان کی لو چٹکی میں پکڑی اور پھر تیز اُسترا حرکت میں آگیا۔

میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے میرے کان کی لو کاٹ دی تھی۔ اس نے اتنی تیزی دکھائی تھی کہ میں کچھ سمجھ ہی نہ سکا تھا۔

"میں اسی طرح تیرے جسم کی کھال اس اُسترے سے اُتار سکتا ہوں! تیرے جسم کو چھوٹی چھوٹی بوٹیوں میں تبدیل کر سکتا ہوں! اب تجھے یقین آیا؟" اس کی آواز میں بلا کی وحشت و درندگی تھی۔

میرے دائیں کان کے نچلے حصے میں آگ سی بھر گئی اور خون کے قطرے شانے پر ٹپکنے لگے۔ میں نے سوچا' شاید مجھے واقعی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ یہ سب کچھ میرے ڈیڈی کے ایما پر نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنے ظالم کیسے ہو سکتے ہیں کہ جسے انہوں نے

اپنی اولاد کی طرح پالا ہے' اس کا اپنے ماتحتوں کے ہاتھوں یہ حشر کرائیں! یہ خیال آتے ہی میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہری دوڑ گئی۔ غیر معمولی حالات کے باوجود میں اب تک اس لیے مطمئن تھا کہ وہ پوچھ گچھ کے دوران میں حد سے تجاوز نہیں کریں گے مگر اب حد گزر چکی تھی۔ بھاری آواز والے نے مجھے جو دھمکی دی تھی اس پر عمل شروع کر دیا تھا۔

"مجھ مس کیتھی کے سوالوں کا جواب دینے پر آمادہ ہے یا میں تیرا پورا کان ہی اُڑا دوں؟" اس نے تیز اور چمکدار پھل والا اُسترا آگے بڑھایا۔

اسی لمحے میرے جسم میں برقی رو سی دوڑ گئی اور اس کی شدت سے میرا جسم جھٹکے کھانے لگا۔ میرے وجود میں پوشیدہ پراسرار قوتیں بیدار ہونے لگیں' مجھ پر جناتی صفات غالب آتی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی کان کی تکلیف غائب ہو گئی۔ وقتی طور پر جو خوف مجھے محسوس ہوا تھا وہ بھی قطعی ختم ہو گیا۔

میں نے کسی تکلیف یا دباؤ کے بغیر اپنے بازوؤں کو حرکت دی۔ دوسرے ہی لمحے میرے بازو سخت گرفت سے آزاد ہو چکے تھے۔ میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پہلا وار میں نے بھاری آواز والے کی کلائی پر کیا۔ اس کی کلائی میری آہنی گرفت میں آگئی۔ کلائی کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی اور اُسترا میز پر گرا۔ بھاری آواز والے کی منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے اُسترا اٹھا لیا۔

"اسے پکڑو! پکڑو اسے!" کیتھی تقریباً چیخ اُٹھی۔

میں تیزی سے مڑا۔ وہ دونوں جو میرے بازو جکڑے ہوئے تھے' فرش سے اٹھ رہے تھے۔ میں نے بھاری آواز والے کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ کسی مردہ چھپکلی کی طرح زمین پر گر پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں اٹھ کر سیدھے کھڑے ہوتے' میں اپنی جگہ سے اچھلا اور ان دونوں پر جا رہا۔ میں نے اپنے دونوں بازوؤں میں ان کی گردنیں دبا لیں۔ ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ پھر ان کے جسم ڈھیلے ہونے میں دیر نہیں لگی۔

"نہیں! گولی نہ چلانا!" میں نے کیتھی کی آواز سنی۔

میں پلٹا تو اس شخص کو پستول ہاتھ میں لیے دیکھا جو بھاری آواز والے کے برابر بیٹھا تھا۔ کیتھی اس کے قریب ہی میز پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی ہوئی تھی۔

"اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا لو ورنہ مس کیتھی کے حکم کے باوجود گولی مار دوں گا!" پستول والے نے مجھے حکم دیا۔ کیتھی ان سب کی انچارج معلوم ہوتی تھی۔

ہوا کے تند و تیز جھونکے کی طرح دوسرے ہی لمحے میں پستول والے تک پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر گولی چلاتا' میں نے اس کا پستول چھین لیا۔ اسی کے ساتھ میرے پیر کی ٹھوکر اس کی پنڈلی پر پڑی۔ وہ جھکا تو میری کلائی کی ضرب اپنی ٹھوڑی پر کھا کے چیختا ہوا زمین پر گر گیا۔

میرے ایک ہاتھ میں اُسترا اور دوسرے میں پستول تھا۔ پستول کو میں نے پینٹ کی جیب میں رکھ لیا اور کیتھی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا حسین و خوب صورت چہرہ حیرت کی زیادتی کے سبب وحشت زدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس کے بالکل قریب تھا۔

"مس کیتھی! اس اُسترے سے پہلے تمہاری ناک کاٹوں یا اس کتے کے نرخرے پر اُسترے کی تیز دھار آزماؤں جو اپنی کلائی ٹوٹنے کے بعد اُدھر بے ہوش پڑا ہے؟" یہ کہتے ہوئے اُسترے کو میں اس کے چہرے کے گرد گردش دینے لگا۔

"نن۔۔۔ نہیں!" کیتھی اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر چیخی۔

اچانک مجھے اسنیٰ کی پُراسرار مخصوص خوشبو محسوس ہوئی اور پھر میں نے اس کی سرگوشی سنی "طارنوش! خطرہ تمہاری طرف بڑھ رہا ہے۔ یہاں سے نکل جاؤ!" اسی وقت مجھے اپنے دائیں کان کے نچلے حصے میں ٹھنڈک سی لگی۔ اسنیٰ کی سرگوشی پھر ابھری "میں نے تمہارے کان کی کٹی ہوئی لو جوڑ دی ہے جاؤ! اس عمارت سے جلد از جلد نکل جاؤ!" پھر اسنیٰ کی خوشبو معدوم ہو گئی۔

اپنے ہاتھ سے اُسترا ایک طرف پھینک کر غیر ارادی طور پر میں نے دائیں کان کی لو کو چھو کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے کان کی لو کاٹی ہی نہیں گئی تھی۔ اسنیٰ نے غلط نہیں کہا تھا۔ جسم کا کوئی کٹا ہوا حصہ دوبارہ اسی جگہ جوڑا جا سکتا ہے۔ یہ امر میرے لیے حیرت ناک ہی تھا۔

لمحہ حیرت سے نکل کر مجھے یاد آیا کہ اسنیٰ نے میری طرف بڑھنے والے کسی خطرے کی نشاندہی بھی کی ہے اور وہاں سے فرار ہو جانے کی تاکید بھی! خطرے کی نوعیت سے اس نے مجھے آگاہ نہیں کیا تھا۔

کیتھی اب بھی وحشت زدہ سی میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کمرے میں کیتھی کے سوا کوئی ہوش میں نہیں تھا۔ حواس باختہ ہونے کے باوجود کیتھی بھی میرے فرار کی راہ میں مزاحم ہو سکتی تھی۔ یہی سوچ کر میں نے اس کی گردن پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ حیران کن تیزی کے ساتھ اُچھل کر پیچھے ہٹ گئی اسی کے ساتھ اس نے میز پر ایک طرف پڑا ہوا اپنا وینٹی بیگ بھی اُٹھا لیا تھا۔

اسی وقت میں نے قریب ہی کہیں گولی چلنے کی آواز

سُنی۔ پھر پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ لمحے بھر کو میرا دھیان بٹ گیا۔ میں نے کیتھی کو وینٹی بیگ کھولتے دیکھا۔ جب تک میں لپک کر اس کے قریب پہنچا' وہ اپنے وینٹی بیگ سے چھوٹا سا خطرناک کھلونا نکال چکی تھی۔

"کتیا کہیں کی!" میں نے اسے دبوچ لیا۔ یوں جیسے کوئی عقاب اپنے شکار کو دبوچ لیتا ہے۔

اس کے منہ سے ڈری ڈری سی چیخ نکلی اور پھر وہ میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ جھٹکے کے سبب شاید اس کے جسم پر میری گرفت ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سخت ہو گئی تھی اور وہ برداشت نہ کر سکی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے میرے قدموں کے پاس گر گیا تھا۔

یہ سوچ کر کہ وہ بہرحال ایک عورت ہے' میں نے آہستگی کے ساتھ فرش پر اسے ڈال دیا۔ دھماکے اب بھی سنائی دے رہے تھے۔

میں دروازے کی طرف جھپٹا۔ دروازہ مجھے کھلا ہوا نہیں ملا۔ اسے باہر سے کسی نے بند کر دیا تھا۔ میں نے پلٹ کر تیزی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ دائیں جانب مجھے ایک دروازہ اور نظر آیا۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا اس دروازے تک پہنچا اور ٹھٹھک کر رک گیا۔ دور سے مجھے دروازے میں پڑا ہوا چھوٹا سا تالا نظر نہیں آسکا تھا۔ اس کی وجہ کمرے میں ناکافی روشنی تھی۔ وہاں میز پر صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا جس کی روشنی محدود تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس تالے کی چابی انہی میں سے کسی کے پاس ہو سکتی تھی جو بے ہوش پڑے تھے' مگر میں نے چابی تلاش کرنے میں وقت ضائع کرنا بے سود سمجھا۔ میں اب ایک اور فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کمرے سے نکلنے کا واحد راستہ یہی تھا کہ یا تو میں بیرونی دروازہ توڑ دیتا یا اندرونی دروازے کا تالا توڑ کر دروازہ کھول لیتا۔ کمرے میں مجھے کوئی کھڑکی نظر نہیں آئی تھی۔ روشن دان خاصی بلندی پر تھے۔ دروازے توڑنے کی نسبت مجھے اندرونی دروازے کا تالا توڑنا آسان معلوم ہوا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ اندرونی دروازہ ہی ہو سکتا تھا۔ بہ طور احتیاط اسے مقفل کر دیا گیا ہو گا۔ بیرونی دروازے کو بھی باہر سے بند کرنے کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ مجھے وہاں پہنچا کر باہر سے دروازہ بند کر دیا گیا ہو گا کیتھی تو میرے ساتھ ہی داتا دربار سے آئی تھی مگر اس کمرے میں موجود دوسرے چار افراد ان میں سے نہیں تھے جو مجھے داتا دربار میں ملے تھے یا کار میں ساتھ آئے تھے۔ وہ چاروں پہلے ہی سے اس کمرے میں موجود رہے ہوں گے یا پھر اس وقت یہاں آئے ہوں گے جب مجھے کار سے اُتار کر کمرے کی طرف لایا جا رہا تھا۔

میں نے محض نتائج تک پہنچنے اور ایک فیصلہ کرنے میں چند ہی لمحے صرف کیے تھے۔ مجھے اپنی قوت کا اندازہ تھا۔ میں نے تالے کے کڑے میں انگلی پھنسا کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ تالا میرے ہاتھ میں آگیا۔ اسے پھینک کر میں نے کنڈی کھول دی۔ میں نے جیسے ہی دروازے کے دونوں پٹ اندر کی طرف دھکیلے۔ عقب سے بیرونی دروازہ کھولے جانے کی آواز آئی۔ میرے اعصاب تن گئے۔ اسنی نے جس خطرے کی پیش گوئی کی تھی شاید وہ میرے بہت قریب آچکا تھا۔ فرار ہونے میں غالباً میں نے دیر کر دی تھی۔ اندرونی دروازہ کھلتے ہی مجھے تاریکی نظر آئی تھی۔ اُدھر گھپ اندھیرا تھا۔ میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ اس کمرے کا بیرونی دروازہ بہرحال نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہاں تاریکی نظر نہ آتی۔ میں سمجھا تھا کہ وہ دروازہ کسی راہداری میں کھلتا ہو گا۔ یا تو وہ اس کمرے سے ملحق کوئی اسٹور وغیرہ تھا یا پھر کوئی اور کمرا۔ نہ اتنا وقت تھا نہ مہلت کہ میں اس کی تصدیق کر سکتا۔ ابھی میں یہ سوچ نہیں سکا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کہ دروازہ کھول کر تین مسلح افراد اندر آگئے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں اور ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"اگر تم نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت کی تو تمہارا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا!" پستول والے نے مجھے مخاطب کیا۔ دروازہ کھلتے ہی شاید اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

میں بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ایک پستول اور دو بندوقوں کی نالیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ بجلی رو سی اب بھی میرے سارے جسم میں گردش کر رہی تھی' بجلیاں سی اب تک میرے رگ و پے میں کوند رہی تھیں۔ شدید ترین خطرے کے باوجود میں اپنی جگہ سے حرکت کرنے ہی والا تھا کہ میں نے ان تینوں ہی کو یکے بعد دیگرے لڑا کر زمین پر گرتے ہوئے دیکھا' اسی کے ساتھ اسنی کی خوشبو مجھے محسوس ہوئی اور اس کی تیز سرگوشی سنائی دی "طارنوش! تیزی کے ساتھ یہاں سے بھاگ جاؤ! تمہاری تیز رفتاری کی وجہ سے ان کی نظریں تم پر نہیں ٹک سکیں گی جاؤ! بھاگو' تیز رفتاری سے بھاگو!"

فائرنگ کی آوازیں اب رُک گئی تھیں۔ یہ فائرنگ بھی میرے لیے ایک معما ہی تھی' مگر یہ معمے حل کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اسنی کی تاکید کے بعد ایک لمحے کو بھی میں مزید وہاں نہیں رُکا۔ کسی طوفانی جھکڑ کی طرح میں کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے نکل کر ایک راہداری میں پہنچ گیا۔ میں

نے بس ایک نظر دو مسلح محافظوں کو اُدھر آتے دیکھا تھا۔ ان کی بندوقیں شانوں پر لٹکی ہوئی تھیں۔ پھر اسی تیز رفتاری کے ساتھ کسی خطرے کی پروا کیے بغیر میں ان کے قریب سے گزر گیا تھا۔ راہداری کے اختتام پر مجھے موڑ پر زینوں کے نیچے ایک طرف گاڑی نظر آئی تھی۔ جس میں بیٹھ کر میں داتا دربار سے وہاں پہنچا تھا۔

جب میں ان دونوں مسلح محافظوں کے قریب سے گزرا تھا تو ان کے منہ سے حیرت زدہ سی آوازیں نکلی تھیں مگر میری تیز رفتاری میں فرق نہیں آیا تھا۔ انہوں نے ہوا کی تیز سنسناہٹ ہی کو اپنے برابر سے گزرتے محسوس کیا ہو گا۔ اس سے پہلے مجھے اپنی اس قدر تیز رفتاری کا علم نہیں تھا کہ مجھ پر نظریں نہ ٹھہر سکیں۔ اس کا تجربہ مجھے آج پہلی بار ہوا تھا۔ زن سے میں نے راہداری عبور کی۔ زقند بھر کے میں سیڑھیاں پار کر گیا۔ اب میں اس عمارت کے احاطے میں تھا۔ سامنے ہی مجھے کھلا ہوا پھاٹک نظر آرہا تھا اور پھاٹک کے دونوں طرف بھی دو مسلح محافظ نظر آ رہے تھے۔ پھاٹک کے باہر پختہ سڑک دکھائی دے رہی تھی۔ پھاٹک کے قریب کھڑے ہوئے ان دونوں مسلح محافظوں کی بھی پروا کیے بغیر میں اپنی تیز رفتاری برقرار رکھے ہوئے آگے بڑھا' مگر پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے کسی نے جیسے میرے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا اور میرے قدم رک گئے۔ میری آنکھوں نے ایک ایسا ہی منظر دیکھا تھا۔

کئی مسلح محافظ میرے جنگلی ساتھی نیچو کو نرغے میں لیے پھاٹک سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ نیچو ہتھکڑیاں پہنے ہوئے تھا۔

وہ بس لمحے بھر کا روح فرسا نظارہ تھا۔ اسنی کی تاکید کو پس پشت ڈال کر میں ان محافظوں پر پل پڑا۔ مسلح محافظ اچانک غالباً سمجھ ہی نہ سکے کہ ان پر کیا افتاد ٹوٹ پڑی ہے! انہیں تو اسلحہ کے استعمال کی مہلت بھی نہیں مل سکی تھی۔ انہوں نے تو اپنے درمیان ایک غیر معمولی وجود کو حرکت کرتے دیکھا ہو گا۔ اتنی تیز حرکت جو ان کے وہم و گمان میں نہیں آسکتی تھی۔ کسی کے لات پڑی' کسی کے گھونسا' کسی کے پیٹھ پر کہنی پڑی' کسی کو میرے سر کی ٹکر نے لڑا کر گرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر میں نے ایک محافظ سے اس کی بندوق چھین لی اور اسے نال کی طرف سے پکڑ کر گھمانا شروع کر دیا جو بھی اس کی زد میں آتا گیا' چیخ کر ڈھیر ہوتا گیا۔ نیچو بھی ہتھکڑیاں پہنے کے باوجود اس معرکے میں شامل ہو گیا۔

یہ ہنگامہ پھاٹک کے قریب ہی بپا ہوا تھا اس لیے وہ دونوں محافظ بھی لپیٹ میں آگئے جو پھاٹک کے پاس کھڑے تھے۔

چیخ پکار کی آوازیں بہ مشکل دو منٹ سنائی دی ہوں گی کیونکہ اس کے بعد کم از کم احاطے میں کوئی چیخنے چلانے والا نہیں رہا تھا۔ سارے ہی محافظ بے ہوش ہو چکے تھے۔ عمارت کی طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں تو میں چونک اٹھا۔

پھر نیچو "ارے ارے" ہی کرتا رہ گیا اور میں نے زبردستی اسے اپنی پشت پر لاد کر دوڑنا شروع کر دیا۔ میں جلد از جلد اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا اور اس کی واحد ترکیب یہی تھی کہ میں نیچو کو اپنی کمر پر لاد لیتا اور میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ وہ میری تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کدھر جانا چاہیے تھا اور یہ کہ میں کس طرف جا رہا تھا۔ فی الحال تو میری پہلی ترجیح یہی تھی کہ وہاں سے دور نکل جاؤں۔ میں نے اس سلسلے میں نیچو کی خوف زدہ آوازوں کی پروا بھی نہیں کی تھی اور نہ یہ سوچا تھا کہ اس طرح نیچو پر میری ایک پُراسرار قوت کا راز کھل جائے گا۔ وہ لمحات ان باتوں کو سوچنے کے نہیں تھے۔ ذرا سی دیر میں خبر نہیں میں کہاں سے کہاں جا نکلا! مگر مجھے اتنا اندازہ بہرحال تھا کہ میں اس علاقے سے کافی دور نکل آیا ہوں۔

میری رفتار آہستہ ہوتی گئی اور پھر میں ایک نیم تاریک سے باغ میں گھس گیا جو قریب ہی سڑک کے کنارے نظر آرہا تھا۔ "نیچو! نیچو!" میں نے اپنے ساتھی کو آہستہ سے پکارا۔

"ہوں۔۔۔ لوں!" مجھے اس کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ یوں جیسے کوئی گہری نیند سے بیدار ہوتے وقت بولتا ہے۔

میں نے آہستگی کے ساتھ اسے اپنی کمر سے اُتارا۔ وہ بے سدھ سا ہو رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے اسے کمر سے اُتارا وہ زمین پر لیٹ گیا۔ اس کی حالت کسی ایسے شرابی کی سی تھی جو اپنے ظرف سے زیادہ پی گیا ہو۔

اسی وقت میرا دھیان ہتھکڑیوں کی طرف گیا۔ میرے جسم کی غیر معمولی قوت و طاقت ابھی تک برقرار تھی۔ میں نے باری باری دونوں ہتھکڑیاں توڑ دیں۔ عام حالات میں وہ آہنی ہتھکڑیاں توڑنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ احتیاط کے پیش نظر میں نے ان ہتھکڑیوں اور ان سے منسلک لوہے کی زنجیر کو قریب ہی مٹی میں دبا دیا۔ پھر میں دوبارہ نیچو کی طرف متوجہ ہوا۔ "نیچو! نیچو۔۔۔ اٹھو!" میں نے اسے جھنجوڑ دیا۔

"ہاں۔ ہوں!۔۔۔ کیا۔۔۔ کک۔۔۔ کیا بات ہے؟" وہ ایک

دم اس طرح اُٹھ کر بیٹھ گیا جیسے سوتے سے اچانک اُٹھا ہو "ہم۔ ہم کہاں ہیں؟"

"ہوش میں آؤ یار! تم کہاں پہنچے ہوئے ہو؟" میں دھیرے سے ہنس کر بولا "کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے تھے!"

"شا۔ شاہین! ہم۔ ہم خطرے سے نکل آئے نا؟" اسے گزرا ہوا واقعہ یقیناً یاد آگیا تھا "مگر مجھے۔ مجھے کیا ہو گیا تھا!" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"کیا ہو گیا تھا تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے جیسے ہی مجھے کمر پر لاد کر دوڑنا شروع کیا' میں کوشش کے باوجود اپنے ذہن پر غنودگی طاری ہونے سے نہ روک سکا۔ ابھی تم نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا ہے تو میں اُٹھا ہوں۔ حیرت ہے کہ مجھے کیسے نیند آگئی! وہ بھی ایسے عالم میں کہ ہم دونوں ہی شدید خطرے میں تھے۔" ٹیپو حیرت سے بتانے لگا۔

پھر ٹیپو نے شاید کچھ اور بھی کہا تھا مگر میں نہ سُن سکا۔ میں اسنی کی مخصوص خوشبو محسوس کرکے اس کی سرگوشی سننے لگا تھا "تمہارے ساتھی کے ذہن پر میں نے اس لیے غنودگی طاری کردی تھی کہ تمہاری پُراسرار قوتوں کا راز اس پر نہ کھل سکے۔"

اس حالت میں اگر یہ گر جاتا تو؟ میں نے یہ سوچا ضرور مگر زبان سے کچھ نہیں بولا۔

"میں اسے گرنے دیتی تو یہ گرتا نا!"

شکریہ' اسنی! ویسے میرا دھیان بھی تمہاری ہی طرف گیا تھا کہ تم ہی نے اسے سُلا دیا ہوگا۔ جب میں یہ سوچ رہا تھا' اچانک میرے جسم کو تیز جھٹکا لگا اور پھر مجھ پر اتنی شدید نقاہت طاری ہوئی کہ میں بیٹھے بیٹھے ہی زمین پر لُڑھک گیا۔

"کیا ہوا؟۔ کیا ہو گیا تمہیں شاہین؟" ٹیپو میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ مجھے میرے تنظیمی نام ہی سے مخاطب کر رہا تھا کیوں کہ اسے میرا یہی نام معلوم تھا۔

مجھ پر اتنی نقاہت طاری تھی کہ کوشش کے باوجود اس کے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ میں لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

"بولو شاہین' بولو!۔ بتاؤ نا کیا بات ہے؟ تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے؟" وہ مجھے جھنجوڑے ڈال رہا تھا اور ایسا مجھ سے محبت ہی کے سبب تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد میری حالت اعتدال پر آگئی۔ اس میں نصف منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ "یار! تم تو بہت ہی چھوڑ ہو۔" میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے ہنس کر ٹیپو سے کہا "کچھ دیر لیٹ کر ستانے بھی نہیں دیتے! حالانکہ تمہیں اتنی دور سے کمر پر لاد کر یہاں تک لایا ہوں' تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ بندہ تھک گیا ہوگا' گھڑی بھر کو لیٹ جانے دو۔ جھنجوڑ ڈالا بس!"

"تو منہ سے تو کچھ بولتے نا! میں نے تو تمہیں جھٹکا سا کھا کر ایک دم لیٹتے دیکھا تھا۔ میں سمجھا' خدانخواستہ تمہاری طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو' معاف کرنا۔"

"خیر اس بات کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم ان لوگوں کے ہتھے کیسے چڑھ گئے تھے؟ اور بخت خاں کہاں ہے؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بخت خاں' حیدر علی اور ہمارے تین مقامی ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے اور میں۔ میں دانستہ پیچھے رہ گیا تھا۔ اسی وجہ سے پکڑا گیا۔ صورت حال ایسی ہی تھی کہ اگر میں انہیں اُلجھا نہ لیتا تو۔ تو شاید وہ ہم سبھی کو گھیر لیتے اور کوئی بھی بچ کر نہ نکل پاتا۔ مجھے علم تھا کہ میں تنہا زیادہ دیر ان کا مقابلہ نہیں کر سکوں گا اور وہ مجھے گرفتار کرلیں گے۔ میں نے محض اس لیے انہیں اُلجھا لیا تھا کہ بخت خاں اور میرے دوسرے ساتھیوں کو فرار ہونے کی مہلت مل جائے۔" اپنے تنظیمی ساتھیوں کے لیے ٹیپو نے واقعی زبردست قربانی دی تھی۔ خود موت کے منہ میں جانا کھیل نہیں ہوتا۔

"تمہارے اندازے کے مطابق بخت خاں اور دوسرے ساتھی فرار ہو کر کہاں گئے ہوں گے؟" میں نے سوال کیا "کیا یہاں بھی دہلی کی طرح بہ طور احتیاط دوسرا ٹھکانا۔"

"تم شاید کچھ غلط سمجھ رہے ہو شاہین!" ٹیپو میری بات کاٹ کر بولا "بخت خاں' ساتھیوں کو لے کر لوہاری گیٹ ہی گیا ہوگا۔ ہم وہیں ٹھہرے ہیں۔ تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ پولیس نے ہمارے ٹھکانے پر چھاپا مارا ہوگا۔"

"تو پھر؟" ٹیپو کے مزید کچھ بولنے سے پہلے ہی تجسس کے زیر اثر میں بول اُٹھا۔

"پولیس نے ہمارے ٹھکانے پر چھاپا نہیں مارا تھا بلکہ ہم نے خود سی آئی اے سینٹر پر چھاپا مارا تھا۔"

"مگر کس لیے؟" میں نے حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔

"تمہیں رہا کرانے کے لیے۔" ٹیپو نے جواب دیا۔

پھر وہ معما حل ہو گیا کہ جب میں سی آئی اے سینٹر کی عمارت کے اندر ایک کمرے میں تھا تو اچانک فائرنگ کی آوازیں کیوں سنائی دینے لگی تھیں! ٹیپو نے مجھ سے جو روداد

بیان کی وہ مختصراً یہ تھی۔ ہوا یہ تھا کہ روزانہ کی طرح مغرب سے کچھ پہلے بخت خاں' لوہاری گیٹ سے داتا دربار کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ آج بھی اس نے یہ خیال رکھا تھا کہ وقت مقررہ پر داتا دربار پہنچ جائے تاکہ میں لاہور آگیا ہوں تو مجھے داتا دربار سے مایوس نہ لوٹنا پڑے۔ وہاں اس نے مونچھوں والے کو دیکھا جسے وہ پہچانتا تھا۔ بخت خاں کو علم تھا کہ مونچھوں والے کا تعلق حکومت کے کس محکمے سے ہے! وہ اسی لیے مجھ سے نہیں ملا۔ بخت خاں اس مونچھوں والے کا نام بھی جانتا تھا۔ مونچھوں والے کا نام حسن علی تھا۔ حسن علی کے ساتھ اس کے محکمے کے دوسرے افراد بھی تھے۔ جو میری نگرانی کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر بخت خاں میرے قریب نہیں آیا اور ہجوم سے نکل گیا۔ اگر وہ مجھ سے ملتا تو وہ بھی نظر میں آجاتا۔ پھر جب مجھے وہاں سے کار میں بٹھا کر لے جایا گیا تو بخت خاں وہاں سے لوہاری گیٹ پہنچ گیا۔ مقامی تنظیمی ساتھیوں سے اسے سی آئی اے سینٹر کے بارے میں معلوم ہوا کہ کہاں واقع ہے! بخت خاں کو یقین تھا کہ مجھے وہیں لے جایا گیا ہوگا۔ اس نے مجھے ہر قیمت پر رہا کرانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے بخت خاں نے مقامی ساتھیوں کے مشورے سے سی آئی اے سینٹر پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لاہور میں سی آئی اے سینٹر کے محل وقوع سے کیوں کہ بخت خاں بہ ذات خود واقف نہیں تھا اس لیے اسے مقامی ساتھیوں پر انحصار کرنا پڑا۔ اس کے منصوبے میں پولیس سے ٹکراؤ شامل نہیں تھا لیکن اس نے یہ امکان بھی نظرانداز نہیں کیا تھا پھر وہی ہوا جس کا اسے خدشہ تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ سی آئی اے سینٹر کی عمارت میں داخل نہیں ہو سکا۔ ٹکراؤ کے نتیجے میں اسے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ایک مقامی ساتھی کو گولی لگنے سے یہ صورت حال پیش آئی۔ نماز بخشوانے گئے اور روزے گلے پڑ گئے والی مثل صادق آگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے راہ فرار کے سوا کوئی چارۂ نظر نہ آیا۔ اس مسلح مقابلے میں بخت خاں کے ساتھ ٹیپو اور حیدر علی کے علاوہ صرف تین مقامی ساتھی تھے۔ جن میں سے ایک شدید زخمی ہو چکا تھا۔ صورت حال کچھ ایسی ہوئی کہ پولیس کا گھیرا ان کے گرد تنگ ہونے لگا جب وہ سی آئی اے سینٹر کی عمارت سے باہر آچکے تھے۔ اس موقع پر ٹیپو کی قربانی کام آئی۔ بخت خاں' زخمی مقامی ساتھی اور اپنے بقیہ ساتھیوں کو لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا' ٹیپو پکڑا گیا۔

ٹیپو سے یہ سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود چند باتیں اب بھی ایسی تھیں جن کی وجہ سے میرا ذہن پریشان تھا۔ پہلی بات تو یہی تھی کہ مونچھوں والا جس کا نام مجھے پہلی بار معلوم ہوا تھا' وہ دہلی سے لاہور کب اور کیوں پہنچا؟ دوسرے یہ کہ کیا وہ میری ہی طرح بخت خاں کو بھی پہچانتا تھا؟ پھر یہ کہ اسے کس طرح معلوم ہوا کہ میں بخت خاں کی تلاش میں داتا دربار پہنچا تھا؟

ان تمام سوالوں سے قطع نظر میری نظر میں سیتا اور جوگیندر کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ سی آئی اے سینٹر میں مجھ سے جو پوچھ گچھ کی گئی تھی اور کیپٹن نے جو کچھ کہا تھا' اس سے یہ تصدیق ہو چکی تھی کہ سیتا اور جوگیندر بھی ان لوگوں کی نظر میں آچکے تھے۔ یا تو ان دونوں کو بھی گرفتار کیا جا چکا تھا یا اگر ابھی یہ قدم نہیں اُٹھایا گیا تھا تو میرے فرار کے بعد یقیناً ان پر ہاتھ ڈال دیا جاتا۔ اس سلسلے میں ٹیپو سے حقیقت حال جان کر ہی میں کوئی قدم اُٹھانا چاہتا تھا۔ لاہور پہنچتے ہی جو واقعات پیش آئے تھے' وہ بہرحال ہم سبھی ساتھیوں کے لیے خطرناک کہے جا سکتے تھے' خواہ اس کا سبب کچھ بھی کیوں نہ رہا ہو!

اس وقت میری نظر میں اوّلین ترجیح سیتا اور جوگیندر کی تھی۔ اس امکان کو میں نے نظرانداز نہیں کیا تھا کہ ان دونوں کو مجھ سے پوچھ گچھ کے بعد پکڑا جاتا۔ اس کی واحد صورت یہی تھی کہ میں پہلے ٹیپو کو ساتھ لے جا کر لوہاری گیٹ والا ٹھکانا دیکھتا' اس کے بعد سیتا اور جوگیندر کو وہاں لے آتا۔

پھر میں نے ٹیپو کو اپنے ارادے سے باخبر کر دیا۔ اس نے میری رائے سے اتفاق کیا اور بولا "ہاں یہ بہت ضروری ہے شاہین! ہمیں پہلے لوہاری گیٹ پہنچنا چاہیے تاکہ بخت خاں کو کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے کہ ہم دونوں اب زیر حراست نہیں ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں بخت خاں سی آئی اے سینٹر پر دوبارہ نہ چڑھ دوڑے!"

ٹیپو کی روداد تو میں نے سن لی تھی مگر اسے ابھی تک اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اگر میں اسے یہ بتاتا کہ سیتا اور جوگیندر خطرے میں ہیں یا پولیس کی نظر میں آچکے ہیں تو ممکن ہے اس کا مشورہ مختلف ہوتا۔ ابھی مجھے اتنی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی کہ اس سے تفصیلی گفتگو ہو سکتی۔

ہم دونوں اس باغ سے نکل کر سڑک پر آگئے۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد ہمیں ایک تانگا مل گیا۔ ٹیپو بھی میری طرح پہلی بار ہی لاہور آیا تھا۔ اسے بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم اس وقت لاہور کے کس علاقے میں تھے۔ ہمارے لیے اس

سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ تانگے والے نے ہمیں لوہاری پہنچا دیا۔ وہاں سے نیپو کو راستہ معلوم تھا۔

میں اور نیپو دونوں ہی چوکنا اور محتاط تھے کہ کہیں ہمارے پیچھے کوئی "مکھی" نہ لگ جائے! ہم دونوں ہی کو بہرحال بچانا چاہتا تھا۔ پولیس ہمارا تعاقب کرتی ہوئی اس ٹھکانے تک پہنچ سکتی تھی۔ باغ ہی سے نکلتے ہوئے نیپو کو پہلی بار ہتھکڑیوں کا خیال آیا تھا۔ اس پر نیپو نے شدید حیرت کا اظہار کیا تھا اس کے ہاتھوں سے وہ آہنی زیور کب اور کیسے غائب ہو گیا؟ بات تھی بھی حیرت کی مگر میں دانستہ انجان بن گیا۔ یہ بتا کر کہ ہتھکڑیاں میں نے توڑی تھیں میں مزید سوالات کا دروازہ نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ وہ پوچھتا کہ کس طرح؟ تو میں اس سوال کا جواب نہ دے پاتا۔

نیپو مجھے ساتھ لیے ایک گلی میں داخل ہوا اور پھر ایک تین منزلہ مکان کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دروازے ہی کے قریب مجھے ایک زینہ نظر آیا جو غالباً اوپری منزلوں پر جانے کے لیے ہوگا۔

دروازے کے پیچھے قدموں کی چاپ آکر رک گئی اور پوچھا گیا "کون ہے؟"

"روشنی کے سفیر آئے ہیں۔" نیپو نے آہستہ سے کہا۔

"معاف کرو بابا!" اندر سے کہا گیا' اسی کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ نئے کوڈ ورڈز بخت خاں کے ذہن کے اختراع تھے۔ وہ شاعر بھی تھا۔

دروازہ کھولنے والا میرے لیے اجنبی ہی تھا۔ وہ یقیناً ہمارا کوئی مقامی ساتھی تھا۔ میں اور نیپو جب نئے ساتھی کی رہبری میں ایک کمرے تک پہنچے تو وہاں کا منظر دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہ کمرا اس وقت کوئی اسلحہ خانہ معلوم ہو رہا تھا۔ بندوقیں' پستول' دستی بم وہاں مجھے سبھی ہتھیار نظر آرہے تھے۔ کمرے میں اس وقت بخت خاں اور حیدر علی کے علاوہ مجھے آٹھ دس نئے چہرے نظر آرہے تھے۔ ان میں مجھے کوئی زخمی نظر نہیں آرہا تھا۔

بخت خاں اور وہاں موجود سبھی ساتھی مجھے اور نیپو کو دیکھ کر لمحے بھر کو حیران سے رہ گئے جیسے انہیں اپنی بصارت پر یقین نہ آرہا ہو۔

"آپ۔۔۔ آپ دونوں۔۔۔" بخت خاں ہکلا کر رہ گیا۔

"ہاں ہم دونوں!" میں مسکرا کر بولا۔ پھر ایک لمحہ بھی مزید ضائع کیے بغیر میں نے بخت خاں کو سیتا اور جوگیندر کے بارے میں بتا دیا کہ وہ خطرے میں ہیں۔ اسی کے ساتھ میں بولا کہ انہیں لے کر وہاں آیا ہوں۔

"نہیں!" بخت خاں کا لہجہ فیصلہ کن تھا "شاہین انہیں لینے نہیں جائیں گے۔ اس ہوٹل کا نام بتا دیجیے' آپ تینوں ٹھہرے تھے۔"

"مگر۔۔۔ مگر" میں نے کہنا چاہا کہ اس کے خیال سے نہیں ہوں۔

اس نے میری بات کاٹ دی اور بولا "آپ یہ نہ بھولیں شاہین کہ میں اس مہم کا نگراں ہوں۔ فیصلہ مجھے کرنا ہے کہ کسی! کسی وقت کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ یہ ذمے داری میری ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں قدرے تلخی آگئی۔

مجھے اس وقت بخت خاں کی صاف گوئی ناگوار سی محسوس ہوئی مگر اس کا فیصلہ درست ہی تھا۔ موجودہ حالات میں میرے لیے اس محفوظ پناہ گاہ سے باہر نکلنا زیادہ خطرناک تھا۔ سیتا سے اپنی جذباتی وابستگی کے بارے میں اسے علم ہی کیا! معاملات عشق سے بھلا تنظیم یا اس کے ارکان کا کیا تعلق! یہ میرا ذاتی معاملہ تھا کہ میں ہر طرح کا خطرہ مول لے کر اپنی محبوبہ اور اپنے دوست کو وہاں سے نکال لاتا چاہتا تھا۔ پہلے لاہوری گیٹ آنا بھی میری مجبوری تھی۔ ساتھیوں کو ان کے متعلق لاعلمی میں رکھنا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ اب میں یہاں آگیا تھا تو مجھے بہرحال بخت خاں کا حکم ماننا ہی تھا۔

بخت خاں کو میں نے ہوٹل کا نام بتایا اور کمرا نمبر بتایا۔ اس نے چار مقامی ساتھیوں کے سپرد یہ کام کیا۔

"اگر تم لوگ کسی قسم کا خطرہ محسوس کرو تو بلا دریغ اسلحہ استعمال کر سکتے ہو۔ ان دونوں کو بہرحال بہ حفاظت یہاں لے کر آنا ہے۔" بخت خاں نے جانے والوں کو ہدایت دی "تم میں سے صرف ایک اس ہوٹل کے کمرے کے دروازے پر دستک دے گا۔ دوسرا دور رہ کر اس کی نگرانی کرے گا۔ تیسرا ساتھی ہوٹل کے دروازے پر رہے گا اور چوتھا اس تانگے میں بیٹھا رہے گا جو تم لوگ اپنے ساتھ یہاں سے لے کر جاؤ گے۔ تانگا چھوڑنا نہیں ہے۔ کسی بڑی گڑبڑ کی صورت میں یعنی اگر اسلحہ استعمال کرنے کی نوبت آجائے اور معاملہ قابو سے باہر ہونے کا خطرہ ہو تو تین ساتھی وہیں رکیں' ایک جو تانگے میں ہو وہ فوری طور پر یہاں پہنچ کر اطلاع دے۔ ہم یہاں تیار رہیں گے۔ کوئی گڑبڑ یا ٹکراؤ نہ ہونے کی صورت میں بھی انتہائی محتاط رہنا ہے۔ ان دونوں کے ساتھ صرف ایک ساتھی تانگے میں بیٹھ کر آئے گا' بقیہ دوسرے تانگے میں نگرانی کریں گے۔ یہ بھی ذہن نشین کر لو کہ انہیں سیدھا یہاں لے کر نہیں آنا' جب تک یقین نہ ہو جائے کہ آگے

کوئی اجنبی یا مشتبہ جو نہیں ہے تم اس مکان کا رخ نہیں کرو گے۔" صرف اتنا جاننے کے بعد کہ سیتا اور جوگیندر خطرے میں ہیں۔ بخت خاں نے جو ہدایات دی تھیں' ان سے ذہانت اور دور اندیشی کا پتا چلتا تھا۔

وہ چاروں فوراً ہی روانہ ہو گئے تھے۔ ان چاروں ہی کے پاس پستول اور ان کی فاضل گولیاں تھیں۔ اس کے علاوہ قراری دار چاقو بھی تھے۔ یہ اسلحہ انہوں نے میرے ہی سامنے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں چھپایا تھا۔ وہ سبھی صحت مند اور تندرست و توانا تھے۔ وہ چلے گئے تو بخت خاں مجھے اور نیپو کو ساتھ لے کر ایک اور کمرے میں آگیا۔ اس کمرے میں چارپائیاں بھی تھیں اور مونڈھے بھی پڑے تھے۔ چاروں ساتھیوں کی روانگی سے قبل میں نے جوگیندر اور سیتا کا حلیہ بھی انہیں بتا دیا' اس کے علاوہ اصل اور فرضی نام بھی۔

نیپو کا اندیشہ غلط نہیں نکلا تھا۔ اگر ہم دونوں کو لوہاری گیٹ پہنچنے میں مزید کچھ دیر ہو جاتی تو بخت خاں وہاں نہ ملتا۔ وہ سی آئی اے سینٹر پر ایک منظم حملے کی پوری تیاری کر چکا تھا۔ اسے اتنی دیر صرف اسلحہ کی فراہمی میں ہوئی تھی۔ اسلحہ کا بندوبست مقامی ساتھیوں نے کیا تھا۔

ہرچند کہ میرا دھیان سیتا اور جوگیندر ہی میں پڑا ہوا تھا مگر بخت خاں پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں ان دونوں کی طرف سے انتہائی فکرمند ہوں۔ یہ بتانے کے بعد کہ اس کا ارادہ کیا قدم اٹھانے کا تھا' بخت خاں اب مجھ سے پوچھ رہا تھا "شاہین! پہلے آپ یہ بتائیں کہ سیتا اور جوگیندر خطرے میں ہیں' اس کا علم آپ کو کیسے ہوا؟"

"وہ لوگ جب مجھ سے پوچھ گچھ کر رہے تھے تو انہوں نے خود ان دونوں کا ذکر کیا تھا۔" میں نے جواب دیا' پھر بہت محتاط انداز میں صرف اتنا بتایا کہ مجھ سے پوچھ گچھ کرنے والے صرف دو تھے۔ ایک کیتھی اور دوسرا اس کا ساتھی۔ میں دانستہ غلط بیانی سے کام لے رہا تھا تاکہ میری پراسرار قوتوں پر پردہ پڑا رہے۔ "میں ایک کرسی سے بندھا ہوا تھا اور وہ مجھے ذرا دھمکا رہے تھے کہ اپنے ساتھیوں کی نشان دہی کر دوں اسی۔۔۔"

"تم پر یقیناً تشدد بھی کیا گیا ہے۔" میری بات کاٹ کر بخت خاں بول اٹھا "تمہاری قمیص پر یہ دھبے خون ہی کے معلوم ہو رہے ہیں۔ کہیں تم زخمی تو نہیں ہو؟" یہ کہتے ہوئے بخت خاں کی نظریں میرے دائیں شانے پر تھیں۔ استرے سے جب میرے دائیں کان کی لو کاٹی گئی تھی تو خون کے

قطرے ٹپک کر شانے پر گرے تھے۔ بخت خاں کے چہرے سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسی تشویش کے زیر اثر وہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا۔ اس کا احساس بھی اسے خود ہی ہو گیا تھا۔ میں نے جب اسے یہ بتایا کہ زخمی نہیں ہوں تو وہ کہنے لگا "معاف کیجیے گا شاہین' میں آپ سے ہمدردی میں بے تکلفی۔۔۔"

"یہ بے تکلفی مجھے اچھی لگی بھائی بخت خاں!" میں نے مسکرا کر کہا "اس طرح مجھے بھی آپ سے بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کا موقع مل جائے گا۔"

بخت خاں ہنس دیا اور بولا "میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے۔" پھر وہ سنجیدہ ہو گیا "ہاں یہ بتاؤ کہ تم وہاں سے فرار کس طرح ہو گئے اور نیپو تمہیں کہاں مل گیا؟ میرے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ تم دونوں ایک ساتھ یہاں پہنچو گے۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ تم دونوں کو چھڑانے کے لیے چاہے سی آئی اے سینٹر کو دستی بموں ہی سے کیوں نہ اڑانا پڑے' تم لوگوں کو وہاں سے ہر قیمت پر نکال کر لے آؤں گا۔"

"بس ان کی حماقت سے میں نے فائدہ اٹھالیا۔" میں نے بات بنائی "غلطی ان سے یہ ہوئی کہ انہوں نے نرمی کا اظہار کرنے اور اس بہانے میری زبان کھلوانے کے لیے مجھے رسیوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ انہیں شاید یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ میں وہاں سے فرار ہونے کی کوشش بھی کر سکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ پستول نکال لیا جو کیتھی کے ایک ساتھی کے ہاتھ سے چھینا تھا "جس شخص نے مجھے رسیوں کی گرفت سے آزاد کیا' یہ اسی کا پستول ہے۔ جب وہ سیدھا کھڑا ہو رہا تھا' میں نے اس کی جیب سے پستول نکال لیا۔ پھر اس انگریز عورت اور اس کے ساتھی کو قابو میں کرنا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جس وقت وہاں سے فرار ہو رہا تھا تو راہداری میں کوئی محافظ نہیں تھا۔ جب میں احاطے میں پہنچا تو نیپو کو دیکھا۔" پھر میں نے بہت اختصار کے ساتھ بقیہ روداد بیان کر دی۔ اس کا گواہ کیوں کہ نیپو بھی تھا اس لیے مزید دروغ گوئی سے کام نہیں لیا۔ ہاں اس واقعے کو غیر معمولی انداز میں بیان کرنے سے گریز کیا حالانکہ وہ واقعہ غیر معمولی ہی تھا۔ میں یہ بات بھی گول کر گیا تھا کہ نیپو کو ہتھکڑیاں پہنے ہوئے دیکھا تھا۔

بخت خاں کوئی بچہ تو تھا نہیں کہ آسانی سے بہل جاتا' پھر یہ کہ نیپو بھی موجود تھا۔ بخت خاں کے ایما پر نیپو نے من و عن

وہ باتیں بتائیں جن سے میں نے گریز کیا تھا۔ نیپو نے آخر میں کہا "شاہین کی جگہ مجھے کوئی بجلی سی کوندتی معلوم ہو رہی تھی۔ یقین کریں بخت خاں، ان کے نرغے سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ شاہین نے تو انہیں اسلحہ تک استعمال کرنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ اگر میں خود وہاں موجود نہ ہوتا اور مجھ سے کوئی یہ واقعہ بیان کرتا کہ اتنے مسلح محافظوں کے درمیان سے تن تنہا ایک شخص بچ کر نکل آیا تو ہرگز مجھے یقین نہ آتا۔ اور تو اور انہوں نے وہاں سے فرار ہوتے وقت مجھے اپنی پشت پر لاد لیا تھا، پھر اتنی تیز رفتاری سے دوڑنا شروع کیا تھا کہ میرے منہ سے۔۔۔ شاید میں خوف زدہ ہو گیا تھا اور میرے منہ سے خوف ہی کے سبب۔۔۔"

"بس کرو نا یار، مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہو!" میں وانستہ بول اٹھا کہ کہیں وہ جھکڑیوں کا قصہ نہ سنانے لگے "دراصل مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا کہ تمہیں نیند سی آ رہی ہے یا تم بہت نڈھال ہو۔ میں نے اسی لیے یہ مناسب سمجھا کہ تمہیں کمر پر لاد لوں۔"

"اور واقعی میں سو گیا تھا۔" نیپو نے بخت خاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا؟ تم سو گئے تھے؟ مگر کیوں؟ کیا ہو گیا تھا تمہیں؟" بخت خاں نے انتہائی حیرت کا اظہار کیا۔

"مجھے خود نہیں معلوم کہ کیسے نیند آ گئی تھی!" نیپو نے جواب دیا "میں تو اس وقت جاگا تھا جب شاہین نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔ وہ ایک نیم تاریک سا باغ تھا۔"

"حیرت انگیز واقعہ سنایا ہے تم نے۔" بخت خاں نے کہا، پھر میری طرف مڑا "تم تو بڑی قیامت شے نکلے جان عزیز! جو کچھ سنا ہے میں نے اس پر واقعی یقین سا نہیں آ رہا ہے۔ یعنی تم مسلح ساتھیوں کے باوجود وہاں سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا اور تم نہ صرف خود بچ کر نکل آئے بلکہ نیپو کو بھی نکال لائے۔ یہ تو تم نے کمال ہی کر دیا۔ مجھے تو اب یہ محسوس ہو رہا ہے، تمہیں اس مہم کا نگراں ہونا چاہیے تھا۔"

"کوئی کمال وال نہیں ہے، نہ میں کوئی قیامت شے وغیرہ ہوں۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے یہی سب کچھ کرتا جو میں نے کیا۔ اب مجھے بھی تو کچھ پوچھنے دیں! اس مونچھوں والے حسن علی کو صرف تم ہی جانتے ہو بھائی بخت خاں یا وہ بھی تمہیں پہچانتا ہے؟"

"مجھے یقین ہے کہ حسن علی مجھے نہیں جانتا ہوگا۔ کیوں، تم نے یہ سوال کیوں کیا؟"

"اس لیے کہ جب اس خبیث نے عقب سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تھا تو کہا تھا، تمہیں بخت خاں کی تلاش ہے نا۔ اور ہمیں تمہاری تلاش تھی۔"

یہ سن کر بخت خاں ایک دم چونک اٹھا "یہ کہا تھا حسن علی نے! حیرت ہے پہلی بات تو یہ کہ اسے کس طرح معلوم ہوا کہ تم مجھے تلاش کر رہے ہو، دوم یہ کہ اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا چلا؟"

"یہی سن کے تو میں چکرا گیا تھا۔ مجھے تمہاری طرف سے فکر ہو گئی تھی کہ کہیں تم تو ان کے چنگل میں نہیں پھنس گئے!" یہ کہہ کر مصلحتاً میں نے ایک بار پھر اپنی اصل شخصیت چھپانے کی خاطر جھوٹ بولا "میرے لیے بھی وہ بالکل اجنبی تھا۔ مجھے تو نیپو سے یہ بات معلوم ہوئی کہ تم اسے جانتے ہو اور یہ کہ اس کا نام حسن علی ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ اس نے میرے بارے میں کس طرح اندازہ لگا لیا کہ تم سے میرا کوئی تعلق ہے یا میں بھی تنظیم کا رکن ہوں!"

"اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا گم ہے لیکن کم از کم اتنا تو ضرور کہہ سکتا ہوں شاہین کہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ حسن علی کو میرا نام معلوم ہونا، یہ خبر ہونا کہ تمہیں میری تلاش ہے۔ یہ پتا ہونا کہ تم کسی ایسی زیر زمین تنظیم سے متعلق ہو جو حکومت کے خلاف سرگرم عمل ہے جیسا کہ تم نے خود بتایا بھی کہ انہوں نے یہی الزام لگا کر یا مفروضہ قائم کر کے بقیہ ساتھیوں کے بارے میں تم سے پوچھ گچھ کی اور تمہاری زبان کھلوانا چاہتے تھے۔ یہ تمام باتیں خالی از علت نہیں ہیں۔ اس امکان پر بھی غور کیا جا سکتا ہے کہ شاید ہمارے درمیان کوئی کالی بھیڑ موجود ہو۔" یہ کہہ کر بخت خاں نے سختی سے جبڑے بھینچ لیے۔

"میرا خیال ہے بخت خاں کہ تم غلط خطوط پر سوچ رہے ہو۔" میں نے کہا "معاف کرنا جان عزیز، اس نہج پر سوچنا میرے نزدیک خود اپنے وجود پر شک کرنے کے مترادف ہے۔ مجھے تمہاری اس بات سے سو فیصد اتفاق ہے کہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے مگر اس کا مطلب بہرحال یہ نہیں، ہم اپنے ساتھیوں پر شبہ کرنے لگیں۔ ممکن ہے ہم اگر پیش آنے والے واقعات کا ازسرنو تجزیہ کریں تو کوئی اور ہی بات سامنے آ جائے۔"

چند لمحے خاموش رہ کر بخت خاں کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی "تم ٹھیک ہی کہتے ہو شاہین! ہمیں ازسرنو اس معاملے پر غور کرنا پڑے گا، مگر میں نے جس امکان کی طرف اشارہ کیا ہے اسے بھی ہم قطعی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ ایسا ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے ورنہ وہ حرام زادے کوئی پہنچے ہوئے بزرگ نہیں ہیں کہ وہ تمہیں بھی پہچان گئے کہ تم انگریز حکومت کے دشمن ہو اور انہیں میرا نام بھی معلوم ہو گیا۔ میر جعفر و میر صادق ہر جگہ ہوتے ہیں۔ فرض کرو ہر جگہ نہیں ہوتے تو دھونس، دھمکی اور جان کا خوف انہیں غداری پر مجبور کر دیتا ہے۔" پھر اچانک بخت خاں نے سوال کیا "سیتا اور جوگیندر کے بارے میں تم کس حد تک پُریقین ہو کہ دھمکی، لالچ یا تشدد انہیں زبان کھولنے یا مخبری پر مجبور نہیں کر سکتا؟"

بخت خاں کی یہ بات مجھے کچھ بُری سی لگی کہ وہ جو مفروضہ قائم کر چکا تھا۔ اسی پر اڑا ہوا تھا۔ سیتا یا جوگیندر پر تو اسے ایسا شبہ بھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود میں نے صبر و تحمل سے کام لیا اور بولا "جس حد تک مجھے خود پر یقین ہے بخت خاں، میں ان دونوں بہن بھائی پر بھی یقین کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ شاید تمہارے ذہن سے ایک اور بات نکل گئی کہ خود مجاہد اوّل نے ان پر تمہاری موجودگی میں اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا ورنہ وہ اس مہم میں ہمارے ساتھ نہ ہوتے۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ کسی بھی الجھے ہوئے مسئلے کو ہر رخ سے سوچنا سمجھنا چاہیے۔ حسن علی کو تم نے دہلی میں دیکھا تھا اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس کا تعلق حکومت کے کس محکمے سے ہے!۔۔۔ ٹھیک ہے نا؟" میں نے سوالیہ نظروں سے بخت خاں کو دیکھا۔

"تم اپنی بات پوری کہو۔" وہ بولا۔

"حسن علی، کا یہاں نظر آنا کیا معنی رکھتا ہے! اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا حالانکہ اس کی وجہ کسی حد تک میرے علم میں تھی۔ یقیناً میرے ڈیڈی کو مجھ پر شک ہو گیا تھا کہ میں کسی پہاڑی تفریحی مقام پر نہیں کہیں اور ہی جا رہا ہوں۔ انہی کے ایما پر حسن علی دہلی سے میرا تعاقب کرتا ہوا لاہور پہنچا ہوگا۔ یہاں آ کر فوراً ہی اس نے اپنے محکمے والوں سے رابطہ قائم کیا ہوگا اور کارروائی بڑھ گئی ہوگی۔ ایک انگریز عورت کیتھی کا اس معاملے میں سامنے آنا اس طرف اشارہ کر رہا تھا کہ حکومت دشمن افراد کے سلسلے میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جا رہی تھی۔ خواہ ایسا کوئی فرد جس پر یہ شبہ ہو، کسی اعلیٰ سرکاری افسر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو! اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ لوگ مجھ پر تشدد نہ کرتے۔ کیتھی بھی کسی بڑے عہدے ہی پر فائز تھی۔ شاید اس نے اسی لیے میرے ڈیڈی کی پروا بھی نہیں کی یا پھر حسن علی نے کسی مصلحت کے پیش نظر یہاں والوں کے سامنے یہ بتایا ہی نہیں ہوگا کہ میں کون ہوں! ممکن ہے وہ اس معاملے میں میرے ڈیڈی کا نام ظاہر نہ کرنا چاہتا ہو اور اس نے اپنے محکمے والوں کو صرف یہ بتایا ہو کہ میرا تعلق حکومت دشمن عناصر سے معلوم ہوتا ہے وغیرہ۔

میری بات پر بخت خاں نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ کہنے لگا "ظاہر ہے حسن علی کی یہاں موجودگی کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا ہی! تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہو، وہ بتاؤ۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ دہلی میں چتلی قبر والے جس مکان پر چھاپا پڑا تھا، وہ مکان تم ہی نے کرائے پر حاصل کیا تھا۔"

"ہاں پھر؟" بخت خاں کی چوڑی پیشانی پر غور و فکر کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔

"مالک مکان کو تم نے اپنا نام بخت خاں ہی بتایا تھا نا؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔ مگر۔۔۔ شاہین! تم شاید صحیح نتیجے پر پہنچ رہے ہو۔ میں بھی ابھی یہی سوچ رہا تھا۔ جب تم نے اس آسیب زدہ مکان کے بارے میں سوال کیا تھا۔ یہ کہ وہاں سے ہمارے فرار کے بعد مالک مکان سے پوچھ گچھ کی گئی ہوگی اور اسی سے پولیس کو یہ نام معلوم ہو سکتا ہے۔ اس حد تک تو چلو بات سمجھ میں آ جاتی ہے مگر حسن علی کا تم سے یہ کہنا کہ تمہیں بخت خاں کی تلاش ہے یہ بات بہرحال چند ہی افراد کے علم میں تھی۔ ہم چاروں ساتھیوں کے سوا کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ لاہور پہنچ کر تمہیں مجھ سے کب اور کہاں ملنا ہے! میں نے تو اس سلسلے میں اتنی احتیاط برتی تھی کہ مقامی ساتھیوں سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں کو میں نے آج ہی اس وقت تمہارے بارے میں بتایا تھا جب داتا دربار سے لوٹا تھا اور سی آئی اے سینٹر پر حملہ کیا تھا۔"

"پھر تو بس ہم چاروں ساتھی ہی رہ جاتے ہیں۔" نیپو نے پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیا۔

"چار کیوں، چھے افراد کہو!" میں بولا "اس بات کا علم ان دونوں بہن بھائی کو بھی تھا مگر جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا چاہیے۔ میں یا بخت خاں کیا کسی کو یہ بات بتا سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اب رہ جاتے ہیں نیپو اور حیدر علی! جہاں تک نیپو کا سوال ہے بخت خاں، تو کیا ایسا کوئی شخص جو اپنے ساتھیوں کو فرار کا موقع فراہم کرنے کے لیے خود پھنسنا قبول کر لے، ایسے شخص کی وفاداری پر شبہ کیا جا سکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ہرگز نہیں۔ حیدر علی بھی جلالی کی مہم میں میرے ساتھ رہا ہے، پھر یہ کہ تم

نے بھی اتنے عرصے میں اس کے متعلق یہ اندازہ لگایا ہوگا کہ وہ بھی تنظیم کے ساتھ غداری ہی کی طرح ہوگا اور شکس ہے۔ وہ دونوں بہن بھائی، دہلی پہنچنے کے بعد لاہور تک میرے ساتھ رہے ہیں۔ انہیں مورد الزام ٹھہرانا یا کسی طرح ان پر شک کرنا بھی ظلم ہے۔ صرف ایک امکان ہو سکتا ہے کہ حسن علی نے اندھیرے میں تیر چلایا ہو۔ یہ تیر اتفاق سے صحیح نشانے پر بیٹھ گیا ہم اسی لیے الجھ رہے ہیں۔"

"ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔" بخت خان نے اظہار خیال کیا "ویسے تمہاری بات دل کو لگتی ضرور ہے۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ کسی بھی طرح تم حسن علی کی نظر میں آچکے تھے تو یہ الجھی ہوئی گتھی سلجھ جاتی ہے۔ اس بات کو یوں باآسانی سمجھا جاسکتا ہے ہم صرف مفروضوں پر بات آگے بڑھا رہے ہیں کہ کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے یہی ایک طریقہ ہے۔ بالفرض دہلی میں تم حسن علی کی نظر میں آگئے۔ اسی دوران میں چنگی قبروالے مکان کے مالک سے پوچھ گچھ ہوئی اور میرا نام سامنے آیا۔ حسن علی نے اس کے بعد دہلی سے لاہور تک تمہارا تعاقب کیا۔ تم اور تمہارے دونوں ساتھی جس ہوٹل میں ٹھہرے، ظاہر ہے کہ وہ ہوٹل بھی اس نے دیکھ لیا۔ مغرب سے کچھ پہلے تم داتا دربار تک پہنچنے کے لیے ہوٹل سے نکلے۔ تمہارا تعاقب بدستور جاری رہا پھر جب نماز پڑھ کر تم باہر صدر دروازے کے آس پاس دیر تک چکر لگاتے رہے تو اس سے حسن علی نے یہی نتیجہ نکالا کہ تمہیں میری تلاش بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے اسی لیے جب تم مایوس ہو کر واپس آرہے تھے تو ایک ایسی بات کہی کہ تم بوکھلا جاؤ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ تم بڑی آسانی سے اس کے ہتھے چڑھ گئے ورنہ مزاحمت بھی کرسکتے تھے۔"

"ہاں اس وقت واقعی میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔" میں نے دانستہ غلط بیانی کی اور اس غلط بیانی کا مقصد بھی اپنی اصل شخصیت چھپانا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں بدحواسی کی وجہ سے ان لوگوں کے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ اس کی اصل وجہ میری یہ غلط فہمی تھی کہ وہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

"اب صرف یہی ایک سوال رہ جاتا ہے کہ تم اس ملعون کی نظر میں کیسے آگئے؟" بخت خاں نے کہا۔

اور مجھے اس سوال کا جواب معلوم تھا اس "ملعون" کی نظر میں تو میں ایک عرصے سے تھا۔ مگر بخت خاں کو میں نے یہ جواب نہیں دیا اور لاعلمی ہی کا اظہار کیا۔

"ایک مرتبہ دہلی ہی میں حسن علی میرے ہاتھوں سے مارا جاتا۔" بخت خاں بتانے لگا۔ پھر اس نے ایک ایسی بات کہی کہ اگر بخت خاں کی جگہ کوئی اور ہوتا یا تنظیم سے متعلق نہ ہوتا تو میں اندر ہی اندر غصے میں بل کھا کر رہ جاتا۔ بخت خاں نے کہا تھا "حسن علی تو محض ایک کٹھ پتلی ہے میں اس کمینے اور ضمیر فروش ڈیسوزا کو جہنم رسید کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ جس کے اشارے پر حسن علی جیسی نہ جانے کتنی کٹھ پتلیاں ناچتی ہیں۔" پھر یہ کہہ کر بخت خاں نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولا "مجاہد اوّل نے ہمیں اس کی اجازت نہیں دی حالانکہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے بڑی مشکل سے سراغ لگایا تھا کہ انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر کون ہے! ہم لوگ خاصے عرصے سے یہ سراغ لگانے کی کوشش کررہے تھے۔ راز اس وقت کھلا تھا جب ڈیسوزا دہلی سے کلکتے گیا۔ اطلاعات کے مطابق وہاں اس نے حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف ثبوت پیش کیے تھے۔ مولانا پر کلکتے میں مقدمہ چلایا جارہا تھا۔"

خود میرے لیے بھی یہ انکشاف ہی تھا کہ ڈیڈی ڈائریکٹر انٹیلی جنس تھے۔ مجھے کچھ اندازہ تو تھا کہ ان کا تعلق حکومت کے کس محکمے سے ہو سکتا ہے لیکن یقینی طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس عہدے پر فائز ہیں۔ بخت خاں نے جو بطور ثبوت بیان کی تھی خود میں بھی اس کا گواہ تھا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ اچانک کس لیے کلکتے گئے ہوں گے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس وقت تو مجھے غصے کے ساتھ ساتھ اپنی بے بسی پر رونا بھی آرہا تھا۔ ایک شخص میرے ڈیڈی کو کمینہ اور ضمیر فروش کہہ رہا تھا اور میں سر جھکائے خاموشی سے سن رہا تھا۔ کبھی کبھی آدمی کتنا مجبور اور بے بس ہوجاتا ہے!

اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے میں نے موضوع بدلنے کی خاطر بخت خاں سے کہا "اب تک ان لوگوں کو آنا چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے کہ انہیں گئے ہوئے خاصی دیر ہوگئی ہے۔ سیتا اور جوگیندر کی طرف سے اب مجھے تشویش ہونے لگی ہے۔"

"ہاں انہیں اب تک تو آجانا چاہیے تھا۔" بخت خاں جواباً بولا "مگر کوئی تشویش کی بات نہیں۔ اگر وہاں کوئی گڑبڑ ہوتی تو اب تک اطلاع مل چکی ہوتی۔ ان لوگوں کے دیر سے آنے کی وجہ کچھ اور ہی لگتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ کسی سوچ میں پڑ گیا، پھر آپ ہی آپ بول اٹھا "اگر کچھ ہوا بھی ہے تو ہمارے ساتھیوں کے قابو سے باہر نہیں ہوا۔"

پھر بخت خاں نے جو کچھ کہا تھا کچھ دیر کے بعد وہی درست ثابت ہوئی۔ سیتا اور جوگیندر کو گرفتار تو نہیں کیا گیا تھا مگر وہ زیر نگرانی ضرور تھے۔ وہ سادہ لباس پولیس والے ہمارے ساتھیوں کی نظر میں آگئے تھے۔ انہی سے احتیاط کے ساتھ نمٹنے میں اتنی دیر ہوئی تھی۔ بخت خاں سے سیتا اور جوگیندر کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ میں نے ان کا آپس میں تعارف کرایا۔ غائبانہ وہ ایک دوسرے سے واقف ہی تھے۔ پھر یہ کہ اپنوں کو اپنے یوں بھی بہت جلد پہچان لیتے ہیں۔ میں نے ان کے تپاک میں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی محسوس کی اور مطمئن ہوگیا۔

سیتا اور جوگیندر کی آمد کے بعد اس مکان میں جمع کیا جانے والا اسلحہ مختلف ٹھکانوں پر پہنچانے کا بندوبست کیا گیا۔ لاہور میں تنظیم خاصی طاقت ور اور فعال معلوم ہوتی تھی۔ اب اس جگہ ہم چھ ساتھیوں کے علاوہ صرف دو مقامی کارکن رہ گئے تھے۔ بخت خاں پہلے بھی پنجاب آچکا تھا اس لیے لاہور، ملتان اور دیگر کئی شہروں کے مقامی کارکنوں سے اس کی شناسائی تھی۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے بخت خاں بھی وہیں کا رہنے والا ہو حالانکہ دہلی میں مجھے وہ دہلی والا ہی لگا تھا۔ وہ روانی سے پنجابی بول رہا تھا۔

اسی دوران میں مجھے بخت خاں سے اس مقامی ساتھی کے بارے میں بھی معلوم ہوچکا تھا جس کے گولی لگی تھی۔ اسے ایک محفوظ ٹھکانے پر منتقل کردیا گیا تھا۔ وہاں اسے طبی امداد دی گئی تھی۔ گولی اس کی ران میں لگی تھی جس سے ران کی ہڈی کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ اس کی حالت خطرے سے باہر تھی گولی نکال دی گئی تھی۔

میرا سامان بھی سیتا اور جوگیندر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ ہم تینوں کی سکونت کا انتظام ایک ہی کمرے میں کیا گیا تھا۔ بخت خاں، نیچو اور حیدر علی کا کمرا ہمارے برابر والا تھا۔ دو مقامی ساتھی صدر دروازے کے قریب ایک کمرے میں ڈیرا جمائے ہوئے تھے۔ ہم سب نے ساتھ کھانا کھایا اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد بخت خاں کے ایما پر ہال کمرے میں ہماری میٹنگ شروع ہوگئی۔ ہمیں اب آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ موجودہ غیر متوقع صورت حال میں یہ بہت ضروری تھا۔ سیتا، جوگیندر، نیچو اور خود میں لاہور پولیس کی نظر میں آچکے تھے۔ میں نے ہی اس طرف بخت خاں کی توجہ مبذول کرائی تھی۔

"ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم آج ہی رات لاہور سے نکل جائیں۔" بخت خاں نے بات شروع کی "صورت حال یہاں بھی ویسی ہی ہوگئی ہے جو دہلی سے ہماری روانگی کے وقت تھی۔"

"اور دوسری صورت؟" میں نے سوال کیا۔

"دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ ہم چند روز یہیں روپوش رہ کر گزار دیں۔" بخت خاں نے جواب دیا "دونوں ہی صورتوں میں مثبت اور منفی پہلو موجود ہیں۔ یہاں سے فوری طور پر نکل جانے کا فائدہ یہ ہے کہ ہم خطرے کی حدود سے دور ہوجائیں گے۔ خرابی اس میں یہ ہے کہ اس وقت پولیس نے لاہور کی ناکا بندی کروی ہوگی۔ پولیس کا خیال بس یہی ہوگا کہ ہم آج رات لاہور سے فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔ اگر ہم نے یہاں چند روز روپوش رہنے کا فیصلہ کرلیا تو اس سے ایک طرف تو ہمیں ملتان پہنچنے میں دیر ہوجائے گی، دوسری جانب ہم بہرحال خطرے ہی میں رہیں گے۔ مثبت پہلو اس میں یہ ہے کہ یہاں چند روز روپوشی کی صورت میں ہمیں فوری طور پر کسی خطرے سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔ ہماری روپوشی لاہور پولیس کو تذبذب میں مبتلا کردے گی۔ پولیس کوئی فیصلہ نہیں کرسکے گی کہ ہم فرار ہوچکے ہیں یا لاہور ہی میں موجود ہیں۔" اپنی بات پوری کرکے بخت خاں نے مجھے مشورہ طلب نظروں سے دیکھا۔

"ایک درمیانی راہ بھی ہو سکتی ہے۔" میں کچھ سوچتے ہوئے بولا "مجاہد اوّل نے ہمیں دہلی سے ملتان روانگی کے لیے ایک ہفتہ دیا تھا مگر مصلحت وقت کے پیش نظر ہم وہاں سے جلدی چل دیے۔ ایسی صورت میں ہم اگر مزید دو ایک روز لاہور میں رُک جاتے ہیں تو اس سے ملتان پہنچنے میں دیر نہیں ہوگی۔ چند روز یہاں رُکنے کی بجائے کل ہی یا پھر زیادہ سے زیادہ پرسوں ہم لاہور سے چل دیں۔ اس سے ہمارے دونوں ہی مقصد حل ہوجائیں گے۔ فوری طور پر ہم ایک متوقع خطرے سے بھی بچ جائیں گے اور ہمیں ملتان پہنچنے میں زیادہ دیر بھی نہیں ہوگی۔"

میری تجویز سے سبھی ساتھیوں نے اتفاق کیا۔ مہم کا نگراں ہونے کی حیثیت سے فیصلہ بخت خاں ہی کو کرنا تھا۔ وہ بھی مجھ سے متفق تھا۔

"مگر ہم یہاں سے براہ راست ملتان نہیں جائیں گے۔" بخت خاں نے کہا "ہم ایک روز لائلپور (فیصل آباد) میں ٹھہر کر یہ جائزہ لیں گے کہ کہیں ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جارہا! اس کے بعد ہم ملتان کا رُخ کریں گے۔ ہم کل ہی کسی وقت لاہور سے چل دیں گے۔"

○☆○

شیر شاہ سوری کی بنوائی ہوئی مسجد کے سامنے سے

گزرتے ہوئے ہم سب شاہ یوسف گردیزؒ کے مزارِ مبارک کی طرف بڑھ رہے تھے کہ راستے میں ہم نے درس کا ایک "حلقہ" دیکھا اور ہمارے قدم جیسے خود بہ خود رُک گئے۔ حلقے کے درمیان میں نورانی صورت والے ایک بزرگ بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اپنے مریدوں سے مخاطب تھے۔ وہ کہہ رہے تھے "جو اپنے دل میں خدا کے سوا کسی کا خیال نہ آنے دے اور جو اپنے دل کو آلائشِ دنیا سے پاک و صاف رکھے اسے صوفی کہتے ہیں۔ اسی کی جمع صوفیاء ہے اور یہ عربی لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی پشم پوش یعنی بالوں کا کپڑا پہننے والے کے ہیں اس لیے "صوف" بال کو کہتے ہیں۔ صوفی ہی کے ایک معنی مخلص کے بھی ہیں۔ سو دین میں اخلاص بنیادی شرط ہے۔"

"بہلو شاہ صاحبؒ" کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر واپس چلیں، شام ہو رہی ہے اور احمد حسین ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔" بخت خاں نے ہمیں مخاطب کیا۔ ہم سب شاہ یوسف گردیزؒ کے مزار کی طرف بڑھنے لگے جو اس شہر کا سب سے قدیم مزار تھا۔

"یہاں کتنا سکون، کتنی راحت ہے شاہین!" سیتا جو میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی آہستہ سے بولی۔

میں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا "یہ اپنے اپنے احساس کی بات ہے۔ کچھ لوگوں کو یہاں صرف ویران مقابر نظر آتے ہیں، مگر صرف انہیں کہ جن کے اندر کی آنکھ بند ہوتی ہے۔ یہاں صدیوں کی تاریخ دفن ہے اور یہ زندہ تاریخ صرف انہی سے کلام کرتی ہے جو اس کے اہل ہوں۔"

ہم لائل پور (فیصل آباد) میں ایک دن گزار کر مدینۃ الاولیاء ملتان پہنچ چکے تھے۔ ہمارا تعاقب نہیں کیا گیا تھا۔ ہم بہ آسانی لاہور سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ملتان میں ہم تحریکِ خلافت کے ایک سرگرم کارکن احمد حسین کے یہاں ٹھہرے تھے۔ تحریکِ خلافت کا رکن ہونے کے ساتھ ساتھ احمد حسین ہماری خفیہ تنظیم کا رکن بھی تھا۔ احمد حسین کی شخصیت اسی لیے پردۂ راز میں نہیں رہ سکی تھی کہ وہ ملتان کی نمایاں شخصیات میں سے تھا۔ ہاں یہ بات ضرور راز میں تھی کہ دراصل وہ ملتان میں تاجرِ اوّل کے احکام کا پابند تھا اور اس کی تمام تر دلچسپیاں وطن پرست خفیہ تنظیم سے تھیں۔ میرے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ تنظیم کے کسی رکن کی اصل شخصیت مجھ پر ظاہر ہوئی تھی۔ ملتان آئے ہوئے ہمیں یہ پہلا ہی دن تھا۔ سیتا اور جوگیندر کے ایما پر بخت خاں ہم سب ساتھیوں کو بزرگانِ دین کی زیارت گاہوں کی طرف لے کر چلا تھا۔ بزرگانِ دین کے مزارات سے ان دونوں کی یہ محبت اور دلچسپی کم از کم میرے لیے تو حیران کن نہیں تھی البتہ بخت خاں اور دوسرے ساتھیوں کو اس پر حیرت ضرور تھی۔ خود میں بھی ان مزارات کی زیارت کے مشتاق تھے اور مجھے بھی یہاں آنے کا اشتیاق تھا۔ بخت خاں اسی لیے راضی ہو گیا تھا۔ یوں بھی ہمیں ملتان میں سرگرمِ عمل ہونا تھا اور اس شہر سے آگہی ہمارے لیے ضروری تھی۔ بخت خاں ہر وقت تو ہماری رہنمائی کے لیے ساتھ نہ تھا۔

یہ شہر ملتان، سندھ اور پنجاب کا تہذیبی سنگم تھا۔ اس میں اور اس کے گرد و نواح میں متعدد صوفیائے کرام کے مقابر اور مزارات تھے۔ اردو زبان کی لسانی تشکیل میں بھی اس شہر کا اہم حصہ تھا۔ تہذیبِ انسانی کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک شہر یہ بھی تھا جہاں ہم آئے تھے۔ بیرونی حملہ آوروں کے سبب دہلی کی طرح یہ شہر بھی بسا اور اُجڑا۔ راوی، چناب اور جہلم کی مواج لہروں میں گھرا ہوا یہ زرخیز علاقہ بعد میں ملتان شہر اور اس کا گرد و نواح کہلایا۔

سکندرِ اعظم سے تقریباً ہزار بارہ سو سال قبل اس زرخیز علاقے کا نام "مولی استھان" تھا اور یہی "ملی استھان" بھی کہلاتا تھا۔ اس سے بھی پہلے یہ "ویل استھان" تھا اور پھر "مساویل استھا" کہلاتا تھا۔ یہ دونوں نام ہندو مت کی قدیم مذہبی کتاب "رگ وید" کے پہلے حصے میں ملتے ہیں۔ گیت بھجن ایک سو چھتیسواں ہے۔ جس میں یہ نام آئے ہیں "رگ وید" میں اس شہر کے آس پاس کے علاقوں کا ذکر ہے۔ میں نے "رگ وید" ہی میں سندھ ندی (دریائے سندھ) کا ذکر بھی پڑھا تھا۔ دریائے سندھ کی تعریف "رگ وید" کے ایک گیت میں یوں کی گئی ہے "چمکنے والی، درخشاں، عالی شان، تندی ہونے والی ہے۔ سب ندیوں سے زیادہ اس میں پانی ہے۔ خوب صورت ابلق گھوڑے کی طرح حسین ہے۔"

عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے علم نے دنیا کے کسی علاقے کی تاریخ سے ناآشنا نہ رہنے دیا۔ ملتان کے متعلق بھی یہاں آنے سے پہلے مجھے بہت کچھ معلوم تھا جو مختصراً میں بیان کر رہا ہوں۔ سکندرِ اعظم کے بعد اس علاقے کو ملطیہ کہا جانے لگا اور پھر ملتان۔"

"ملتان" عربی لفظ ہے اور اس کے معنی "دو نیزوں کے برابر" ہیں۔ اس علاقے کو یہ نام محمد بن قاسم نے دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ایک حوض میں محمد بن قاسم کو ایک پوشیدہ خزانہ ملا تھا۔ یہ حوض دو نیزوں کے برابر لمبا، اسی قدر

چوڑا اور اتنا ہی گہرا تھا۔ پھر یہی "ملتان" بعد میں ملتان ہو گیا۔

سندھ اور ملتان کے قدیم باشندے محمد بن قاسم کے حملے سے قبل ہندو مت کے پیروکار تھے۔ اسلام یہاں بھی صوفیائے کرام کے قدموں کی برکت سے پھیلا۔ ان میں بابا فرید گنج شکرؒ، شیخ رکن عالمؒ، شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ اور ان کے صاحب زادے صدر الدین عارفؒ بھی شامل ہیں۔

خواجہ غلام فریدؒ کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ یہ صوفی تھے اور شاعر بھی! انہوں نے سرائیکی کے علاوہ اردو زبان میں بھی شاعری کی ہے۔ یہ چشتیہ سلسلے سے تھے اس لیے "سماع" ان کے نزدیک جائز تھا۔ اس علاقے کی قدیم روایات اور محل و وقوع کے سبب سماع یعنی قوالی نے "دھمال" کی شکل اختیار کر لی۔

میں نے اس روز موسیٰ پاک شہیدؒ کے مزارِ مبارک پر بھی فاتحہ پڑھی۔ مزار کے برابر اندرون پاک دروازہ مسجد نوحیہ تھی۔

شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ ملتانی کا مقبرہ مجھے فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ معلوم ہوا۔ میں نے اس مقبرے کے بارے میں پڑھا تھا کہ شیخؒ نے اپنی زندگی ہی میں یہ مقبرہ خود بنوایا تھا۔ بعد میں یہیں ان کی تدفین ہوئی۔ یہ نقش بندی سلسلے سے تھے۔ تصوف کا یہ سلسلہ "سماع" کا قائل نہیں۔ شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ شاعر بھی تھے۔ ان کا فارسی دیوان میں نے پڑھا تھا۔ شیخ کے صاحب زادے صدر الدین عارفؒ کا مزار اپنے والد محترم کے پہلو میں ہے۔ یہ "سماع" کے قائل تھے۔

یہ شہر کیوں کہ صوفیائے کرامؒ مبلغین اور شعراء کا شہر تھا۔ یہاں بزرگانِ دین آتے رہے اسی لیے یہ ہمیشہ علمی و ادبی مرکز بنا رہا۔ انہی بزرگانِ دین کے طفیل وہ فنون بھی یہاں متعارف ہوئے جنہوں نے یہاں کی معاشرت پر گہرا اثر چھوڑا۔ انہی بزرگوں نے فنِ تعمیر، کاشی گری، نقاشی، خطاطی، کوزہ گری، قالین بافی جیسے مفید فنون بھی یہاں کے باشندوں کو سکھائے۔ اس کے علاوہ شہ سواری، پہلوانی، نیزہ بازی اور شمشیر زنی کی عملی تعلیم بھی دی۔

میں نے یہاں کے باشندوں کو راست باز، صاف دل، صلح پسند، محنتی، ذہین اور اپنے عقائد میں پختہ پایا۔ ان کا فطری مزاج یہی تھا، مگر انگریز نے اپنی شاطرانہ و عیارانہ چالوں سے سارے ہندوستان کی طرح یہاں بھی نفرت کے بیج بونا شروع کر دیے تھے۔

اسی شہر کے تعلق سے ایک اور دلچسپ ذکر "بیرونِ حرم" اور "اندرونِ حرم" کا ہے۔ میں نے ایسی تخصیص کسی اور شہر میں نہیں پائی۔ "بیرونِ حرم" شہر کا وہ حصہ کہلاتا تھا جہاں شہر کی آبادی میں طوائفوں کی سکونت ممنوع تھی۔ حرم دراصل عربی لفظ ہے اور اس احاطے کو کہا جاتا ہے جو خانہ کعبہ کے گرداگرد ہے۔ جب یہ لفظ سفر کرتا ہوا فارس یعنی ایران پہنچا تو اس کے معنی بدل گئے (حرمت کی رعایت سے) فارسی زبان میں "حرم" مکان کے اندر رہنے والی اس منکوحہ عورت، کنیز، باندی یا لونڈی کو کہتے ہیں جو اپنے شوہر یا آقا کی خدمت گزار ہو اور اس کے صرف میں آ چکی ہو۔ ایران ہی کے زیرِ اثر عربوں نے بھی حرم بنائے۔ یہی لفظ ایران سے ہندوستان پہنچا تو تاریخی تناظر، تغیرِ وقت اور جغرافیائی اسباب کی بنا پر اس کے معنی مزید بدل گئے (کنیزوں، باندیوں اور لونڈیوں کی رعایت سے) ہندوستان میں طوائفوں، داشتاؤں وغیرہ کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا یعنی ان کے رہنے کی جگہ! انہی وجوہ کی بنا پر طوائفوں کے علاقے کو ملتان میں "اندرونِ حرم" کا نام دیا گیا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک محترم لفظ تاریخ کے سفر میں کیا سے کیا بن گیا۔ بخت خاں نے اس روز ہمیں تقریباً سارا شہر ہی گھما دیا تاکہ آئندہ ہمیں اس کی زیادہ شناسائی نہ رہے۔ مغرب کے وقت ہم واپس احمد حسین کے گھر پہنچے۔

ملتان سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ ہر طرف ہریالی تھی، گہری ہریالی جس سے آنکھوں میں ٹھنڈک سی اُترتی محسوس ہوتی تھی اور ذہن میں طمانیت کا احساس بیدار ہو جاتا تھا۔ فضا میں ہر وقت بھینی بھینی اور میٹھی میٹھی مہک گھلی رہتی۔ سخت گرمی کے باوجود خوش نما اور رنگ برنگے پرندوں کی چہکار، سائے کی فرحت لگتی۔ ملتان کے بارے میں، میں نے "گرد، گرما، گدا و گورستان" والا مشہور مصرع سنا تھا کہ ملتان کے یہی چار تحفے ہیں لیکن اسی کے ساتھ مجھے امیر خسروؒ کا ایک شعر بھی یاد تھا جس میں انہوں نے ملتان کو جنتِ نظیر کہا تھا۔ امیر خسروؒ بھی اس شہرِ قدیم میں آ کر رہ چکے تھے۔

یہاں کی زمین سونا اگلتی تھی، مگر غریب کاشتکاروں کے لیے ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں میں صرف بھوک اگتی تھی۔ دھرتی کا سینہ چیر کر اس سے فصلیں حاصل کرنے والے صرف افلاس و غربت کے کھلیان جمع کرتے تھے۔ ان کے لیے دق، سل اور دمے کی بیماریوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سود در سود کی لعنتیں اس زرخیز علاقے کے کسانوں کے لیے انگریز کا سب سے بڑا تحفہ تھیں جو ۱۸۵۵ء کے ایکٹ نمبر اٹھائیس کی عطا تھیں۔

سود در سود کی یہ لعنت مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ختم کر دی گئی تھی مگر انگریز حکمرانوں نے اسے دوبارہ رائج کر دیا تھا۔ انگریز نے ہندو ساہوکاروں کو خوش کرنے اور مسلمانوں کو اقتصادی طور پر کمزور کرنے کے لیے' خاص طور پر مسلمان زمینداروں کی بیخ کنی کی خاطر سود در سود کی لعنت کو قانونی تحفظ فراہم کیا تھا۔ اسی سبب اس قانون کے بعد یہ صورت ہو گئی کہ چند سو روپوں کے عوض ہندو مہاجن' بنیے اور ساہوکار لاکھوں روپے کی ڈگریاں عدالت سے کرانے لگے۔ علی گڑھ کے ایک رئیس پر چند سو روپے کے عوض کئی لاکھ کی ڈگری ہوئی اور اس کی تمام جائیداد نیلام ہو گئی۔ کلکتہ ہائی کورٹ سے ایک ہندو مہاجن نے تین سو پچاس روپے کے قرضے کے عوض سوا سات لاکھ روپے کی ڈگری کرائی۔ الہ آباد ہائی کورٹ نے چار سو روپے کے قرضے پر ایک مہاجن کے حق میں سترہ لاکھ روپے کی ڈگری جاری کی۔ یہ اسی طرح کی بات تھی جیسے زبردست مارے اور رونے نہ دے! یہی صورت حال ملتان میں بھی تھی۔ یہاں بھی ہندو ساہوکاروں نے سود در سود کا چکر چلا کر مسلمانوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ وہ اپنی ہی زمین پر مزدوروں کی طرح کام کرتے اور غلاموں کی طرح مہاجنوں اور ساہوکاروں کو خراج دیتے۔ انگریزوں نے ان بنیوں' ساہوکاروں اور مہاجنوں کو ایک قانون بنا کر وحشیانہ لوٹ کھسوٹ کی اجازت دے دی تھی۔

یہی وہ اسباب تھے کہ قدرت کے تراشیدہ اس خطہ بے مثل کو چند خون خوار انسانوں نے بشریت کے لیے جہنم بنا دیا تھا۔ جب ہم ملتان پہنچے تو یہ شہر نفرت اور کشیدگی کی گرفت میں تھا۔ ہمارے ساتھی احمد حسین نے اس رات ہمیں بتایا کہ ملتان کے حالات جان بوجھ کر بے حد خراب کر دیے گئے تھے۔ ہندو زمیندار اور انگریز انتظامیہ دانستہ حالات خراب کر کے ہندو مسلم تصادم کی راہ ہموار کر رہی تھی۔

"مجھے امید نہیں کہ آپ کچھ کر سکیں گے۔" احمد حسین نے بخت خاں کو مخاطب کیا "آپ لوگ بہت دیر میں یہاں پہنچے۔ کسی وقت بھی لاوا پھوٹ سکتا ہے' کسی بھی وقت آگ بھڑک سکتی ہے' ایسی آگ جو سب کچھ جلا ڈالے!"

"یہاں کے مقامی رہنما' میرا مطلب ہے کہ تحریک خلافت اور کانگریس کے مقامی رہنما کیوں خاموش ہیں؟ کیا وہ آنے والے طوفان کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں؟ انہیں احساس نہیں کہ کیا ہونے والا ہے!" جوگیندر نے سوال کیا۔

"بات یہ ہے کہ یہاں معاملات نے بالکل ہی مختلف رنگ اختیار کر لیا ہے۔" احمد حسین نے جواب دیا "بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ان معاملات کو دانستہ مختلف رنگ دے دیا گیا ہے۔ سارا معاملہ ایک ہندو ساہوکار اور اس کے چار مقروض کاشتکاروں کے درمیان تنازعے سے شروع ہوا۔ ایسے تنازعے عام ہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی جھگڑا اس نوعیت کا اٹھتا ہی رہتا ہے۔ بدقسمتی یہ کہ وہ ہندو ساہوکار کانگریس کا اور چاروں کاشتکار تحریک خلافت سے وابستہ ہیں۔ وہ چاروں ہی تحریک خلافت کے سرگرم و پُرجوش کارکن ہیں۔ جب یہ جھگڑا شروع ہوا تو تحریک خلافت کے مقامی رہنماؤں نے اس ساہوکار سے مل کر اسے سمجھانا چاہا کہ یہ جھگڑا نہ اٹھائے۔ تحریک خلافت کے رہنماؤں نے اپنے طور پر یہ بات کی تھی۔ ان غریب کاشتکاروں نے اس سلسلے میں تحریک کو بیچ میں لانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی مگر۔" احمد حسین خاموش ہو گیا۔

"مگر کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"مگر۔" احمد حسین نے جوگیندر کی طرف دیکھا' پھر معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "مگر معاف کیجیے گا جوگیندر بابو' یہاں معاملے کو دوسرا رنگ دے دیا گیا۔ اس ساہوکار نے پہلے دن تو وعدہ کر لیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا اور انگریز انتظامیہ کو اس معاملے میں مداخلت نہیں کرنے دے گا لیکن اگلے ہی روز ان چاروں کو گرفتار کرا دیا۔ خلافت کے لیڈروں نے پھر اس سے بات کی تو اس نے انہیں دھتکار دیا۔ پھر یہ لیڈر دوسرے کانگریسی ہندو لیڈروں کے پاس گئے مگر وہ بھی سب کے سب ساہوکار ہی ہیں۔ وہ اس معاملے میں کوئی تعاون کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے اسے ہندو مسلم تفرقے کا رنگ دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ تحریک خلافت سے کانگریس کے تعاون کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کانگریسی ہندو' مسلمانوں کے حق میں اپنے قانونی حقوق سے بھی دستبردار ہو جائیں۔"

"یہ طبقاتی تحفظ کا معاملہ ہے میرے دوست!" جوگیندر نے کہا "مسلمان کاشتکاروں کی جگہ اگر ہندو کاشتکار بھی ہوتے تو بھی ان ساہوکاروں کا یہی رویہ ہوتا۔ ساہوکار کی نہ کوئی سیاسی جماعت ہوتی ہے' نہ کوئی دین دھرم! ساہوکار بس ساہوکار ہوتا ہے۔ یہ دنیا بنیادی طور پر صرف دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ظالم اور مظلوم کے طبقوں میں!"

"اور اب کیا صورت حال ہے؟" بخت خاں نے دریافت کیا۔

"اب بدقسمتی یہ ہے کہ وہ چاروں کاشتکار تو رہا ہو گئے۔" احمد حسین بتانے لگا "ان چاروں کی رہائی کے بعد ایک ہندو زمیندار کے یہاں ڈاکا پڑا۔ زمینداروں اور ساہوکاروں نے اس پر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ ڈاکا مسلمانوں نے جوابی کارروائی کے طور پر مارا ہے۔ اب ان دنوں یہ زمیندار اور مہاجن افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ مسلمان بہت بڑے پیمانے پر اسلحہ جمع کر رہے ہیں۔ میں بہرحال پوری دیانت سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ افواہیں قطعی غلط ہیں البتہ یہ افواہیں پھیلا کر وہ خود اسلحہ جمع کر رہے ہیں۔"

اس کے بعد یہ طے ہوا کہ میں' بخت خاں' جوگیندر اور سیتا ایک وفد کی شکل میں کانگریس کے مقامی لیڈروں سے ملیں گے۔

آئندہ روز ہم نے اسی پر عمل کیا۔ انہیں وقت کی نزاکت کا احساس دلایا' قومی اتحاد کی اہمیت سمجھائی اور پھر انہیں سمجھایا کہ وہ ملتان میں بھائی چارہ قائم کرنے کی خاطر اس شہر کو کشت و خون سے بچانے کے لیے مسلمانوں سے راضی نامہ کر لیں۔ یہ مہم اپنی نوعیت کے اعتبار سے جلالی مہم سے قدرے مختلف تھی۔ اس میں طاقت کے استعمال کی بجائے ذہنی صلاحیتوں کی آزمائش تھی۔ کانگریسی لیڈروں نے ہمیں جواب دیا کہ اگر مسلمان اس پر تیار ہو جائیں تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

وہاں سے ہم خوشی خوشی مسلمان لیڈروں کے پاس آ گئے۔ ان سب کو احمد حسین نے پہلے ہی تحریک خلافت کے دفتر میں جمع کر لیا تھا۔ ان میں ملتان کے قریبی دیہی آبادیوں کے زمیندار اور بااثر افراد کے علاوہ شہر کے معزز افراد بھی تھے۔ ہم نے ان سبھی کو ہندو کانگریسی لیڈروں سے اپنی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ اس پر انہوں نے بھی بہت مسرت کا اظہار کیا۔ طے یہ ہوا کہ اسی روز بعد مغرب دونوں طرف کے سرکردہ لیڈر مل بیٹھیں گے پھر مکمل صلح' ہم آہنگی اور بھائی چارے کا اعلان کر دیں گے۔ اس ملاقات کے لیے انہوں نے مقام کا تعین ہندو رہنماؤں پر چھوڑ دیا۔

ہم ان کی رضامندی کے بعد جب ہندو لیڈروں کے پاس پہنچے تو وہاں ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ ہم نے اپنی دانست میں انہیں اتحاد کی خوش خبری سنائی تو انہوں نے کہا۔ تم لوگ خلافتیوں کے ایجنٹ ہو۔ ان کے لہجے میں رکھائی تھی "تم ہمیں بے وقوف بنانے آئے ہو۔" ایک لیڈر بولا "بس سیدھے یہاں سے چلے جاؤ! ہم جانتے ہیں کہ تم لوگ آس پاس کے مسلمان باغی زمینداروں کے لیے ہتھیار لے کر

آئے ہو۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چاچا جی!" سیتا نے اس بوڑھے ہندو ساہوکار سے کہا۔ جس نے ہندو ساہوکاروں کی نمائندگی کرتے ہوئے ہم پر اسلحہ لانے کا الزام لگایا تھا۔ اس کا نام رام مورتی تھا۔

"تم نہ بولو سیتا!" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا "رام مورتی جی! آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے' بہکایا ہے!"

"بس میں نے کہہ دیا کہ چلے جاؤ! ہم سب جانتے ہیں' سب کچھ معلوم ہے ہمیں! تم لوگوں نے ہندوؤں کے خون سے ہولی کھیلنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ہم تمہاری چال اچھی طرح سمجھ گئے ہیں! تم لوگ ہم کو دھوکا نہیں دے سکتے!" رام مورتی آپ ہی آپ غصے سے بل کھا رہا تھا۔

پھر میں نے' بخت خاں اور جوگیندر نے انہیں بہت سمجھایا مگر ان لوگوں کو نہ معلوم کس نے پٹی پڑھائی تھی کہ وہ ہماری کوئی بات سننے کے روادار ہی نہ تھے۔ وہ سب یہی رٹ لگائے ہوئے تھے کہ ہم مسلمانوں کے لیے ہتھیار لے کر آئے ہیں۔

اس پر جوگیندر جھلا کر بولا "تم سب انگریزوں کے پٹھو ہو! تم بلاوجہ افواہیں پھیلا کر یہاں والوں کو آگ اور خون میں نہلانا چاہتے ہو' لوگوں کے گھروں اور ان کی املاک کو نذرِ آتش کر کے نفرت کا الاؤ بھڑکانا چاہتے ہو!"

جوگیندر کی بات پر وہاں موجود ساہوکاروں نے اور بھی سخت رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے ہم پر الزام لگایا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں' ہندو مسلم اتحاد کی بجائے صرف ہندوؤں کو نقصان پہنچانے کے لیے کر رہے ہیں۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر وہ جھک گئے یا انہوں نے ذرا سی بھی کمزوری کا مظاہرہ کیا تو ان کے مزارع شیر ہو جائیں گے اور انہوں نے جو رقوم قرض دی ہیں' ڈوب جائیں گی۔

"ہم کانگریس کی خاطر اپنے قانونی حق سے دستبردار نہیں ہوں گے!" رام مورتی فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"یہ کون کہتا ہے!" بخت خاں نے کہا "ہماری تو آپ سے اتنی گزارش ہے کہ برسوں بعد جو ہندو مسلم اتحاد قائم ہوا ہے اسے قائم رکھیں۔"

"اور پھر یہ مسلمان اپنے افغان مسلمان بھائیوں کی مدد سے اس ملک پر قبضہ کر لیں' کیوں!" رام مورتی نے زہر اگلا۔ پھر اس نے ریشمی رومال تحریک کا ذکر کیا۔ اس تحریک میں ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا اور اس کی ناکامی کو

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ یہ ۱۹۱۹ء کی بات تھی یعنی صرف چھے سال پہلے کی بات! ۱۹۱۳ء میں ریشمی رومال تحریک شیخ الہند کی قیادت میں ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے شروع ہوئی اور یہ خفیہ تحریک ملتان ہی کے نواب کی غداری کے سبب دو سال بعد ہی ۱۹۱۵ء میں ناکام ہوگئی۔ ملتان کے اس نواب نے نہایت عیاری کے ساتھ ریشمی رومال تحریک کا بھانڈا پھوڑ کر انگریز کی نمک حلالی کا ثبوت دیا تھا۔ اس خفیہ تحریک کی ناکامی سے مسلمانوں کو بہت نقصان اُٹھانا پڑا تھا اور جس طرح گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی پسنا پڑتا ہے' کچھ ہندوؤں کو بھی سزائیں بھگتنا پڑی تھیں۔ جہاں پورے ہندوستان میں پکڑ دھکڑ اور سزاؤں کا بازار گرم ہوگیا تھا۔ وہاں پنجاب اور سندھ بھی اس کی لپیٹ میں آنے سے نہیں بچے تھے۔ سندھ ان دنوں الگ صوبہ نہیں تھا بلکہ صوبہ بمبئی میں شامل تھا۔ بہت بعد میں سر عبداللہ ہارون کی کوششوں سے ۱۹۳۶ء میں یہ الگ صوبہ بنایا گیا تھا۔ سندھ کے جید رہنما مولانا عبید اللہ سندھی جو شیخ الہند کے شاگرد تھے۔ ریشمی رومال تحریک کے دوران میں مدرسہ پیر جھنڈو کے مہتمم تھے۔

یہ ۱۹۱۵ء کی بات ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی ہی کو آزادی کی اس تحریک کے سلسلے میں انگریزوں کے خلاف محاذ قائم کرنے کی خاطر کابل بھیجا گیا تھا۔ رام مورتی وہی حوالہ دے رہا تھا۔ ہندو لیڈر آچاریہ کرپلانی کے نو مسلم بھائی شیخ عبدالرحیم کا تعلق حیدر آباد سے تھا' وہ بھی مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ افغانستان گئے تھے۔ اس تحریک کے سلسلے میں اندرون ملک جو بغاوت کے مراکز قائم کیے گئے تھے۔ ان میں سے دو سندھ میں تھے۔ سندھ اور بلوچستان کے لیے امروٹ ضلع سکھر میں مرکز تھا جس کے امیر مولانا تاج محمود امروٹی تھے۔ کراچی' السبیلہ اور قلات کا مرکز کراچی میں تھا۔ جس کے امیر کھڈہ کراچی کے مولانا محمد صادق تھے۔ اسی تحریک کی ناکامی کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی کو جلاوطن کردیا گیا تھا اور اب بھی وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جید عالم اور تحریک آزادی کے روح رواں مولانا تاج محمود امروٹی ابھی حیات تھے۔ اب وہ خلافت تحریک سے وابستہ تھے۔ اس بزرگ رہنما کی عمر ۸۷ سال تھی۔ جب ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت شروع ہوئی تو اس ضعیف العمر رہنما نے کلکتہ' بمبئی اور علی گڑھ تک سفر تحریک کی خاطر کیا۔ مولانا تاج محمود امروٹی اور مولانا ظفر علی خاں جیسے رہنما ہی سندھ اور پنجاب کی آبرو تھے اور رام مورتی اپنا ہی راگ الاپے جارہا تھا۔

رام مورتی اب بڑی نفرت و حقارت کے ساتھ کہہ رہا تھا "تم مسلے بڑے دغاباز ہو' بغل میں چھری رکھ کر منہ سے رام رام جپتے ہو۔"

ہم اس وقت ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ ہم مشرق اور مغرب کے فاصلوں پر تھے۔ تنگ آکر جوگیندر نے کہا "سنو رام مورتی! میں ہندو ہوں۔ میں نے ایک ہندو گھرانے میں جنم لیا ہے۔ میرا خاندان برہمن ہے۔ یہ میری بہن ہے سیتا! میں اس کی سوگند (قسم) کھاتا ہوں' اگر یہاں ملتان میں ایک بھی انسان کا خون بہا' خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یا کوئی اور۔ اگر تمہاری اور انگریز کی ملی بھگت سے انسانی لہو کی ایک بوند بھی زمین پر گری تو میں۔ میں اپنے ہاتھوں سے تیری تکا بوٹی کردوں گا! یاد رکھنا رام مورتی ایک برہمن زادے نے اپنی بہن کی سوگند کھائی ہے۔" جوگیندر کا لہجہ اس وقت بڑا خوف ناک اور سرد تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ رام مورتی کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا "سُنا تم لوگوں نے!۔ سُنا تم نے!" رام مورتی نے وہاں موجود اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہا "یاد رکھنا اس نے کیا کہا ہے گواہ رہنا کہ اس نے کیا کہا ہے۔"

"ابے ان سے کیا کہہ رہا ہے!" جوگیندر واقعی بے حد برہم ہوگیا تھا "کہے تو لکھ کر دے دوں رام مورتی' ملیچھ (ناپاک) ذلیل!" وہ غصے سے کانپ رہا تھا "پھر سُن لے کہ اگر اس شہر کی زمین پر انسانی خون کی ایک بوند بھی گری تو تو زندہ نہیں رہے گا!" ہم سب نہایت شکستہ دل' افسردہ و ملول اور تھکے تھکے وہاں سے لوٹے۔ ہم پر شکست کا احساس غالب تھا۔ ہم نے خلافت کے لیڈروں اور مسلمان زمینداروں کو اپنی ناکامی سے آگاہ کیا اور احمد حسین کے گھر آگئے۔

اُمید کی وہ کرن جو کانگریسی لیڈروں سے پہلی ملاقات میں پیدا ہوئی تھی' قتل ہوچکی تھی۔ اس کا تازہ تازہ خون شفق بن کر آسمان پر پھیل گیا تھا۔ سورج غروب ہورہا تھا اور تاریکیاں پھیلتی' بڑھتی جارہی تھیں۔ ذرا ہی دیر کے بعد قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی "اللہ اکبر!۔ اللہ اکبر!"

"بے شک اللہ بڑا ہے۔" میں بڑبڑایا اور پھر ہم سبھی وضو کرنے کے لیے اُٹھ گئے۔ ہمارے ہی ساتھ سیتا بھی تھی جو مسلمان ہوچکی تھی۔ جوگیندر البتہ ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔

اس روز پہلی بار ساتھیوں پر یہ انکشاف ہوا کہ سیتا مسلمان ہوچکی ہے اور اس کا نام کنیز فاطمہ ہے۔ اس کا اسلام قبول کرلینا ہندوؤں سے چھپانا مصلحت ہوسکتی تھی

لیکن اپنوں سے اسے راز میں رکھنا ضروری نہیں تھا۔ ہم سبھی ایک دوسرے کے رازدار اور محبتوں کے امین تھے۔ نیمو' حیدر علی' میں سیتا اور بخت خان ہم سب ایک ساتھ کھڑے تھے اور احمد حسین نماز پڑھا رہا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد دل کو سکون سا محسوس ہوا۔ دل پر مایوسی کی جو تاریکی تھی' چھٹ گئی۔ ابلیس کا مادہ ابلاس ہے جس کے معنی انتہائی تاریکی ہیں۔ پروردگار نے اسی لیے عزازیل کو ابلیس کہا کہ وہ دلوں کو تاریک کردیتا ہے۔ دلوں کو مایوسیوں سے بھر دیتا ہے۔ ابلیس اندھیرے اور مایوسی کی علامت ہے۔ وہی دلوں میں وسوسے ڈال کر آدمی کو خدا کی رحمت سے مایوس کرتا ہے اور پھر کفر کے اندھیروں میں گھسیٹ لیتا ہے۔ نماز خدا کی رحمت پر یقین ہے۔ سو یقین کی یہی طاقت روشنی بن کر اندھیرے کو نگل جاتی ہے۔ نماز سے ابلیس دور بھاگتا ہے' یہ اسی لیے تو کہا گیا ہے۔ خدا نے جو مقسوم کردیا تھا اسے تو کون ٹالتا' مگر یہ ضرور ہوا کہ اس وقت یقیناً بددلی اور مایوسی ختم ہوگئی اور یہ نماز ہی کی برکت تھی۔ ہم اس شکست سے اگر بددل ہوجاتے تو پھر گویا ہم اپنے مقصد سے مخلص نہیں تھے' ہم نے اپنی تنظیم کی روح کو نہیں سمجھا تھا۔ ہم مایوسیوں' ناکامیوں اور نااُمیدی کے ماحول ہی میں تو مصروف جدوجہد تھے۔ ہم نے جو راہ اختیار کی تھی وہ انہی مایوسیوں اور رکاوٹوں سے بھری پڑی تھی۔ ہم اس بات سے بھی واقف تھے کہ آخری فیصلہ کن جنگ میں شاید ہم نہیں ہوں گے۔ ہم تو ان مجاہدین کے لیے ہراول کا کام کررہے تھے۔ جنہیں فتح یاب ہونا تھا جنہیں اس دیس کے دشمنوں کو فیصلہ کن شکست دینا تھی' جنہیں اس ملک میں غیر ملکی راج کی میت کو دفن کرنا تھا۔ جنہیں فرنگی اقتدار کی ارتھی کو چتا پر رکھ کر پھونکنا تھا۔

نماز پڑھنے کے کچھ ہی دیر کے بعد مجھے استی کی مخصوص خوشبو اپنے گرد چکراتی محسوس ہوئی۔ اس سے گفتگو کرنے یا کچھ کہنے کے لیے مجھے زبان ہلانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ دلوں کے بھید جان لینے والی استی کچھ کہے بغیر بھی سب کچھ جان لیتی تھی۔ اس کی خوشبو سے ایک لطیف سا احساس میرے وجود میں کروٹیں لینے لگتا تھا۔ اس کا سبب یقیناً یہی رہا ہوگا کہ اس سے میرا رشتہ بہت قریب کا تھا۔ وہ میرے باپ باسوس کی بہن تھی۔ اس ناتے میں بھی تو اسی کی خوشبو' اسی کا رنگ' اسی کا آئینہ تھا' ایسا آئینہ جس میں وہ اپنے مرحوم بھائی کا عکس دیکھتی ہوگی۔ میرے گرد لوگوں کی موجودگی کبھی اس کی اور میری ملاقات یا گفتگو میں حارج نہیں ہوئی۔ جو کچھ میرے ذہن میں ہوتا وہ جان لیتی اور جو کچھ وہ کہتی میں سُن لیتا۔ یہ گفتگو باطن کی گفتگو ہوتی' ظاہر کی نہیں اور باطن ہی تو سب کچھ ہے ظاہر میں کیا رکھا ہے۔

"طارنوش!" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "ہمت نہ ہارنا کہ تم خیر کی راہ پر ہو۔ اور سُنو کہ ضروری نہیں خیر ہی کو ہمیشہ شر کے مقابل فتح نصیب ہو۔ ہاں میں سمجھ رہی ہوں کہ تمہارے لیے یہ بات عجیب ہے۔ میرے بچے! فتح و شکست کا انحصار عمل اور ردّ عمل پر ہے۔ تمہاری یہ قوم جو اس خطہ زمین پر بستی ہے کہ جسے ہندوستان کہا جاتا ہے' یہ اپنے اعمال ہی کی فصل کاٹ رہی ہے۔ تقدیر اعمال کی پابند ہے' کوئی جامد شے نہیں' سو اعمال ہی سے تقدیر کا تعین ہوتا ہے۔ وہ لوگ رب کعبہ کی قسم جھوٹے ہیں جو اپنی بے عملی کو تقدیر کا نوشتہ گردانتے ہیں۔ انفرادی خیر' اجتماعی خیر سے کم تر ہے۔ تو اگر اجتماع بے عمل ہے یا عمل کا رخ خیر کی طرف نہیں پھر بھلا انفرادی خیر اجتماع پر کس طرح غالب آسکتی ہے! مگر کیوں کہ فرد ہی سے افراد' گروہ اور قبیلے وجود میں آتے ہیں اس لیے انفرادی خیر کی تلقین کی جاتی ہے اور میں تمہیں بھی یہی تلقین کرتی ہوں کہ فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر نیکی اور بھلائی کے لیے جدوجہد کرتے رہو۔"

استی! کیا تمہارے اس اشارے کو ہم اپنی شکست کی پیش گوئی خیال کریں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے ابھی جو تلقین کی تم اس سے انحراف کررہے ہو طارنوش! اس کے باوجود میری محبت مجبور کررہی ہے کہ تمہیں تمہارے سوال کا جواب دے دوں۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔ آنے والا وقت تمہارے سوال کا جواب ہے کہ تم اپنی مہم میں کامیاب رہو گے یا نہیں! میں نے آج محسوس کیا کہ تم کچھ پریشان ہو تو تمہیں سمجھانے چلی آئی۔ میں تمہیں کس طرح پریشان دیکھ سکتی ہوں۔"

پھر استی خاصی دیر تک میرے اندر چھپے ہوئے وطن پرست انقلابی کو جوش دلاتی رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے ملتان میں مجاہد اوّل کی کمی پوری کردی ہو۔

اگلے روز ہم سب ساتھی ملتان کے گلی کوچوں میں گھوم رہے تھے۔ ہم نے ان لوگوں سے ملاقاتیں کیں جو سنجیدہ اور نیک نام تھے۔ اس کے علاوہ ہم نے جگہ جگہ تقریریں کیں۔ ان تقریروں کا لب لباب یہی تھا کہ ملتان کے باشندے آپس میں بھائی چارہ قائم رکھیں۔ ہمارا پیغام محبت کا پیغام تھا۔ اس نیک کام میں ملتان کے چند نوجوان بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگئے' ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ عام آدمی جو

امن و سکون چاہتا ہے اس نے ہماری ان باتوں کو توجہ سے سُنا ان کی اہمیت کو جانا۔

حیدر علی اور ٹیپو کے بارے میں مجھے پہلی مرتبہ یہ علم ہوا کہ وہ دونوں بہترین مقرر بھی تھے۔ مجاہد اوّل کو یقیناً یہ اندازہ رہا ہوگا کہ ملتان کی مہم میں یہ ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔ پھر اگر آدمی تقریر کا فن نہ بھی جانتا ہو اور جو اس کے دل میں ہو' وہی زبان پر ہو تو بھی اس کی بات دلوں پر اثر کرتی ہے۔ بخت خاں کا معاملہ یہی تھا' اس کی تقریر بے لاگ اور دل کی آواز لگتی تھی۔ ہرچند کہ اس میں زیادہ جذبات سے کھیلنے یا انہیں اُبھارنے کا وصف نہیں تھا۔ جوگیندر اور سیتا تو پہلے ہی سے تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے اپنے نظریات کی ترویج کے لیے ایک عرصے فیلڈ ورک کیا تھا۔ سیتا کی تقریر بھی صنف نازک ہونے کے ناتے ہندو حلقوں پر اثر انداز ہوتی تھی اور مسلمان بھی اسے ہندو سمجھ کر بہت متاثر ہوتے تھے۔ وہ متعصب ہندوؤں کو انہی کے دھرم کے حوالے دے کر بڑی کھری کھری سناتی تھی اور پھر راہ راست پر آجانے کی تلقین کرتی تھی۔ ان تقریروں میں بخت خاں' میں' ٹیپو اور حیدر علی نیز سیتا اور جوگیندر دو مختلف انداز سے ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔ جوگیندر اور سیتا بار بار بڑے اعتماد سے ایک ہی بات گھما پھرا کر مختلف انداز میں کہہ رہے تھے تاکہ لوگ ان کی باتوں کو ذہن نشین کرلیں۔

"دوستو۔۔۔ دوستو!" جوگیندر لوگوں کو مخاطب کرتا "ذرا سوچیں' غور کریں اس وقت ملتان میں ایسی فضا پیدا کردی گئی ہے جس کی بنا پر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں۔ افواہیں پھیلائی گئی ہیں کہ مسلمانوں نے ہتھیار جمع کرلیے ہیں' لڑنے کے لیے بڑے بڑے جھرے بنائے ہیں۔ ہم پر یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے ہتھیار لائے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ دوستو! یاد رکھو تمہارا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں' یہ جھگڑا ساہوکاروں' مہاجنوں اور کسانوں کے درمیان ہے۔ سنو دوستو! آج میں فضا میں انسانی خون اور جلے ہوئے مکانوں کی بو سونگھ رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ اس خون میں کسی ساہوکار کا خون شامل نہیں ہے۔ جلے ہوئے مکانوں میں کوئی مکان کسی مہاجن کا نہیں ہے۔ ایسا اس لیے نہیں ہے کہ ان ساہوکاروں اور مہاجنوں نے اپنے اور کاشتکاروں کے جھگڑے کو ہندو اور مسلمان کے درمیان جھگڑے میں تبدیل کردیا ہے۔ انہوں نے آپ کو غلط بتایا ہے کہ آپ کے دھرم کو خطرہ ہے۔ یہ غلط ہے کہ ہندو اور مسلمان جب ایک دوسرے کو قتل کررہے ہوں گے تو وہ اپنے دھرم کے لیے جنگ کررہے ہوں گے۔ میں بتاتا ہوں کہ اس میں صرف کاشتکار' مزدور اور غریب کا خون بہے گا۔ قتل کرنے والا اور قتل ہونے والا دونوں ہی مظلوم ہوں گے۔ ظالم اپنی حویلیوں میں قہقہے لگارہے ہوں گے۔ کوئی ساہوکار یا مہاجن قتل نہیں ہوگا۔ یقین جانو تمہارا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں۔ تمہارا جھگڑا تو اس درندے سے ہے جو نہ کانگریسی ہے نہ خلافتی' نہ ہندو ہے نہ مسلمان' جو صرف ساہوکار اور مہاجن ہے۔ جو سود خور ہے۔ جو تمہارا خون چوستا ہے اور تمہارے ہاتھوں سے روٹی چھین لیتا ہے۔"

اور میں اپنی تقریر میں سیاسی حالات پر روشنی ڈال رہا تھا۔ میں انہیں بتا رہا تھا کہ ہم اتنی دور سے محض اس لیے آئے ہیں کہ ہمیں پتا چلا تھا' یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی فضا تیار کی گئی ہے۔ میں نے بتایا کہ انگریز نے اپنے پٹھوؤں کے ساتھ مل کر پورے ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کے لیے فرقہ ورانہ فسادات کی آگ بھڑکانے کی سازش تیار کی ہے کیوں کہ اسے ہندوستان کی ان دو قوموں کا اتحاد پسند نہیں۔ یہ اتحاد اس کے لیے خطرہ ہے اگر یہ اتحاد قائم رہا تو پھر وہ لوٹ مار نہیں کرسکے گا۔

دن بھر کی تگ و دو کے بعد ہم کچھ مطمئن تھے۔ لوگوں کی سمجھ میں ہماری باتیں آرہی تھیں' ان لوگوں کی سمجھ میں جو امن اور سکون چاہتے تھے۔ شام تک ملتان کے گلی کوچوں سے ہندو مسلم اتحاد کے نعرے اُبھر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ٹولیاں بنا کر گلی محلوں میں نعرے لگاتے ہوئے گھوم رہے تھے۔ بچے جو امن اور معصومیت کی علامت ہوتے ہیں! ہم اس وقت خلافت کے دفتر میں بیٹھے تھے اور لوگ ہم سے آکر مل رہے تھے۔ نوجوانوں میں بڑا جوش و خروش تھا۔ اسی دوران میں ہمیں اطلاع ملی کہ ہندو ساہوکاروں میں سخت خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے ہرکارے آس پاس کی بستیوں میں دوڑا دیے ہیں۔ اس کے علاوہ انگریز انتظامیہ کے اعلیٰ افسران سے بھی رابطے کیے جارہے ہیں۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ ہم نے وہ فرقہ وارانہ کشیدگی جو گزشتہ روز محسوس کی تھی اس وقت محبت و یگانگت سے بدل گئی تھی۔ اس کا احساس احمد حسین نے دلایا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ کوئی ایک ماہ بعد یہ پہلا موقع ہے کہ ہندو نوجوان بھی تحریک کے دفتر میں آرہے ہیں۔

"بس دو تین دن ہمیں اور مل گئے تو ہم اس زہر کو جو یہاں گھول دیا گیا ہے ختم کردیں گے۔" بخت خاں نے کہا۔

مگر ایسا نہ ہوا۔ انگریز اور اس کے پٹھو ہمیں اتنی مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے کہ احمد حسین نے ہمیں جھنجوڑ کر بیدار کردیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے بتایا "ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فوج اور پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ ملتان اور اردگرد کی آبادیوں کے مسلمان زمینداروں کے مکانات کو گھیر لیا ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس وقت رام موتی کے گھر ہے بہتر ہے کہ تم سب یہاں سے فرار ہوجاؤ۔"

"مگر کیوں؟" میں نے دریافت کیا۔

"احتیاطاً" اس نے جواب دیا "میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ گرفتار کرلیے جاؤ۔ تمہاری حفاظت میری ذمے داری ہے۔"

"مگر اس وقت ہم کہاں جائیں گے؟" بخت خاں بولا۔

"میں نے اس کا انتظام پہلے ہی کر رکھا ہے۔" احمد حسین نے کہا۔

پھر ہم سب احمد حسین کے گھر سے ایک نوجوان کی رہبری میں نکلے۔ ابھی ہم ایک گلی میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ہم نے بھاری قدموں کی آوازیں سنیں۔ میں نے گلی کے نکڑ سے پلٹ کر دیکھا۔ دور اندھیرے میں فوج اور پولیس کا ایک دستہ احمد حسین کے مکان پر پہنچ چکا تھا۔ ہم تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئے۔ چند منٹ بعد ہم مختلف گلیوں اور کوچوں سے گزر کر ایک مکان میں داخل ہورہے تھے۔ اس مرتبہ ہم اپنے ایک تنظیمی ساتھی ہوشو شیدی کے مہمان تھے۔ ہوش محمد شیدی' سندھ کا ایک جاں باز مجاہد تھا۔ اسی کو ہوشو شیدی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس سرفروش نے سرزمین سندھ پر انگریز جنرل نیپئر سے ٹکر لی تھی۔ مکران کے اسی جواں مرد ہوشو شیدی کا نام ملتان کے اس تنظیمی ساتھی نے اپنا لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا اصل نام کچھ اور ہی رہا ہوگا۔ بہت بعد میں اسی جنرل نیپئر کے نام پر کراچی کے ایک راستے کا نام "نیپئر روڈ" رکھا گیا۔

صبح ہمیں اطلاع ملی کہ انگریز فوج اور پولیس نے کئی مسلمان گھروں کی تلاشی لی ہے اور کئی افراد کو گرفتار کرلیا ہے۔ فوج اور پولیس ہتھیاروں کی تلاش میں تھی۔ جب مشتبہ افراد کے گھروں سے ہتھیار برآمد نہیں ہوئے تو خلافت کے دفتر کی تلاشی لی گئی۔ وہاں بھی ناکامی ہوئی تو فوج اور پولیس نے قریبی مسجد میں گھس کر تلاشی لی مگر کوئی ہتھیار نہیں ملا۔ ایک مسلمان کے گھر کے کاٹھ کباڑ سے ایک زنگ آلود چھرا برآمد ہوا۔ کئی مسلمانوں کو پولیس نے گرفتار کرلیا۔ گرفتار شدگان میں علی حمزہ بھی شامل تھا۔ علی حمزہ کو مسجد سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کی عمر ستر برس تھی اور اس کے جرائم میں ایک بڑا جرم یہ بھی تھا کہ وہ شاعر بھی تھا۔ گوہر تخلص کرتا تھا۔ وہ ایسے شعر کہتا تھا جو مسلمانوں کے ماضی کو یاد دلاتے تھے۔

علی حمزہ مسلمانوں ہی میں نہیں ہندوؤں میں بھی بہت عزّت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ علامہ اقبال کے مداحوں میں سے تھا اور اس کے اشعار میں اقبال کے شعروں کی گونج محسوس ہوتی تھی۔ اس وقت تک علامہ اقبال نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا مگر بہ حیثیت شاعر مقبول و مشہور ہوچکے تھے۔ اقبال کے شعر بہ طور تحفہ ملتان آتے تھے۔ علامہ کی سکونت لاہور میں تھی جہاں سے ہم ملتان پہنچے تھے۔ علامہ سے ملنے کی میری بڑی خواہش تھی کیوں کہ ان کا فارسی کلام میری نظر سے گزر چکا تھا مگر لاہور کے دوران قیام میں اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ میں اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنا سکتا۔ علی حمزہ کو اقبال کے اشعار کا حافظ سمجھا جاتا تھا۔ شاعر ہونے کے علاوہ علی حمزہ مذہبی رہنما بھی تھا اور ایک ایسا زمیندار بھی جو مسلمان کاشتکاروں کا رہنما کہلاتا تھا۔

مسجد کی بے حُرمتی اور علی حمزہ کی گرفتاری کی خبر سے ملتان اور اس کے گردونواح میں اشتعال پھیل گیا تھا۔ خصوصاً کاشتکار بہت مشتعل تھے۔ ان کو مزید مشتعل کرنے کے لیے' ان کا مذاق اُڑانے کے لیے ملتان کے مہاجنوں نے اپنے کارندوں سے کام لیا۔

فوج اور پولیس بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کرکے خوش اور مطمئن تھی۔ انہوں نے ایک اسکول کو اپنا مستقر بنالیا تھا اور انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ان کی حفاظت میں بیٹھا ہوا چالیس چل رہا تھا۔ اس نے مہاجنوں کے ان کارندوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جو صبح ہی سے جتھوں کی صورت میں شہر کے گلی کوچوں اور آس پاس کے علاقوں میں دل آزار نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔

یہ سب کچھ تھا مگر ہماری گزشتہ دن بھر کی کارروائیوں اور تقریروں کا ابھی تک ملتان کے لوگوں پر اثر تھا۔ ہم سب تنظیمی ساتھی اور جوگیندر کے ساتھ ساتھ سیتا' سبھی پھر مصروف ہوگئے تھے۔ جوگیندر اور سیتا امن پسند اور سنجیدہ و معقولیت پسند ہندوؤں سے ملتے پھر رہے تھے۔ میں اور بخت خاں مسلمان زمینداروں اور کاشتکاروں کے رہنماؤں سے مل رہے تھے' انہیں پُرامن رہنے کی تلقین کررہے تھے۔

ہماری ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دن مہاجنوں اور ساہوکاروں کے کارندوں کی تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود امن اور سکون سے گزر گیا۔ ہم نے ہندو مہاجن اور انگریز گٹھ جوڑ کے خلاف پر امن محاذ بنا لیا تھا۔

اگلے روز بھی ہماری یہ سرگرمیاں جاری تھیں کہ ہمیں ہوشو شیدی سے ایک تشویش ناک اطلاع ملی۔ اطلاع یہ تھی کہ انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ہماری ان کوششوں کی خبر ہو گئی ہے اور اس نے ہماری گرفتاری کے احکام جاری کر دیے ہیں۔ یہ احکام رام موہنی کی رپورٹ پر جاری کیے گئے تھے جس میں اس نے جوگیندر کی جانب سے جان سے مار دینے کی دھمکی کا ذکر کیا تھا۔ اسی کے ساتھ ہوشو شیدی کا نام بھی مشتبہ افراد میں آگیا تھا۔ اس کا گھر اب ہمارے لیے محفوظ نہیں رہا تھا۔ ہوشو نے ہمارے لیے ایک اور محفوظ پناہ گاہ کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہوشو کے گھر سے ہم وہاں منتقل ہو گئے۔

ہوشو واقعی ذہین شخص تھا۔ اس نے ہمارے لیے ایسی محفوظ جگہ کا بندوبست کیا تھا جہاں فوج اور پولیس کا دھیان بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ وہی اسکول تھا جسے عارضی طور پر فوج اور پولیس نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ ہم اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے گھر منتقل ہوئے تھے۔ ہیڈ ماسٹر کا یہ کوارٹر اسکول ہی کے احاطے میں ایک طرف بنا ہوا تھا۔ آمد و رفت کے لیے اس کوارٹر میں ایک دروازہ ایسا بھی تھا جو باہر کی طرف کھلتا تھا اور گھر کے اندر داخل ہونے کے لیے اسکول کے احاطے سے گزرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ احمد حسین اور ہوشو نے اس کوارٹر کے علاوہ بھی دو تین متبادل جگہیں بتائی تھیں۔ انہی میں سے ایک جگہ شیخ رکن عالم کے مقبرے کے شمال میں تھی۔ یہ ایک مسجد تھی جو اورنگ زیب عالمگیر نے اس شہر میں بنوائی تھی۔ ایک مسجد ہی سے علی حمزہ کی گرفتاری عمل میں آچکی تھی۔ انگریز مجسٹریٹ سے مسجد کے احترام کی توقع عبث ہی تھی۔ اگر اسے ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا تو وہ فوجیوں کو مسجد میں داخل ہونے کا حکم دے دیتا اور ہماری گرفتاری سے قطع نظر مسجد کا تقدس خطرے میں پڑتا جو ہم نہیں چاہتے تھے۔ جو بھی متبادل جگہیں احمد حسین اور ہوشو شیدی نے ہمیں بتائیں ان میں سے ہم نے اسی کوارٹر کو پسند کیا۔ بخت خاں نے بھی اسی کوارٹر کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ وہ بہرحال اس مہم کا نگراں تھا۔ یہ الگ بات کہ عملاً تمام ہی ساتھی ایک دوسرے سے برابری کی سطح پر تعاون کر رہے تھے۔ ہمارے درمیان کوئی افضل و کمتر نہیں تھا۔ بخت خاں کا رویہ انتہائی دوستانہ تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ہمارا نگراں یا انچارج ہے اور ہم سب اس کا حکم ماننے کے پابند ہیں۔ اس کے باوجود نظم و ضبط وہی تھا جو ایک منظم گروہ کا ہونا چاہیے۔ میرے یا اس کے درمیان اب تک کوئی ایسا معاملہ درمیان میں نہیں آیا تھا کہ جس پر ہم دونوں کی آراء مختلف ہوں۔ بہ طور خاص میرے ساتھ اس کا رویہ ایسا تھا جیسے ٹیم کا نگراں وہ نہیں بلکہ میں ہوں۔ اس کوارٹر کی بابت بھی بخت خاں نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوارٹر کیونکہ اسکول کے احاطے ہی میں ہے جسے انگریز فوج اور پولیس نے اپنا مستقر بنا رکھا ہے لہٰذا کسی کو بھول کر بھی یہ خیال نہیں آئے گا کہ پولیس کو مطلوب افراد نے انہی کے قریب پناہ لی ہوگی۔ ہوشو نے بھی اسی لیے اس کوارٹر کا بندوبست کیا تھا۔ پھر یہ کہ ہیڈ ماسٹر سرکاری ملازم تھا۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ حکومت کے مجرموں کو اپنے گھر میں پناہ دے گا۔ ویسے بھی وہ سرکاری حلقوں اور سرکار کے پٹھوؤں میں قابل اعتبار سمجھا جاتا تھا۔

اس کوارٹر میں منتقل ہونے کے بعد ہم ایک بار پھر اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔

اس رات ہم نے دو بڑے بڑے پوسٹر اسکول کے احاطے کی دیوار اور بازار میں نمایاں جگہ چسپاں کیے۔ یہ پوسٹر وطن پرست انجمن کی جانب سے تھے جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو اس پر مبارکباد دی گئی تھی کہ انہوں نے مہاجنوں اور ساہوکاروں کے کارندوں کی تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود امن و سکون قائم رکھ کر انگریز کی سازش ناکام بنا دی اور ثابت کر دیا کہ کوئی بھی ہندو مسلم اتحاد کو ختم نہیں کر سکتا۔

شہر میں ان پوسٹروں کی خوب شہرت ہوئی مگر اس پر جوابی کارروائی بھی خوب ہوئی۔ مہاجنوں اور ساہوکاروں کے کارندوں نے اسی دن محمد علی جوہر اور شوکت علی کے چلائے گئے خلافت تحریک کے خلاف مردہ باد کے نعرے لگائے اور ہر وہ ترکیب آزمائی جس سے مسلمان مشتعل ہو سکتے تھے۔ دوسری طرف احمد حسین کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ شہر میں یہ اعلان کروا دیا گیا کہ آگرے سے آئے ہوئے پانچ نوجوانوں اور ایک لڑکی کو جو بھی پناہ دے گا اسے گرفتار کر لیا جائے گا اس کا تمام اثاثہ بہ حق سرکار ضبط کر لیا جائے گا۔ ہم نے ملتان میں اپنے متعلق یہی بتایا کہ ہمارا تعلق یوپی کے شہر آگرے سے ہے۔

ہم اب اپنی کوششوں کو قطعی اور فیصلہ کن رخ دینے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ان تین دنوں میں ہم نے اپنے نئے ساتھی ہوشو شیدی اور ایک دوسرے ساتھی کی مدد سے ارد گرد کی آبادیوں کے کسانوں کو انگریزوں کے خلاف ایک منظم کارروائی کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔

اسی رات ہم اپنے منصوبے کو آخری شکل دے چکے تھے۔ رات کو بارہ بجے جب ملتان کے باشندے آرام کی نیند سو رہے تھے، فوج اور پولیس کے مستقر پر خاموشی چھائی ہوئی تھی، ہم چار افراد ہیڈ ماسٹر کی آشیرواد (شاباشی) کے ساتھ باہر نکلے۔ جوگیندر اور بیتا کو ہم نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد ہماری خفیہ پناہ گاہ کے دروازے پر کھڑا ہمیں اندھیرے میں گم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ میں اور بخت خاں آگے تھے، ٹیپو اور حیدر علی ہمارے عقب میں تھے۔

اس رات پانچ سرکاری عمارتوں اور دفاتر کو نذر آتش کر دیا گیا۔ تمام شہر میں جاگ ہو گئی۔ شور اور ہنگامہ مچ گیا۔ فوج اور پولیس کے دستے مختلف ٹکڑیوں میں ان مقامات پر پہنچ گئے جہاں یہ وارداتیں ہوئی تھیں۔ بہ یک وقت کئی جگہ آگ بھڑکنے کی وجہ سے آگ بجھانے والے عملے کو خاصی دقت پیش آرہی تھی۔

آتش زنی کے بعد ہم چاروں پھر اپنی کمیں گاہ پہنچے۔ اسکول کے احاطے میں اس وقت خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف چند سنتری اسکول کے گیٹ پر پہرا دے رہے تھے۔ ہم نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ان پانچوں قیدیوں کو رہا کرایا جنہیں پوچھ گچھ کے لیے اسکول میں رکھا گیا تھا۔ ان قیدیوں میں احمد حسین بھی شامل تھا۔ ان پانچوں کی حالت بے حد خستہ تھی۔ ان کے جسموں کو گرم لوہے سے داغا گیا تھا۔ احمد حسین کی حالت سب سے زیادہ نازک تھی۔ اس کے سر کے بال جھلسے ہوئے تھے، سر اور ماتھے کی کھال جھلس کر سکڑ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں خون کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ ان پانچوں کو ہم نے ایک تانگے کے ذریعے قریبی آبادی کی طرف روانہ کر دیا۔

صبح بڑی چمکیلی اور روشن تھی۔ حالانکہ فضا میں اب بھی جلتی ہوئی عمارتوں کا دھواں موجود تھا۔ اس صبح ملتان کے باشندوں نے پھر شہر میں دو مقامات پر انجمن وطن پرست کے پوسٹر پڑھے۔ پھر ان پوسٹروں کا مضمون بہت جلد ہر شخص کی زبان پر آگیا حالانکہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم پر ان پوسٹروں کو دیواروں سے اکھاڑ لیا گیا تھا۔ ان پوسٹروں کے ذریعے انجمن وطن پرست نے آتش زنی کی وارداتوں کی ذمے داری قبول کرتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کے دشمنوں کے خلاف اعلان جنگ بھی کیا تھا۔

میں اس وقت پوسٹ آفس کی سلگتی ہوئی عمارت کے پاس مجمع میں کھڑا تھا۔ میرے جسم پر اس وقت جو لباس تھا، اس سے میں ہندو معلوم ہوتا تھا۔ میری آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ فوج اور پولیس لوگوں کو سلگتی ہوئی عمارت سے دور رکھے ہوئے تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ اب چند منٹ رہ گئے تھے۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا پیچھے ہٹ آیا۔ اب صرف پانچ منٹ باقی تھے۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد ایک سمت سے لوگ بڑھے۔ وہ سب تحریک خلافت اور مولانا محمد علی جوہر کی حمایت میں نعرے لگا رہے تھے۔ نعروں کی آوازیں سن کر جلتے ہوئے پوسٹ آفس کے سامنے جمع افراد چیخنے لگے۔ پھر اسی طرح نعرے لگاتے ہوئے مجمع میں سے کسی نے چیخ کر کہا "حملہ ہو گیا، حملہ ہو گیا!"

حملہ کہاں ہوا تھا، کس نے کیا تھا، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ پھر کیا تھا، بھگدڑ مچ گئی۔

پانچواں منٹ پورا ہو چکا تھا۔ "وقت ہو گیا" میں نے آواز لگائی۔

اس بھگدڑ میں کسی کو احساس بھی نہیں ہوا ہوگا کہ آواز لگانے والا میں تھا۔ ساتھ ہی میں نے چھوٹا سا پٹاخا سڑک پر پھینک دیا۔ وہ پٹاخا کسی کے جوتے کے نیچے آکر پھٹا۔ اس کے ساتھ ہی تھیلیوں سے کئی غلے نکل کر پوسٹ آفس کے سامنے متعین فوجیوں اور پولیس والوں کے لگے۔ پھر پے در پے غلوں کے تین چار بوچھاڑیں ماری گئیں۔ اسی وقت دوسری سمت سے لوگ بھاگتے ہوئے آئے "حملہ ہوا ہے" آوازیں ابھریں۔

"کس طرف؟" کسی نے پوچھا۔

"ادھر" جواب آیا۔

"نہیں ادھر" کسی اور طرف سے آواز ابھری۔

فوج اور پولیس نے اپنی رائفلیں ادھر کر دیں جدھر سے ان پر غلوں کی باڑھ پڑی تھی۔ لوگ پھر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ نعروں میں شدت آگئی۔ ہجوم اسی وقت ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگاتا ہوا ڈاک خانے کی سلگتی ہوئی عمارت کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اسی وقت دوسری سمت سے فوج اور پولیس پر غلوں کی باڑھ ماری گئی۔ ہوائی فائر کا حکم دیا گیا۔ ایک افراتفری مچ گئی۔ مجمع منتشر ہو گیا لیکن تھوڑی دور جا کر لوگ ٹھہر گئے۔

کسی نے انہیں سمجھایا تھا کہ موقع پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

سکتی ہے۔ اس لیے فوج اور پولیس مجمع پر فائرنگ نہیں کرسکتی۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فوج اور پولیس کی بھاری جمعیت لے کر وہاں پہنچ گیا۔ لوگوں نے اسے دیکھ کر پھر پُرجوش انداز میں ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگائے۔

اب میں بھی اس مجمع میں شامل تھا بلکہ مجمع کی قیادت کررہا تھا۔ میری ذمّے داری یہ تھی کہ کم از کم ایک گھنٹے اور یہ ہنگامہ جاری رکھا جائے اور انتظامیہ کو یہ احساس دلایا جائے کہ اس وقت ملتان کا یہی مقام عوام کے اشتعال کا مرکز بنا ہوا ہے۔

ابھی اس ہنگامے کو صرف آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ ملتان کے تین مختلف علاقوں سے ایک دم سیاہ دھوئیں کے بادل آسمان کی طرف اُٹھتے نظر آئے "آگ، آگ!" اس کے ساتھ ہی شور مچ گیا۔ گویا اب میرا کام ختم ہوگیا تھا۔ تین اور سرکاری دفاتر اور عمارتوں کو آگ لگادی گئی۔ پروگرام کے مطابق اب ہمیں وہاں سے منتشر ہوجانا تھا۔ مجمع سے اس مرتبہ کئی پتھر چلے، کئی پٹاخے چھوٹے۔ فوج اور پولیس نے جواب میں پھر ہوائی فائر کیے۔ اس کے بعد مجمع کو وہاں سے تتر بتر ہونا ہی تھا۔

اس دن شام تک شہر میں کئی جگہ چھاپے پڑے، کئی افراد گرفتار ہوئے مگر وہ لوگ جنھوں نے لوگوں کو جلوس کی شکل میں منظم کیا تھا، پولیس اور فوج کی پہلی ہوائی فائرنگ کے بعد ہی ملتان شہر سے فرار ہوچکے تھے۔ اب ان تک پہنچنا پولیس کے لیے کم از کم وقتی طور پر ممکن نہیں تھا۔ ان لوگوں میں ہوشو شیدی بھی شامل تھا۔

ملتان اور اس کے گردونواح میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ یہ بیشتر کاشتکار اور کھیت مزدور تھے۔ غربت و افلاس میں کفنائی ہوئی زندہ لاشیں تھیں۔ ہندو اگرچہ یہاں اقلیت میں تھے مگر مسلمانوں سے زیادہ بہتر حالت میں تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے یا پھر زمیندار، مہاجن، ساہوکار اور تاجر ہر شعبہ زندگی ان کے تابع تھا۔ اگر یہاں کے مسلمان اُٹھ کھڑے ہوتے اور ہندوؤں کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کردیتے تو انھیں ہندوؤں کا صفایا کرنے میں دیر نہ لگتی۔ مگر ہندوؤں کو انگریز حکمرانوں کی حمایت اور تحفظ حاصل تھا۔ پھر تمام معیشت ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی اس لیے یہاں کے مسلمانوں نے اپنی غربت اور پسماندگی، اپنی بے بسی اور کمزوری کا احساس کرتے ہوئے کبھی ہندوؤں کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جسارت نہیں کی تھی۔ وہ خوف اور دہشت میں زندہ رہتے تھے۔ انھوں نے بھوک اور فاقہ کشی سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ وہ ہندوؤں کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

اس دن ہمارے پروگرام کے مطابق نواحی آبادیوں کے کاشتکاروں نے انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ انگریزوں سے ان کی یہ نفرت مذہبی بنیادوں پر تھی۔ وہ سب انگریز کے دشمن تھے کیوں کہ انگریز نے اس وقت کے سب سے مضبوط اور بڑے اسلامی ادارے یعنی خلافت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔

اس دن کے مظاہرے کا سب سے خوش کن پہلو یہ تھا کہ میں نے تمام جوش و جذبے کے باوجود اس مجمع کو اپنے مقصد سے منحرف نہیں ہونے دیا تھا۔ مجمع نے اپنی تمام نفرت کا اظہار ہندو مسلم اتحاد کے دشمنوں کے خلاف کیا تھا حالانکہ گزشتہ دو روز کے دوران میں ہندو ساہوکاروں اور مہاجنوں کے کارندوں نے کئی مرتبہ جتھوں کی صورت میں گشت کرتے ہوئے مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے تحریک خلافت اور اس کے لیڈروں کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگائے تھے۔ اس دن ایک بھی نعرہ ہندوؤں کے خلاف نہیں لگایا گیا تھا۔ مجھے فخر تھا کہ اس دن میں نے اپنے منصوبے کے اس حصّے کو نہایت کامیابی سے پورا کیا تھا۔ ہماری کامیابی کا انحصار اس بات پر تھا کہ جذبات کے ریلے کو ہندوؤں کی طرف نہ مُڑنے دیا۔

یہ پورا منصوبہ میرے ہی ذہن کی پیداوار تھا۔ عملاً اب بخت خاں خود بہ خود میرے زیرِ کمان آگیا تھا۔ اس منصوبے کی منظوری کی حد تک تو وہ مہم کا نگراں ضرور رہا تھا۔ مگر منظوری کے بعد اس نے ایک عام تنظیمی رکن کی طرح خود ہی اپنے آپ کو میرے احکام کا پابند بنالیا تھا۔ منصوبے کی نوعیت ایسی تھی کہ اس میں زیادہ افرادی قوت مطلوب تھی اس لیے جوگیندر تو جوگیندر، سیتا نے بھی عملی حصہ لیا تھا۔ وہ بخت خاں کے ساتھ ساتھ سرکاری عمارتوں کو نذرِ آتش کرنے میں پیش پیش رہی تھی۔

بارہ ساڑھے بارہ بجے تک ہم سب وقفے وقفے سے پھر ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کے کوارٹر پہنچ چکے تھے۔ اب ہم ایک دوسرے کو اپنی کارگزاریوں کی تفصیل سے آگاہ کررہے تھے۔ سیتا مجھ سے ایک ایک تفصیل کرید کرید کر پوچھ رہی تھی کیوں کہ میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ یہ کہ میں نے مجمع کو کیسے قابو میں رکھا اور کس طرح بے لگام نہیں ہونے دیا وغیرہ۔

"تم اگر عملی سیاست میں ہوتے تو ایک کامیاب لیڈر ہوتے۔" جوگیندر نے میری کارگزاری پر تبصرہ کیا تھا۔

ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا تھا۔ وہ بھی ایک انقلابی تھا۔ اس کا دل بھی آزادیِ وطن کی خواہش سے الاؤ بنا ہوا تھا۔ اسی کی وجہ سے ہمیں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے چند ایسے سرفروش ملے تھے جو خود بھی گنگا پرشاد کی طرح آزادی کی خاطر جان سے گزرنے کو تیار تھے۔ شام تک ہمیں اپنی اس کامیابی کے نتائج کا علم ہوگیا۔ ستیش کی رپورٹ ان نتائج کی آئینہ دار تھی۔

ستیش ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کا شاگرد رہ چکا تھا اور ان دنوں ریلوے میں ملازم تھا۔ اس نے بتایا "سارا شہر ہندو مسلم اتحاد کے نعروں سے گونج رہا ہے۔ ہندو اور مسلمان گلے مل رہے ہیں۔ ہر طرف اعتماد اور محبت کی گرمی فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک دوسرے پر بے اعتمادی اور خوف کا غبار دھل چکا ہے۔ ساہوکار اور مہاجن اس سے خوف زدہ ہیں۔ ان پر اس اتحاد کی دہشت بیٹھ گئی ہے۔ وہ فریادیں لے کر انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس گئے ہیں۔ انھیں اپنی جان کے لالے پڑگئے ہیں۔ خود انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، انگریز فوج اور پولیس کے ساتھ آنے والے انگریز افسران بوکھلا گئے ہیں۔" "یہ انگریز افسران لائل پور (فیصل آباد) سے مزید پولیس والوں کو لے کر ملتان پہنچے تھے۔" ستیش نے ملتان کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے مزید بتایا "مگر ایک تشویش ناک بات یہ ہے کہ رائے بہادر وشنو کمار ملتان پہنچ چکا ہے اور خان بہادر حمید اللہ پہنچنے والا ہے۔"

میرے دریافت کرنے پر ستیش نے بتایا کہ یہ دونوں حضرات لیجسلیٹو کے رکن ہیں اور انگریز کے پٹھو ہیں۔ ان دونوں کا کام صرف یہی ہے کہ اس علاقے میں مستقل کشیدگی کی فضا قائم رکھی جائے۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے قریب نہ آسکیں۔ ان کی اس موقع پر ملتان میں آمد کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ حالات کو خراب کردیا جائے۔

ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا "بظاہر یہ دونوں افراد بے ضرر لگتے ہیں۔" گنگا پرشاد کہہ رہا تھا "دونوں ہی زبان کے بہت میٹھے ہیں لیکن ان کے من میں زہر ہی زہر بھرا ہوا ہے۔ یہ دونوں صرف انگریز کے ذہن سے سوچتے ہیں۔"

"تو کیا ان کی آمد سے واقعی پھر حالات بگڑ جانے کا خطرہ ہے؟" بخت خاں نے پوچھا۔

"ان کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں۔" گنگا پرشاد بولا "یہ

انگریز کے شکرے ہیں جنھیں وہ ہندوستانیوں کے شکار کی خاطر استعمال کرتا ہے۔ یہ اپنے شکار پر جھپٹتے ہیں اور پہلے اس کی آنکھیں پھوڑ دیتے ہیں پھر انگریز آگے بڑھ کر مجروح کو شکار کرلیتا ہے۔"

تو کیا ان دونوں کی آمد سے ہماری تمام کوششیں خاک میں مل جائیں گی؟ کیا خلوص و محبت کی وہ لہر دم توڑ جائے گی جس میں اس وقت ملتان غسل کررہا تھا اور اپنے وجود سے نفرتوں کا غبار دھو رہا تھا؟ کیا ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا؟ یہ اور ایسے ہی بے شمار تشویش ناک سوالات میرے ذہن میں بچھو کے ڈنک لگا رہے تھے۔

"یہ لوگ کس مقصد کے لیے آئے ہیں، ہمیں بہرحال اس کا علم ہونا ہی چاہیے تھا۔" جوگیندر ٹھنڈا سانس بھر کے بولا۔ ہم لوگ اپنی کارگزاریوں پر خوش ہورہے تھے مگر ان دو شیطانوں کی ملتان میں آمد نے ساری خوشی خاک میں ملادی تھی۔

"وشنو کمار کہاں ٹھہرا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"رام مورتی کے یہاں، وہ دونوں گہرے دوست ہیں۔" ستیش نے میرے سوال کا جواب دیا "اور خان بہادر حمید اللہ یہاں اکثر آتا رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ ڈاک بنگلے میں ٹھہرتا ہے۔ یہاں آکر یہ لوگ مقامی باشندوں سے ملاقاتیں کرتے ہیں۔ رائے بہادر وشنو کمار کسی مسلمان سے نہیں ملتا اور خان بہادر حمید اللہ کسی ہندو سے ملنے کا روادار نہیں۔ ایک ہندوؤں کا بہی خواہ بنتا ہے دوسرا مسلمانوں کا ہمدرد۔"

اس کے بعد ہم نے انجمنِ وطن پرست کی طرف سے دو خط لکھے اور ان کی دو دو نقلیں بنائیں، ایک خط خان بہادر حمید اللہ کو اور اسی عبارت کا دوسرا خط رائے بہادر وشنو کمار کے نام لکھا گیا۔ خط میں کہا گیا تھا کہ وہ ملتان کی فضا کو خراب نہ کریں، یہاں زہر نہ پھیلائیں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل کر بھائیوں کی طرح رہنے دیں، مادرِ وطن کی کوکھ نہ اُجاڑیں، اپنے نطفے کو کسی انگریز لونڈی میں تلاش نہ کریں۔ ان کا باپ کوئی انگریز نہیں ہندوستانی تھا، ان کی ماں کوئی میم نہیں بلکہ اسی دھرتی کی تھی۔ ان کے نام ہم نے یہ خط نہایت سخت الفاظ میں لکھا تھا۔ دوسرا خط ملتان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے نام تھا۔ اس خط میں انھیں مبارکباد دی گئی تھی کہ انگریزوں کے پٹھوؤں کی تمام تر کوششوں کے باوجود انھوں نے بھائی چارہ برقرار رکھا تھا۔ انھیں خبردار کیا گیا تھا کہ وہ انگریز اور ان کے کاسہ لیسوں سے خبردار رہیں۔ وہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے لڑانے کے لیے انتہائی پستیوں میں اُتر سکتے

ہیں' انتہائی شرمناک اقدام کر سکتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ انگریز اور اس کے کتوں کی ہر سازش کو ناکام بنادیں۔ ان خطوط کو ان کی حتمی منزل تک پہنچانے کی ذمے داری ستیش کو سونپی گئی۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اب تک کی کوششوں سے جو نتائج حاصل کیے ہیں' انہیں ضائع نہیں ہونے دیں گے۔

○☆○

"تت۔ تم کون ہو؟" خان بہادر حمید اللہ میرے سامنے مسہری پر بیٹھا تھا میرے ہاتھ میں سیاہ پستول تھا اور حمید اللہ پر خوف طاری تھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا' بس غصے سے اسے گھورتا رہا۔

ستیش کی روانگی کے بعد ہم نے جو پروگرام بنایا تھا اس کے مطابق جوگیندر کو اس وقت وہی کردار ادا کرنا تھا جو میں کر رہا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی میں بخت خاں کے ساتھ ڈاک بنگلے آیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد نے اس کا محل وقوع اور ڈاک بنگلے کا نقشہ سمجھادیا تھا۔ یہ ڈاک بنگلا آبادی سے ذرا ہٹ کر اسٹیشن سے تھوڑے فاصلے پر ایک باغ میں بنا ہوا تھا۔ یہ باغ کسی زمانے میں حضوری باغ کہلاتا تھا (اب یہ اپنی حالت کھوچکا ہے) ہم جس وقت یہاں پہنچے تو خان بہادر حمید اللہ آچکا تھا۔ ڈاک بنگلے میں خوب رونق تھی۔ میں موقع پاکر لوگوں کی نظروں سے بچتا بچاتا ڈاک بنگلے کے اس کمرے میں پہنچ گیا تھا جو حمید اللہ بہ طور خواب گاہ استعمال کر رہا تھا۔ اس وقت حمید اللہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے اس کی مسہری کے نیچے چھپ جانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بخت خاں کو میں نے باہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ ڈاک بنگلے کے آس پاس بھی کئی گھنے درخت تھے۔ بخت خاں کو انہی میں سے کسی درخت پر ہونا چاہیے تھا۔ اگر وہ کوئی خطرہ دیکھتا تو مجھے خبردار کردیتا۔ اس کے لیے مختلف پرندوں اور جانوروں کی آوازیں موقع محل کی مناسبت سے طے کرلی گئی تھیں کہ اگر ایسا ہو تو فلاں پرندے کی آواز نکالنا اور یہ صورت حال ہو تو اس جانور کی آواز نکالنی ہے۔ باتوں باتوں میں مجھے بخت خاں کی اس صلاحیت کا علم ہوگیا تھا۔ وہ اپنے منہ سے پرندوں اور جانوروں کی آوازیں یوں نکالتا تھا کہ ان پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ خود میں نے بھی ان آوازوں کی مشق کی تھی۔ جوگیندر نے بھی میری دیکھا دیکھی "مشغل" اپنالیا تھا۔ اس پر سیتا نے بڑی فقرے بازی کی تھی "ہاں بھیا الو بن کر دیکھو۔ سوری دکھاؤ! ہاں شاباش!" وہ یہ کہہ کر زور سے ہنس پڑتی۔ اور تو اور وہ مجھے بھی نہ بخشتی اور کہتی شاہین! تو تا چوری کھائے گا بول میاں مٹھو بنی جی بھیجو! پھر جب میں واقعی تو تا بن جاتا تو اس کی زندگی سے بھرپور ہنسی فضا کی تمام تر کشیدگی ختم کر دیتی۔ اس وقت یہی کھیل ہمارے کام آرہا تھا۔ بخت خاں اگر کوئی خطرہ محسوس کرتا یا مجھے کسی مدد کی ضرورت ہوتی تو یہ آوازیں کام آتیں۔

مسہری کے نیچے چھپے ہوئے مجھے کئی باتوں کا علم ہوگیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق خان بہادر حمید اللہ کی ملتان آمد کا مقصد صرف ہماری تلاش تھا۔ وہ ملتان میں اپنے زیر اثر افراد کی توسط سے یہ سراغ لگانا چاہتا تھا کہ یوپی سے آنے والے افراد کی پارٹی جن میں ایک لڑکی بھی شامل ہے کہاں ٹھہری ہوئی ہے؟ انہیں کس نے پناہ دی ہے اور کس نے ان لوگوں کو ملتان بلایا ہے؟ اس نے اپنے اعتماد کے لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ جو کوئی مطلوبہ افراد کا پتا چلائے گا اسے وہ حکومت کی طرف سے دو ہزار روپے انعام دلوائے گا اور اس زمانے میں دو ہزار روپے بڑی رقم ہوتی تھی۔ پھر انہی ملاقاتوں کے دوران میں اسے انجمن وطن پرست کی طرف سے وہ خط بھی ملا جو ہم نے ستیش کو دیا تھا۔ اس خط پر بھی اس نے اپنے لوگوں سے بات کی تھی۔ حمید اللہ نے ان لوگوں کو بتایا تھا کہ آنے والے اجنبی ایک ایسی ہندو تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں جس کا مقصد ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کو شدھی کرنا ہے۔ یہ تنظیم تحریک خلافت کی سخت دشمن ہے اور اس نے اپنے خطرناک آدمیوں کو اس لیے ملتان بھیجا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کو جو خلافت تحریک میں پیش پیش ہیں' نقصان پہنچائیں۔ حمید اللہ کی یہ باتیں سن کر میں دل ہی دل میں کھول کر رہ گیا۔ اس کے بعد حمید اللہ اپنے معتمد لوگوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ درمیان میں وہ ان لوگوں کو یہ تاکید بھی کرتا رہا کہ وہ یوپی سے آنے والے اجنبیوں کا سراغ لگائیں کہ وہ ملتان میں کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

پھر انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی حمید اللہ سے ملنے آیا۔ حمید اللہ اسے ساتھ لے کر اپنی خواب گاہ میں آگیا اور دروازہ اندر سے بند کرکے رازدارانہ باتیں کرنے لگا۔ اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ "وہ کام" رات کو ہوجائے گا۔ اسے چاہیے کہ صبح وہ اپنے لوگوں سے پروگرام کے دوسرے حصے پر شدت سے عمل کرائے۔ اس کام کے لیے مجسٹریٹ نے حمید اللہ کو کچھ رقم بھی دی تاکہ ایجنٹوں کو ان کے کام کا معاوضہ دیا جاسکے۔ پھر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے معلوم کیا کہ ملتان آنے والے اجنبیوں کے متعلق کوئی رپورٹ ملی یا نہیں؟ حمید اللہ نے اس کا جواب نفی میں دیا' ساتھ ہی اس

نے انجمن وطن پرست کی طرف سے ملنے والا خط بھی مجسٹریٹ کے حوالے کردیا جو اسے ملا تھا۔ پھر اس خط پر دونوں میں تبادلہ خیال ہوا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بتایا کہ انجمن وطن پرست کے متعلق یوپی گورنمنٹ کی طرف سے ایک اطلاع آئی تھی۔ وہاں ایک موقع پر اس تنظیم کا نام سننے میں آیا ہے۔ مرکزی حکومت نے تمام صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی ہے کہ اگر اس انجمن یا تنظیم کی سرگرمیوں کی کہیں کوئی اطلاع ملے تو مرکز کو فوراً اس سے آگاہ کیا جائے۔ شاید وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ تنظیم ہندوستان میں کہاں کہاں سرگرم عمل ہے۔ اس کے بعد ان دونوں میں کچھ اور رسمی باتیں ہوئیں۔ اسی عرصے میں ایک نام سن کر میں تقریباً اچھل پڑا۔ وہ نام کیتھی کا تھا' وہی کیتھی جس سے میری ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ خان بہادر حمید اللہ جب کیتھی کا ذکر کر رہا تھا تو اس کی آواز میں عجیب سی للچائی ہوئی کیفیت تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے اپنے سامنے ہڈی پڑی دیکھ کر کتا اپنے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکالتا ہے اور پھر اس کی رال بہنے لگتی ہے۔ خان بہادر حمید اللہ نے انگریزی مجسٹریٹ کو بتایا تھا کہ گزشتہ دنوں لاہور میں کیتھی نے بھی اسے "شرف ملاقات" بخشا تھا۔ مجسٹریٹ بھی اپنی ہم وطن سے واقف معلوم ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ حمید اللہ کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ پھر اس ذکر کے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور حمید اللہ وہاں سے چلے گئے۔

میں اس کے بعد کچھ نہ سن سکا۔ حمید اللہ اب باہر لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ جس جگہ میں چھپا ہوا تھا وہاں تک لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کے مانند پہنچ رہی تھیں۔ سخت گرمی کی وجہ سے اور پسینے کے مارے میرا برا حال تھا۔ میرا اور بخت خاں کا اندازہ تھا کہ شاید ہمیں اپنا اصل کام کرنے کا موقع رات کو بارہ بجے تک ملے گا۔ اس وقت تک ہمیں اپنی جگہ دم سادھے بیٹھا رہنا ہوگا۔

میں سوچ رہا تھا کہ آخر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جس کام کی طرف اشارہ کیا تھا اس کی نوعیت کیا ہوگی۔ اس کام کا دوسرا حصہ کیا ہوسکتا ہے جسے انجام دینے کے لیے حمید اللہ کو رقم دی گئی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ انگریز مجسٹریٹ نے کوئی گھناؤنا کام لینے ہی کے لیے حمید اللہ کو رقم دی تھی۔

جو کچھ ہونے والا تھا اسی رات ہونے والا تھا۔ اس کا توڑ کرنے کے لیے ہمارے پاس وہی رات تھی' مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ ہمیں معلوم ہوتا کیا ہونے والا ہے۔ یہ معلوم کرنے کا میرے پاس صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ ذریعہ تھا حمید اللہ!

پھر میرے ذہن میں جوگیندر کا خیال آیا۔ اسے اس وقت رام مورتی کے یہاں ہونا چاہیے تھا۔ کسی طرح وشنو کمار تک پہنچ کر اسے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ اس وقت ملتان کیوں آیا ہے؟ گنگا پرشاد اور ستیش کا کہنا یہ تھا کہ ان دونوں لیجسلیٹو کے اراکین کا وہاں پہنچنا خالی از علت نہیں تھا۔ تو کیا جوگیندر کو بھی سازش کا کچھ علم ہوگیا ہوگا؟ میں سوچتا رہا۔

گھنٹے نے بارہ بجائے اور پھر لمحے "ٹک ٹک" کرتے ہوئے گزرتے رہے۔ ساڑھے بارہ بجے تو حمید اللہ خدا خدا کرکے واپس آیا۔ فضا میں الو کی چیخ گونجی۔ یہ اشارہ تھا امداد آنے کا۔ آواز کافی دور سے آئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ جوگیندر وہاں پہنچ چکا تھا۔ جواب میں بلی کی میاؤں کی صدا گونجی تھی۔ یہ قریب کی آواز تھی۔ یقیناً بخت خاں نے جوگیندر کو مطلع کیا تھا کہ وہ اس کے پاس پہنچ رہا تھا۔

جوگیندر یقیناً اپنا کام ختم کرکے واپس آگیا تھا۔ میں اپنی جگہ چوکنا ہوگیا۔ حمید اللہ لباس تبدیل کرکے مسہری پر لیٹ چکا تھا۔ میں انتہائی آہستگی اور احتیاط کے ساتھ رینگ کر مسہری کے نیچے سے نکلا اور ایک دم کھڑے ہوکر حمید اللہ سے کہا "آواز نکالی تو گولی ماردوں گا' خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ جاؤ!"

"تت۔ تم کون ہو؟" حمید اللہ نے ہکلاتے ہوئے کہا' ساتھ ہی وہ مسہری پر اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ میں اسے گھورتا رہا تو اس پر مزید خوف کا اثر ظاہر ہوا۔

"انجمن وطن پرست۔" میں نے آخرکار جواب دیا "تم ہماری ہی تلاش میں تھے نا؟"

"تم۔ مگر تم یہاں کس طرح۔ کیسے پہنچ۔" وہ پھر ہکلانے لگا شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے!

"میں یہاں اپنی مرضی سے پہنچا ہوں' مگر فی الحال تو تمہیں میرے سوالوں کے جواب دینے ہیں! یہ بتاؤ کہ تمہیں ہماری تلاش کیوں ہے؟"

"حکومت۔ حکومت کا حکم ہے۔" حمید اللہ بولا۔

"تو تم حکومت کے وفادار ہو' انگریز کے غلام! تم اس ملک اور اس ملک کے باشندوں کے دشمن ہو' کیوں!" میں نے اس بار اپنا لہجہ سخت کرلیا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ایسا نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔"

"جھوٹ مت بولو خان بہادر! تم تو اس وقت بہادر کی

بجائے بھیگے ہوئے چوہے دکھائی دے رہے ہو!" میرے لہجے میں کاٹ تھی "مجھے اپنے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب چاہئیں! مجھے بہت کچھ معلوم ہے سمجھے! اگر تم نے میرے کسی سوال کا غلط جواب دیا تو میں تمہیں گولی مارنے سے دریغ نہیں کروں گا! تمہیں جہنم میں پہنچاتے ہوئے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔" میں نے پستول کو جنبش دی "میں اب تم سے چند سوال کروں گا' اس کے بعد تین تک گنوں گا۔ تم نے گنتی پوری ہونے تک میرے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا تو گولی ماردوں گا۔ تم نے غلط جواب دیا تو بھی میں یہی سمجھوں گا کہ تم مرنا چاہتے ہو۔ سمجھے! جواب دو کہ کیا تمہارے پاس انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ آیا تھا؟" اس سوال سے میں اس کے جھوٹ اور سچ کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اس نے فوراً اقرار کرلیا تو میں نے دوسرا سوال کیا "اسے تم نے کام کے بارے میں کیا رپورٹ دی تھی؟" کیوں کہ اس نے فوراً اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا اس لیے میں نے گننا شروع کیا "ایک۔ دو"

"آج رات کام ہوجائے گا" وہ بول اٹھا "یہی رپورٹ دی تھی میں نے۔"

"فرقہ وارانہ فسادات کیسے شروع ہوں گے یہاں؟"

میں نے اندھیرے میں تیر پھینکا اور گنتی شروع کردی۔

اس کے حلق میں جیسے نوالہ اٹک گیا "ج۔ ج۔ ج۔ فسادات ہندوؤں پر حملے سے۔" حمید اللہ نے جواب میں کہا۔

"اس کام کے لیے تم نے کن لوگوں کو خریدا ہے؟ جواب صحیح دینا!"

"میں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ۔ کہ میں نے کسی کو نہیں خریدا۔"

"جھوٹ مت بولو حمید اللہ! تم آخر کیوں مرنا چاہتے ہو!" میں نے اس کی بات کاٹ دی "تمہارا لہجہ بتارہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

حمید اللہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں کو چبانے لگا۔ اس کا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

"یہ ایک مجرم کا چہرہ ہے' ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ!" میں نے ریوالور کی نال اس کے چہرے کی طرف اٹھائی "اگر تم جھوٹے نہیں ہو تو بتاؤ اس سفید کتے نے تمہیں کس لیے رقم دی تھی؟ میں ابھی تمہیں بتاچکا ہوں کہ ہمیں انگریزوں اور ان کے پٹھوؤں کے بارے میں اور یہاں ہونے والی سازشوں کے متعلق سب کچھ معلوم ہے۔ پھر بھی تم جھوٹ بولنے کی کوشش کررہے ہو! مجھے حکم ہے کہ تمہیں قتل کردیا جائے لیکن مجھے یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ اگر تم

تعاون کرو اور ٹھیک ٹھیک جواب دو تو تمہاری جان بخش دوں۔ بتاؤ تم نے کس کو اس کام پر مامور کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس شہر میں ہندو مسلم فساد کرانے کے لیے تم نے اپنے جیسے ضمیر فروشوں ہی کو خریدا ہوگا۔" یہ کہتے ہی میں نے گنتی شروع کی۔

"بوتا خاں کو" حمید اللہ کو جواب دینا ہی پڑا۔

اسی وقت باہر سے کتے کے بچے کی "تیاؤں تیاؤں" ابھری۔ یہ گویا خطرہ قریب آجانے کا اشارہ تھا۔ مطلب یہ تھا کہ پولیس یا فوج سر پر آپہنچی ہے۔ میں یہ اشارہ پاکر چونک اٹھا۔ میں نے حمید اللہ کو مخاطب کیا "اب تم اس کونے میں دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوجاؤ' دائیں بائیں دیکھنے یا منہ سے کسی بھی قسم کی آواز نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

حمید اللہ اٹھ کر کونے میں دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑا ہوگیا۔ "تم پانچ منٹ تک یہاں اسی طرح خاموشی سے کھڑے رہوگے' خواہ کچھ ہو آواز نہیں نکالوگے۔ اگر تم نے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی یا شور مچایا تو اوپر روشندان میں میرا ساتھی بیٹھا ہے' اس کے پستول کی گولی تمہیں جہنم کی سیر کرادے گی۔" میں نے اسے دھمکی دی اور بے آہستگی کمرے سے نکل آیا' پھر دوسرے کمرے میں داخل ہوکر باغ میں کھلنے والے دروازے کے پاس آگیا۔

دوسری طرف کئی افراد کے قدموں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ میں دھیرے سے دروازہ کھول کر باہر آگیا اور تیزی سے لپک کر سامنے درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گیا جہاں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ابھی میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ ایک درخت کی آڑ سے آواز آئی "ادھر آجاؤ" یہ آواز بخت خاں کی تھی۔

"جوگیندر کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہاں سے جلدی چلو!" میرے سوال کو بخت خاں نے نظر انداز کردیا تھا۔

درختوں اور پودوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم ڈاک بنگلے کی دیوار تک پہنچ گئے' پھر ایک درخت پر چڑھنے کے بعد موٹی سی ایک شاخ سے اچھل کر دیوار کے پار زمین پر چھلانگ لگادی۔ اسی وقت ڈاک بنگلے کی طرف سے شور اور چیخ پکار کی آوازیں سنائی دیں۔

"جوگیندر کہاں ہے؟" میں نے پھر بخت خاں سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کے کوارٹر پر پولیس نے چھاپا مارا ہے۔ گنگا پرشاد کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔"

"تو سیتا اور حیدر علی؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ دونوں گنگا پرشاد ہی کے کوارٹر میں تھے۔ ٹیپو اور ستیش' جوگیندر کے ساتھ رام مورتی کی کوٹھی پر گئے تھے۔ جس طرح بخت خاں میرے ساتھ تھا اسی طرح جوگیندر کے ساتھ میں نے ٹیپو کو کردیا تھا۔ ستیش نے خود اس معرکے میں شامل ہونے کی درخواست کی تھی۔ میں نے اسے بھی جوگیندر ہی کے ساتھ کردیا تھا۔ زیادہ بھیڑ بھڑکا نہ ہو' اس خیال سے حیدر علی اور سیتا کو ہم نے کوارٹر ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ گنگا پرشاد نے اپنے بیوی بچوں کو اپنی سسرال بھیج دیا تھا۔ اس سے پہلے ہی جب ہم ہوشیدی کے گھر سے کوارٹر میں منتقل ہوئے تھے۔ گنگا پرشاد کے بیوی بچے وہاں سے جاچکے تھے۔ بخت خاں کی اطلاع کے مطابق ماسٹر گنگا پرشاد پکڑا گیا تھا۔ اس کا مطلب میرے نزدیک یہی تھا کہ سیتا اور حیدر علی بھی گرفتار کرلیے گئے ہوں گے' میں اسی لیے گھبرا گیا تھا۔ بخت خاں نے جب میرے سوال کے جواب میں یہ بتایا کہ سیتا اور حیدر علی محفوظ ہیں تو میری جان میں جان آئی۔

ہوا یہ تھا کہ ستیش' رام مورتی کی کوٹھی کے باہر ایک درخت پر چڑھا ہوا تھا۔ جوگیندر اور ٹیپو کوٹھی کے عقبی حصے میں داخل ہوگئے تھے۔ ستیش نے وہاں رام مورتی کی کوٹھی میں داخل ہوتے پولیس کے ایک دستے کو دیکھا' پھر کچھ ہی دیر کے بعد اس نے ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کو پولیس کی حراست میں رام مورتی کی کوٹھی سے جاتے دیکھا۔ گنگا پرشاد کو کب رام مورتی کی کوٹھی میں بلایا گیا تھا۔ ستیش کو علم نہیں تھا۔ ستیش کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا کہ گنگا پرشاد کو کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ پیڑ سے اتر کر سیدھا دوڑتا ہوا ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کے کوارٹر پہنچا۔ حیدر علی اور سیتا وہاں موجود تھے۔ خطرے کی بو سونگھ کر بہ طور احتیاط اس نے حیدر علی اور سیتا کو ایک ہی جگہ رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ حیدر علی کو اس نے اپنے ایک دوست کے گھر چھپادیا اور سیتا کو اپنے گھر لے گیا۔ اس کا مکان ریلوے اسٹیشن کے پاس ہی تھا۔ سیتا کو اپنے کوارٹر میں چھوڑ کر ستیش نے بخت خاں کو خطرے سے مطلع کیا۔ میں نے جوگیندر سمجھا تھا وہ ستیش تھا۔ بخت خاں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے بعد ستیش اب پھر رام مورتی کی کوٹھی کی طرف گیا تھا کہ ٹیپو اور جوگیندر کو بھی نئی افتاد سے مطلع کرسکے۔ سیتا ہی نے ستیش کو الو کی آواز کا اشارہ بتایا تھا۔

بخت خاں سے سب کچھ جاننے کے بعد میں فکرمند ہوگیا۔ ملتان میں ایک بار پھر ہم سب بے ٹھکانا ہوگئے تھے۔

"تو پھر اب ہم کہاں جارہے ہیں بخت خاں؟" میں نے دریافت کیا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔

"ہم ستیش کے گھر ہی چل رہے ہیں۔" بخت خاں نے جواب دیا "اس نے مجھے پتا سمجھادیا ہے' بالکل آسان ہے وہ بھی اپنے کوارٹر میں اکیلا ہی رہتا ہے۔" یہ کہہ کر بخت خاں نے مجھے بھی ستیش کے کوارٹر کا محل وقوع بتایا۔

"تم رام مورتی کی کوٹھی چلے جاؤ بخت خاں! وہاں معاملات کو دیکھو۔ میں ستیش کے گھر جاتا ہوں اور سیتا سے ملتا ہوں۔ ادھر سے مطمئن ہوکر وہاں سیتا کے لیے کوئی خطرہ نہیں' میں بھی رام مورتی ہی کی کوٹھی پہنچتا ہوں۔ مجھے زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ گھنٹا لگے گا۔ اچھا خدا حافظ۔"

میں اور بخت خاں علیحدہ ہوگئے۔ اچانک حالات نے جو نئی کروٹ لی تھی اس سے میرا ذہن پریشان ہوگیا تھا۔ مختلف اندیشوں اور خطرات نے مجھے گھیر لیا تھا۔ ان میں سب سے بدترین اندیشہ یہ تھا کہ کہیں ہم نے ستیش پر اعتماد کرکے غلطی تو نہیں کی؟ اس معاملے میں جو بات اس کی مخالفت میں تھی وہی اس کے حق میں بھی تھی۔ اگر وہ ہمارا مخالف تھا تو اس نے عین اس وقت ہمیں کیوں خبردار کیا تھا جب پولیس حرکت میں آچکی تھی؟ یہ بات اس کے حق میں تھی کہ وہ ہمارا مخالف نہیں تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ڈاک بنگلے محض یہ دیکھنے آیا ہو کہ ہم پھنس چکے ہیں یا نہیں۔

بہرحال میں چوکنا تھا۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ الگ تھلگ بنے ہوئے اس واحد کوارٹر کے پاس پہنچ چکا تھا۔ جہاں ستیش کی اطلاع کے مطابق اس وقت سیتا کو موجود ہونا تھا۔ سبز گھاس سے بھرے ہوئے اس میدان میں' میں پیٹ کے بل کھسکتا ہوا اس کوارٹر کا چکر لگاچکا تھا۔ ماحول پرسکون تھا خطرے کے احساس نے میری ساری حسیں بیدار کردی تھیں۔ مطمئن ہونے کے بعد بھی میں نے بہ طور احتیاط کوارٹر کی دیوار کے قریب پہنچ کر منہ سے کوئل کی آواز نکالی۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے اس اشارے کا جواب کوئل ہی کی آواز میں مل گیا۔ اندر سیتا موجود تھی۔ کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ستیش کے بارے میں میرے اندیشے غلط تھے۔ میں چوکنے انداز میں چلتا ہوا دروازے کے پاس پہنچا اور آہستہ سے دستک دی "سیتا!" میں نے دروازے کے قریب منہ لے جاکر سرگوشی کی۔ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی سیتا ہی تھی۔ ایک کمرے کے اس کوارٹر میں لالٹین بڑے اداس انداز میں پیلی پیلی زرد روشنی بکھیر رہی تھی۔

"شاہین!" سیتا یہ کہتے ہوئے میرے سینے سے لگ گئی۔

اس وقت وہ بُری طرح کپکپا رہی تھی "میتا کہاں ہیں؟"

"سیتا'۔ میری سیتا! حوصلے سے کام لو تم ایک وطن پرست لڑکی ہو۔"

سیتا سے مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا جو بخت خاں سے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ ستیش ایک وفادار اور مخلص وطن پرست تھا۔ پھر بھی اس وقت کوئی مزید خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ مجھے فوری طور پر رام مورتی کی کوٹھی پہنچنا تھا۔ وہاں کے حالات پتا کرنے تھے اور جوگیندر کا سُراغ لگانا تھا کہ اس پر اور نیپو پر کیا گزری؟ اس وقت مجھے خود پر بہت غصہ آیا جب میں نے سوچا کہ جلدی میں ایک ضروری بات کیوں بھول گیا؟ مجھے بخت خاں سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ وہ فوراً ستیش سے رابطہ قائم کر کے اسے یہ معلوم کرنے بھیج دے کہ ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کے بارے میں پولیس کو کس نے اطلاع دی تھی؟ یہ سوچتے ہوئے مجھے ایک مرتبہ پھر خطرے کا احساس ہوا۔ گنگا پرشاد کے بارے میں پولیس کو جس نے بھی اطلاع دی ہو گی وہ ستیش کو بھی جانتا ہو گا۔ اس وقت میں اور سیتا' ستیش ہی کے کوارٹر میں تھے۔ ستیش کی تلاش میں پولیس یہاں تک بھی پہنچ سکتی تھی۔

"سیتا جلدی کرو' یہاں سے فوراً نکل چلو۔" میں نے بے تابی سے کہا۔ اب میں یہاں اس پنجرے میں ایک پل کے لیے بھی نہیں رہنا چاہتا تھا۔

ہم وہاں سے نکل آئے مگر سوال یہ تھا کہ ہم رات کہاں گزاریں؟ سیتا کو کہاں چھوڑا جائے؟ بخت خاں اور جوگیندر کے پاس بھی پہنچنا ضروری تھا۔ پھر یہ مسئلہ بھی تھا کہ رات کے وقت میرا اور سیتا کا سڑکوں پر نکلنا بھی ہمیں مشتبہ بنا سکتا تھا۔ پھر میں نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ یہ بات اچانک ہی میرے ذہن میں آئی تھی۔

سیتا کو ساتھ لیے ہوئے میں پھر ڈاک بنگلے پر پہنچ گیا جو آبادی سے الگ تھلگ واقع تھا۔ ڈاک بنگلے کی اطراف باغ تھا' آس پاس کوئی اور عمارت بھی نہیں تھی۔ ہم اندھیرے میں تیز قدمی سے چلتے ہوئے ڈاک بنگلے کے احاطے کی عقبی دیوار سے قریب ہو چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس اب تک پورے باغ کو چھان چکی ہو گی اور میری تلاش سے مایوس ہو کر وہاں سے جا چکی ہو گی۔ یہ بہرحال ایک قیاس ہی تھا۔ میں راستے ہی میں سیتا کو بتا چکا تھا کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔

اس مرتبہ میں نے پھر اسی درخت کو دیوار پھلانگنے کا ذریعہ بنایا جس کے سہارے ہم پہلے بھی فرار ہو چکے تھے۔ دیوار پر جھکے ہوئے گدے میں رسّی ڈال کر اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گرہیں لگانے کے بعد میں نے سیتا کو درخت پر چڑھایا پھر خود چڑھا اور رسّی کھول کر سیتا کے ساتھ احاطے کے اندر کود گیا۔

ڈاک بنگلا تاریک پڑا تھا۔ شاید خان بہادر حمید اللہ کو وہاں سے منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد حمید اللہ کا وہاں رُکنا بعید از فہم ہی تھا۔ میں دل ہی دل میں ان لوگوں کی کم ہمتی پر ہنسا لیکن اس وقت ان کی یہی کم ہمتی ہمارے لیے پناہ کا سبب بننے والی تھی۔

ڈاک بنگلے کے ملازمین کے کوارٹر اصل عمارت سے تھوڑے فاصلے پر احاطے کی اس دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تھے جو دوسری طرف تھی۔

سیتا کو درختوں کے ایک جھنڈ میں چھوڑ کر میں نے دونوں پہلوؤں سے اس طرف کا جائزہ لیا جہاں ملازمین کے کوارٹر تھے۔ وہاں اب بھی دو ملازم کھڑے ہوئے ان واقعات پر گفتگو کر رہے تھے جو کوئی پون گھنٹے قبل وہاں پیش آئے تھے۔ ان کی باتوں سے میرے اس خیال کی بھی تصدیق ہو گئی کہ حمید اللہ وہاں سے جا چکا ہے اور ڈاک بنگلا بالکل خالی ہے۔ پھر وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اپنے اپنے کوارٹروں میں چلے گئے۔

میں واپس جا کر سیتا کو اپنے ساتھ لے آیا۔ ایک بڑا سا گملا برآمدے کے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ میں نے سیتا کو کاندھوں پر سوار کیا اور اس گملے پر چڑھ گیا۔ پھر سیتا کو برآمدے کی چھت پر چڑھا دیا۔ جہاں سے وہ کمروں کی چھتوں پر آسانی سے پہنچ سکتی تھی۔

"اچھا سیتا" میں نے آہستہ سے کہا "رات ختم ہونے سے پہلے ہی میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔"

وہ برآمدے کی چھت پر سینے کے بل لیٹی ہوئی تھی "میں تمہارا انتظار کروں گی۔" اس نے ہاتھ لٹکایا اور میں نے اس کی انگلیوں کو چوم لیا۔

"جوگیندر بھی میرے ساتھ ہو گا۔" میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا۔

اس نے میرے ہاتھ کو کھینچ کر اپنے لبوں سے لگا لیا اور کہا "میں تمہیں جانتی ہوں میرے دیوتا!" اس کی آنکھوں کی نمی میری انگلیوں کو بھگو گئی۔ اس کے لہجے کی لرزش میرے دل میں کانٹا بن کر اُتر گئی "میں تم پر بوجھ بن گئی ہوں۔"

"نہیں۔ تمہاری تربیت ہو رہی ہے اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

جس وقت میں وہاں سے چلا۔ دور اسٹیشن پر سے لائن پار میں نے آگ کے شعلوں کو آسمان کی طرف لپکتے دیکھا۔ بہت دور میدان میں جیسے کسی نے الاؤ سا بھڑکا دیا تھا۔ میں بہت تیزی سے رام مورتی کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ میری اور میرے ساتھیوں کی کوشش تھی کہ ملتان کو اس آگ میں بھسم ہونے سے بچایا جائے جو انگریز اور اس کے پٹھو بھڑکانے پر تُلے ہوئے تھے۔ میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ اس وقت میں نے کہیں دور سے ایسا شور بھی اُٹھتے سنا جیسے بہت بڑا مجمع نعرے لگا رہا ہو۔

رام مورتی کی کوٹھی میں بلب روشن تھے۔ وہاں ایک عجیب سی پُراسرار سرگرمی کا احساس ہوتا تھا۔ دو افراد برآمدے میں کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اندر کمروں میں بھی چھ افراد بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ گیٹ پر مسلح پولیس والے موجود تھے۔ میں نے ایک گھنے درخت کی آڑ لے رکھی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ بخت خاں اور ستیش اس وقت کہاں ہوں گے۔ ویسے کوٹھی کی اس سمت جہاں میں کھڑا تھا۔ وہ یقیناً نہیں تھے کیوں کہ میں دو مرتبہ کوئل کی آواز نکال چکا تھا۔ یہ آواز اتنی بلند تھی کہ آس پاس کے درختوں تک ضرور پہنچ سکتی تھی۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ فضا میں دور سے ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں نعروں کی تھیں اور دور آسمان پر سُرخی موجود تھی۔ جیسے کوئی بہت بڑا انگارا اپنی سُرخ سُرخ روشنی بکھیر رہا ہو۔

ایک لمبا چکر کاٹ کر میں کوٹھی کی دوسری سمت پہنچا۔ یہاں درخت زیادہ بھی تھے اور گھنے بھی۔ چھپنے کے لیے اس سے بہتر مقام اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ یہاں سے کوٹھی کا بڑا حصہ نظر آتا تھا۔ میں ادھر پہنچا ہی تھا کہ میں نے مخصوص اشارہ سُنا۔ چند لمحوں بعد ہی میں اس درخت پر موجود تھا جہاں بخت خاں نے ڈیرا جما رکھا تھا۔

"ستیش کہاں ہے؟" میں نے بخت خاں سے پوچھا۔

"یہاں آ کر میں نے اسے بھیج دیا تھا۔ شاید میں نے اسے وہاں بھیج کر غلطی کی ہے۔" بخت خاں بولا۔

"کہاں بھیجا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اسے میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ پولیس' ماسٹر گنگا پرشاد تک کس طرح پہنچی اور یہ بھی معلوم کرانے کے لیے کہ کیا جوگیندر بھی پولیس کے ہاتھے تو نہیں چڑھ گیا ہے۔" بخت خاں نے میرے سوال کا جواب دیا "میرا مطلب یہ ہے کہ کہیں جوگیندر اور نیپو بھی تو یہاں پولیس کی نظر میں نہیں آ گئے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔ ویسے کیا جوگیندر اور نیپو کے بارے میں کچھ علم نہیں ہو سکا؟ ان دونوں کو تو یہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"ہاں ہونا تو چاہیے تھا اور وہ یہاں ہیں بھی شاید۔" بخت خاں کے لہجے سے تذبذب کا اظہار ہو رہا تھا "یقینی طور پر بہرحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ستیش کے جاتے ہی میں نے یہ سوچ کر شاید جوگیندر اور نیپو کوٹھی کے عقبی حصے میں ہوں میں ادھر آیا تھا وہاں مجھے اپنے اشارے کا جواب مل گیا تھا۔"

"تو پھر تم یہاں کیوں ہو؟" میں نے کہا۔

"دراصل طے یہی ہوا تھا کہ وہ دونوں کوٹھی کی اسی سمت ستیش سے آ کر ملیں گے۔" بخت خاں نے جواب دیا "میں اسی لیے یہاں سے نہیں ہٹا۔"

"ٹھیک ہے' تم یہیں رہو میں پیچھے جاتا ہوں۔ ویسے ستیش کب تک واپس آئے گا؟"

"اسے اب تک آ جانا چاہیے تھا۔" بخت خاں نے بتایا۔

پھر بخت خاں کو میں نے سیتا کے بارے میں بتایا اور اسے اپنے ان خدشات سے بھی آگاہ کیا جن کی بنا پر میں نے یہ اقدام کیا تھا۔

کوٹھی کی عقبی سمت جانے کے لیے میں درخت سے اُترنے ہی والا تھا کہ پانچ چھ افراد بہت تیز تیز چلتے اور باتیں کرتے ہوئے کوٹھی کی سمت بڑھتے نظر آئے۔ وہ مشتعل دکھائی دے رہے تھے۔ خاصی دور ہونے کے باوجود ان کی تیز آوازیں' رات کے سنّاٹے کی وجہ سے ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ان کی باتوں کے چند الفاظ میں نے بھی سن لیے "مندر ۔ آگ ۔ مندر آگ ۔"

"اف میرے خدا!" میں بڑبڑایا "تو کیا وہ کامیاب ہو گئے۔ بخت خاں ہماری تمام تگ و دو شاید بے سود ہی ثابت ہوئی۔"

"کیوں' کیا ہوا؟" بخت خاں یقیناً اس نتیجے تک نہیں پہنچ سکا تھا جس پر میں پہنچ گیا تھا ورنہ وہ سوال نہ کرتا۔

"کسی مندر کو آگ لگوا دی گئی ہے۔ اس کے بعد یہاں کیا کچھ ہو گا۔ اس کا اندازہ تم لگا ہی سکتے ہو۔ اچھا تم ٹھہرو یہیں' میں چلا۔"

کوٹھی کے عقبی حصے میں آ کر بھی میں ایک درخت پر چڑھ گیا۔ یہ درخت' دیوار سے خاصا دور تھا لیکن اس کا ایک مضبوط گدا دیوار تک گیا تھا اور اس کی شاخیں اندر احاطے

میں سایہ کیے ہوئے تھیں۔ میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا دیوار کی طرف جانے والے گدے پر جس حد تک جاسکتا تھا چلا گیا۔

عقبی حصے میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کوئی شے حرکت نہیں کررہی تھی۔ میں نے کوئل کی آواز نکالی۔ اس اشارے کا جواب فوراً ہی دائیں طرف کے گوشے سے آیا جہاں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں گھنی جھاڑیاں ہیں یا پودے لگے ہوئے ہیں۔

پھر میں نے اسی طرف ہلکی سی سرسراہٹ محسوس کی جیسے کوئی جھاڑیوں سے گزر کر آگے بڑھ رہا ہو۔ پھر میں نے ایک سائے کو درخت کی سمت آتے دیکھا۔ وہ سایہ درخت کے پاس آکر دیوار کی اوٹ میں ہوگیا تھا۔

"جوگیندر" میں نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

"شاہین! تم جاؤ۔" جوگیندر کی ہلکی سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"وقت بہت کم ہے۔" میں پھر بولا "میری مدد کی ضرورت ہے۔"

"تم جاؤ!" اس کی آواز آئی "ستیش کے پاس ملنا! ٹیپو میرے ساتھ ہی رہے گا۔"

کچھ ہی دیر میں دوبارہ میں اس پیڑ پر پہنچ گیا جس پر بخت خاں چڑھا ہوا تھا۔ اسی وقت مجھے ایک اور خیال آیا کہ ابھی تو بوٹا خاں کا پتا چلانا ہے جسے خاں بہادر حمید اللہ نے ہندو مسلم فساد کی آگ بھڑکانے کا کام سونپا تھا۔ ستیش واپس آگیا تھا اور اس کی فراہم کردہ اطلاعات بہت خوف ناک تھیں۔ کوئی ایک گھنٹے قبل ملتان کی ایک نواحی آبادی سے پانچ مسلمان کسانوں کے قتل کی خبر ملتان پہنچی تھی۔ اس خبر کے ساتھ خون میں بھیگی ہوئی دو قمیصیں بھی ملتان میں کسانوں کے ایک مسلمان زمیندار کے پاس پہنچی تھیں۔ دوسری طرف ملتان میں ایک قدیم خستہ حال مندر کو نذر آتش کروایا گیا تھا۔ وہ سرخی جو میں نے دیکھی تھی اسی آگ کی تھی اور ہوا کے ساتھ آنے والی شور کی آواز مسلمان دیہی باشندوں کے نعروں کی تھی۔

"یہ کیسے وحشی درندے ہیں۔ جنہوں نے انسانوں کی شکل اختیار کرلی ہے!" میں نے تاسف سے ہاتھ ملے "اور ہاں یہ پتا چلا کہ ماسٹر گنگا پرشاد کے بارے میں پولیس سے کس نے مخبری کی تھی؟"

"میرے ایک دوست نما دشمن نے۔" ستیش نے بڑے دکھ سے کہا "مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ آپ نے سیتا دیوی کو میرے کوارٹر سے کہیں اور منتقل کردیا ہے۔ وہاں گیا تھا' سیتا دیوی موجود نہیں تھیں تو مجھے حیرت بھی اور پریشانی بھی۔ بخت خاں نے بتایا تو میری جان میں جان آئی۔"

"اب تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے ستیش؟" میں نے اس سے سوال کیا "تم یہاں رہتے ہو اور اس شہر کا مزاج کو ہم سے بہتر سمجھتے ہو۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آرہا۔" ستیش نے بے بسی کا اظہار کردیا۔

"یہ بوٹا خاں کون ہے جانتے ہو؟" میں نے دریافت کیا "کیا وہ شہر ہی میں رہتا ہے؟ یا کسی نواحی آبادی کا بندہ ہے؟ میرے خیال میں اسے گمنام نہیں ہونا چاہیے۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے وہ گمنام بندہ نہیں ہے" ستیش بتانے لگا "بوٹا خاں ملتان شہر کا مشہور و معروف بدمعاش ہے کیوں' کوئی خاص بات؟"

"جو کچھ ہونے والا ہے اس میں بوٹا خاں کا بہت بڑا ہاتھ ہوگا۔ کیا تم بتاسکتے ہو کہ وہ کہاں مل سکے گا؟" میں نے کہا۔

"بوٹا خاں کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں لیکن وہ عموماً اندرون حرم ہی کے علاقے میں ملتا ہے۔" ستیش نے جواب دیا پھر پوچھنے لگا "کیا ہونے والا ہے؟"

"وہی سب کچھ جس کے خلاف ہم جدوجہد کررہے ہیں۔"

میری بات پوری ہوئی کہ بخت خاں نے "شش" کرکے ہمیں چپ ہوجانے کا اشارہ کیا۔

رام مورتی کے یہاں جو لوگ جمع تھے وہ گویا اب رخصت ہورہے تھے۔ لوگ رخصت ہوتے گئے اور رات کا سناٹا مزید گہرا ہوگیا۔ رام مورتی اور رائے بہادر وشنو کمار لوگوں کو رخصت کرکے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں کوٹھی کی تیز بتیاں ایک ایک کرکے بجھ گئیں۔ اب صرف کم روشنی کے چند بلب ایک سوگوار سا تاثر پیدا کررہے تھے۔

وقت گزر رہا تھا اور جوگیندر اب تک ہمارے پاس نہیں پہنچا تھا۔ وہ کیوں رکا ہوا ہے؟ آخر کیا کرنا چاہتا ہے؟ میرے خیالات ایک مرتبہ پھر جوگیندر کی ذات پر مرکوز ہوگئے۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد کوٹھی کے ایک کمرے میں روشنی ہوئی۔ اس کے چند منٹ بعد جوگیندر اور ٹیپو' دونوں ہی ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ہم سب تیزی کے ساتھ وہاں سے لپک لیے۔ اب ہم جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتے تھے۔

○☆○

ہماری ملتان کی مہم قطعی ناکام رہی۔ ٹھیک اس وقت جب ہم کامیابی کے قریب تھے۔ انگریز نے اپنے شاطرانہ ذہن سے وہ چال چلی جو ہر فراست اور فرزانگی کو جنون اور دیوانگی میں بدل سکتی تھی۔ ہم نے اپنی کوششوں سے ملتان کے باشندوں میں محبت' اخوت اور بھائی چارے کے جو جذبات بیدار کیے تھے وہ انگریز کی ایک غیر انسانی' وحشیانہ اور مکروہ چال سے نفرتوں اور عداوتوں میں تبدیل ہوکر رہ گئے تھے۔

وہ رات اور اس کے بعد تین دن ہم نے ستیش کے اسی دوست کے گھر گزارے تھے جہاں حیدر علی کو اس نے چھپایا تھا۔ ستیش کا یہ دوست بھی ریلوے میں ملازم تھا اور مسلمان تھا۔ میں اور جوگیندر اسی رات سیتا کو ڈاک بنگلے سے لے آئے تھے۔ میں نے جوگیندر سے کہا تھا کہ ہمیں آخری کوشش کرلینا چاہیے تو وہ بولا تھا "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہم نے جو کچھ کیا تھا وہ تباہ ہوچکا ہے۔" پھر بھی میں نہ مانا۔ میں نے علی حمزہ کے بھائی سے ملاقات کی تھی اور پھر اسی کے توسط سے بااثر مسلمان زمینداروں سے ملا تھا۔ لیکن میں انہیں نہیں سمجھا سکا تھا۔ پانچ دیہی باشندوں کے قتل کی خبر کوئی معمولی نہ تھی۔ انہیں ملتان کے قریب ہی ایک گاؤں میں قتل کیا گیا تھا۔ افواہ یہ تھی کہ انہیں ہندوؤں نے مارا تھا اور پھر اس گاؤں کے باشندوں نے دو خون آلود قمیصیں ملتان بھیجی تھیں۔ یہ قمیصیں بھیجنا ایک پیغام تھا۔ ان قمیصوں میں جو خون جذب ہوا تھا وہ اپنا خراج مانگ رہا تھا۔ دیہی باشندوں کے جذبات کیا تھے۔ اب ملتان شہر کے مسلمان پر فرض تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ ہندوؤں سے لیں۔

میں نے آخری مرتبہ انہیں سمجھایا کہ یہ سب انگریز کی چال ہے۔ دیہی باشندوں کو انگریزوں نے قتل کیا ہوگا اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعے خون آلود قمیص یہاں بھجوائی ہوں گی۔ میں نے انہیں بتایا کہ انگریز نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑوانے کے لیے کیا ترکیبیں کی ہیں۔ کیا اسکیم بنائی ہے مگر میری ان گزارشات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میں تو جیسے اندھوں' گونگوں اور بہروں سے مغزماری کررہا تھا۔

جوگیندر سے گفتگو کرنے کے بعد انگریز کی ساری اسکیم میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے جو کچھ رام مورتی کے یہاں سنا تھا' اس کے بعد ہی اس نے وہاں ٹھہر کر اپنی قسم پوری کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے رائے بہادر وشنو کمار کو بتایا تھا کہ قریبی گاؤں میں پانچ مسلمانوں کو قتل کرکے ان کی قمیصیں ملتان بھجوادی گئی ہیں' اسی کے ساتھ ملتان کے ایک قدیم مندر کو نذر آتش کرنے کے انتظامات کردیے گئے ہیں۔ پھر کسی شخص نے آکر وشنو کو اطلاع دی تھی جس کے بعد وشنو کچھ دیر کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے واپس آکر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو سرگوشی میں کچھ بتایا تھا اور پھر ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کو اندر طلب کیا گیا تھا جو وشنو سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ گنگا پرشاد سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور وشنو ہمارے ہی متعلق گفتگو کرتے رہے تھے۔ گنگا پرشاد کو یہ فرض سونپا گیا تھا کہ وہ اسکول کے طلبہ کے ذریعے یہ معلوم کرے کہ ہم لوگ کہاں مقیم ہیں۔ گنگا پرشاد پرجوش انداز میں ان دونوں کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ پھر اچانک ہی وشنو اس پر گرم ہوگیا۔ اس نے گنگا پرشاد کو بتایا کہ وہ نہ صرف حکومت کو دھوکا دے رہا ہے بلکہ اپنے ہم مذہبوں سے بھی غداری کررہا ہے کیوں کہ یوپی سے آنے والے اسی کے گھر میں پناہ گزین ہیں۔ گنگا پرشاد نے اس کی تردید کی تو اس شخص کو پیش کیا گیا جس نے مخبری کی تھی۔ پھر چند منٹ بعد ہی گنگا پرشاد کو وہاں سے گرفتار کرکے لے جایا گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پولیس کو حکم دیا تھا کہ گنگا پرشاد کی موجودگی ہی میں اس کے گھر پر چھاپا مارا جائے اور یوپی سے پنجاب آنے والوں کو گرفتار کرلیا جائے۔ پھر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنے ساتھ موجود ایک فوجی افسر کو ہدایت کی کہ وہ بھی جائے اور ہیڈ ماسٹر کے کوارٹر کا محاصرہ کرلے تاکہ ملزمان فرار نہ ہوسکیں۔

جوگیندر جانتا تھا کہ گنگا پرشاد کے کوارٹر میں حیدر علی اور سیتا موجود ہیں۔ مگر اس وقت وہ ایسی جگہ چھپا ہوا تھا جہاں سے اس کا نکلنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنی بہن کے لیے پریشان تھا مگر اس نے یہی سوچا کہ اسے کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ آزاد رہا تو سیتا کی رہائی کے لیے کوئی قدم اٹھا سکتا ہے۔ کوشش کرسکتا ہے' اگر گرفتار ہوگیا تو کچھ بھی نہ کرسکے گا۔ وہ اسی لیے وہیں چھپا رہا۔ اسے وہاں سے نکلنے کا موقع نہیں مل سکا اور جب اسے یہ موقع ملا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اطلاع دی گئی کہ گنگا پرشاد کے گھر سے کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آسکی۔ مجسٹریٹ اپنے سر کے بال نوچتا رہا اور گالیاں بکتا رہا۔ جوگیندر کو سیتا اور حیدر علی کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو اس نے ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لیا۔ ملتان میں ہندو مسلم فسادات کے لیے

تمام انتظامات مکمل ہوگئے تھے۔ انسانی خون بہہ چکا تھا۔ پانچ مسلمان دیہی باشندے مارے جاچکے تھے اس کے بعد جوگیندر نے اپنی قسم پوری کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ بھیانک چیخ جو ہم نے درخت پر بیٹھے ہوئے سنی تھی رام مورتی کی آخری چیخ تھی۔ جوگیندر نے اسے بیدار کرکے گولی ماری تھی۔

پھر ہم وہاں سے چل دیے تھے اور سیتا کو لے کر ستیش کے دوست کے یہاں جاکر پناہ لی تھی۔ اسی کے بعد ایک مرتبہ پھر مسلمان زمینداروں کو معقولیت پسندی اور عقل و دانش کا راستہ دکھانے میں ناکام ہوکر مایوس و دل گرفتہ واپس آئے تھے۔ انگریز ہمیں شکست دے چکا تھا۔

اس رات ہم پر ایک اور حقیقت بھی منکشف ہوئی تھی۔ ملتان میں فضا جتنی کشیدہ تھی کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی مگر انگریز فوج اور پولیس کہیں بھی گشت پر نظر نہیں آئی حالانکہ گزشتہ شب ہی کئی سرکاری عمارتوں کو آگ لگادی گئی تھی۔ دن میں بھی یہ عمل دہرایا گیا تھا۔ یہ ایسے حالات تھے جن میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو حرکت میں ہونا چاہیے تھا مگر یوں لگتا تھا کہ حکومت کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

صبح ستیش کا دوست غلام نبی خبر لایا کہ ملتان سے گزرنے والی ایک ٹرین ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے دیر تک روکی گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، فوج اور پولیس کے دستوں کے ساتھ ملتان سے نکل گیا۔

تمام رات جلتے ہوئے مندر سے آگ کے شعلے بلند ہوتے رہے۔ تمام شب ملتان اور اس کے گرد و گرد آبادیوں سے مسلمانوں کے نعروں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ صبح یہ خبر عام ہوچکی تھی کہ فوج اور پولیس ملتان سے غائب ہوچکی ہے۔

اور پھر مندر سے بھڑکتے شعلے ملتان کے لیے چتا میں تبدیل ہوگئے۔ نعروں کی آوازیں، چیخوں، کراہوں، بین اور نوحوں میں تبدیل ہوگئیں۔ اگلے دو روز تک ملتان میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جاتی رہی۔ ہندوستان کی سرزمین پر یہ پہلا بدترین ہندو مسلم فساد تھا۔

پھر یوں ہوا کہ انگریز کی قانون پسندی بیدار ہوگئی۔ وہی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جو ملتان کو جہنم بناکر رات کے اندھیرے میں فوج اور پولیس کو لے کر فرار ہوگیا تھا۔ ایک سو پچاس انگریز فوجیوں کا ایک دستہ لے کر ملتان میں آدھمکا۔ متحارب ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشین گن سے زبردست فائرنگ کرائی گئی۔ یہ فائرنگ اتنی شدید تھی کہ چند منٹوں میں کئی سو افراد ہلاک اور اس سے دگنی تعداد میں زخمی ہوگئے۔ ان متحارب گروہوں کو چاروں طرف سے گھیر کر مارا گیا تھا۔ فوجیوں اور پولیس والوں کو حکم تھا، وہ گولی اس طرح چلائیں کہ کم سے کم گولیاں ضائع ہوں اور زیادہ سے زیادہ انسان شکار کیے جائیں۔

ہم بھی یہ وحشیانہ کھیل دیکھ رہے تھے۔ اس وقت ہم اس میدان جنگ سے تھوڑے ہی فاصلے پر محفوظ مقام پر تھے۔ لوگ جان بچانے کے لیے دیوانہ وار چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ انگریز فوجی اور پولیس والے ان بھاگتے ہوئے لوگوں کا تعاقب کررہے تھے بھاگنے والوں کو پناہ دینے کے لیے گھروں کے دروازے کھل رہے تھے۔ ہم نے ایک سرکاری دفتر کے برآمدے میں پناہ لے لی تھی کہ چند افراد بھاگتے ہوئے اس دفتر کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور وہ شکاری کتوں کے مانند اپنے شکار کے تعاقب میں تھے۔ بخت خاں ان میں سے ایک پر عقاب کی طرح جھپٹا۔ دوسرے شکاری کتے پر میں نے زقند لگائی، تیسرے کی رائفل پر حیدر علی نے ہاتھ ڈالا اور چوتھے پر نیپو نے جست بھری۔ ہم نے انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر گھیر کر ہلاک کردیا اور ان کی لاشیں ایسی جگہ پھینک دیں جہاں آسانی سے ان پر کسی کی نظر نہ پڑسکے۔ ان بدبخت قاتلوں کو جہنم کی طرف دھکیلنے میں پہلے سے طے شدہ کسی منصوبے کا دخل نہیں تھا۔ سب کچھ بس اچانک ہی ہوگیا تھا۔ شاید اس وقت ہم سبھی ایک ہی انداز میں سوچ رہے تھے ہماری برین ویوز مل گئی تھیں۔ پہل بخت خاں نے کی تھی اور پھر ہم سب ایک دم حرکت میں آگئے تھے۔ ہم سبھی تربیت یافتہ تھے۔ ہمارے لیے ان شکاری کتوں کو ٹھکانے لگانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ جوگیندر اس وقت ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ ایسے مواقع پر ہم اسے اپنے ساتھ رکھنے سے گریز کرتے تھے کیوں کہ اس نے چھاپا مار جنگ کی تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ اسے ہم ستیش کے دوست غلام نبی کے گھر سیتا کے پاس چھوڑ آئے تھے۔ ہم چاروں ساتھی محض تماشائی نہیں تھے۔ اپنی جانیں خطرے میں ڈالنے کی وجہ یہ تھی کہ ممکن ہے ہم کسی بھی مظلوم کے کام آسکیں۔

ملتان میں ہونے والے اس ہندو مسلم فساد نے اس خطے میں فسادات کی ابتدا کردی۔ یہ آگ پنجاب سے سندھ کی طرف بڑی تیزی سے بڑھی اور پھر اس نے پورے سندھ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کراچی سے حیدرآباد اور پھر

میرپور خاص تک انگریز وحشت و بربریت کا تماشا دکھانے لگا۔ مجاہد اوّل کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ تقریباً سارا ہی ہندوستان انگریز کی سازشوں کا شکار ہونے لگا۔ اس کا نقطہ آغاز ملتان ہی تھا۔ یہاں اپنے کامیاب تجربے کے بعد انگریز نے خطہ سندھ کو بھی نہیں بخشا۔ مگر اس وقت ہمیں اس کی سنگینی کا اتنا بھرپور احساس نہیں ہوا جتنا بعد میں ہوا۔ ملتان میں ہونے والے ان فسادات نے ہندو مسلم اتحاد کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ اس کی گونج لیجسلیٹو کے اگلے اجلاس میں بھی سنائی دی جہاں بعض ہندو اراکین نے کھل کر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا۔ انہوں نے تحریک خلافت اور مسلم لیگ کو بہ طور خاص اپنے تعصب کا نشانہ بنایا۔

میرا خیال ہے کہ یہ واقعہ جلیانوالہ باغ سے بھی زیادہ شرم ناک تھا جو ملتان میں پیش آیا مگر اس سے شرم ناک بات شاید یہ ہے کہ ہماری تاریخ کی کتابوں میں جو ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں، یہ واقعہ اوّل تو موجود ہی نہیں اور اگر کہیں اس کا ذکر ہوتا ہے تو نہایت سرسری انداز میں۔

ادھر ملتان میں تو یہ ہوا ادھر جنوبی ہند سے بھی تشویش ناک خبریں ملنے لگیں۔ وہاں ہنگاموں کا مرکز ملاپورم تھا جہاں تقریباً ڈھائی ہزار مسلمان گرفتار ہوئے اور وہ واقعہ پیش آیا جو انگریزوں کے شرم ناک عہد حکومت کا انتہائی بھیانک رخ ہے۔ ان گرفتار شدگان میں ہمارے کئی تنظیمی ساتھی بھی تھے جو مجاہد اوّل کے حکم پر جنوبی ہند گئے تھے مگر ان باتوں کا علم مجھے بہت بعد میں ہوا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب دہلی میں مجاہد اوّل نے مجھ سے میرے ماموں زاد بھائی رحمت علی کی تعزیت کی تھی۔ اسی وقت مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا تھا کہ بھائی رحمت علی، مجاہد اوّل کے حکم پر کہاں گئے تھے! وہ ملاپورم کے معرکے ہی میں شہید ہوئے تھے۔

اس واقعے کی تفصیل یہ تھی کہ ملاپورم سے ایک سو گرفتار شدگان کو پدانور لے جانا تھا۔ ٹرین میں ان کے لیے کسی بوگی کا انتظام نہ ہوسکا تو ریلوے کے انگریز حکام نے مال گاڑی کا ایک ڈبا فراہم کردیا۔ یہ ڈبا دس فٹ چوڑا اور بارہ فٹ لمبا تھا۔ اس کی اونچائی صرف چھ فٹ تھی۔ اس مختصر سے ڈبے میں ایک سو قیدیوں کو اس طرح ٹھونسا گیا جیسے بوری میں اناج بھرتے ہیں۔ وہ گاڑی جس میں ڈبا لگایا گیا، شام سوا سات بجے ملاپورم سے روانہ ہوئی۔ مختصر سے اس ڈبے میں ان بدقسمتوں کے لیے سانس لینا دشوار ہوگیا۔ حبس اتنا شدید تھا کہ ان میں سے کئی بے ہوش ہوگئے۔ جو ہوش میں تھے چیختے رہے۔ ساڑھے دس بجے جب یہ ٹرین اولاوک کوٹ کے اسٹیشن پر رکی تو قیدیوں نے شور مچایا اور ڈبے کے دروازے کو پیٹنے لگے۔ دروازہ پیٹنے والے وہ لوگ تھے جو دروازے کے قریب تھے۔ وہ سبھی قیدی پانی کے لیے شور مچارہے تھے، ہوا کے لیے چیخ رہے تھے مگر کرنل صفری پر خدا کی لعنت ہو کہ جو ان قیدیوں کو لے جارہا تھا، صرف یہی جواب دیا کہ پانی نہیں مل سکتا۔ ٹرین پھر چل پڑی۔ رات کو ساڑھے بارہ بجے جب یہ ٹرین پدانور پہنچی تو زندہ افراد بے ہوش تھے۔ چھپن افراد مرچکے تھے۔ انہی میں بھائی رحمت علی بھی تھے۔ وہ بھائی رحمت علی ہی تھے جن کے توسط سے میں زیر زمین خفیہ تنظیم وطن پرست کا رکن بنا تھا۔ اللہ ان پر اپنی رحمت کرے۔ (آمین)

میرے نزدیک وہ واقعہ بلیک ہول سے زیادہ ہیبت ناک تھا جس میں بھائی رحمت علی کی شہادت ہوئی تھی۔ ان سو افراد میں صرف دو ہندو تھے جو ہلاک ہوئے۔

لیجسلیٹو میں جب مسلمان ممبروں نے یہ واقعہ پیش کیا تو ان غیر سرکاری اراکین نے جو ایک معاہدے کے تحت غیر سرکاری مسلم اراکین کے ساتھ ووٹ دیا کرتے تھے، اس معاملے میں مسلم اراکین کا ساتھ نہیں دیا۔ خود خان بہادر حمید اللہ اس روز ایوان میں حاضر نہ ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوری ہوتی گئی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد جسے انگریز اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا۔

کبھی کبھی قدرت بھی انسان سے اس کے ظلم کا کیسا بدلہ لیتی ہے۔ ایسا ہی انتقام قدرت نے انگریزوں سے بھی لیا۔ ٹرین میں مسلمانوں کی ہلاکت کے اس واقعے کے کچھ ہی عرصے بعد کئی انگریز فوجی بھی ایسے ہی واقعے سے دوچار ہوئے۔ کراچی سے انگریز فوجی دہلی جارہے تھے کہ راستے میں ٹرین کے پنکھے خراب ہوگئے۔ حبس اور گرمی سے باون انگریز فوجی ہلاک ہوگئے۔ قدرت نے انصاف کردیا مگر انسان کا انصاف؟ اس کی مثال ملتان میں سیکڑوں افراد کی اندوہ ناک ہلاکت ہے۔ انگریز نے اہل ملتان کو ہلاک کرنے والے اپنے ہم وطن فوجی افسروں کو تحفظ دیا لیکن انگریز فوجیوں کی ہلاکت پر اتنا شور ہوا کہ سیکریٹری آف اسٹیٹس کو مستعفی ہونا پڑا۔ یہ وہی چار انگریز فوجی تھے جو ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

بہرحال انگریزوں کے مظالم اور شقی القلبی کے مظاہرے دیکھنے کے بعد ہم ملتان سے فرار ہونے والے تھے کہ ہوشو شیدی کے ذریعے ہمیں مجاہد اوّل کا پیغام ملا۔ بخت خان کو اور مجھے ملتان سے کراچی پہنچنے کا حکم ملا تھا۔ جوگیندر اور سیتا کے بارے میں بھی یہی ہدایت تھی۔ حیدر علی اور نیپو

کو ملتان سے فی الحال اپنے اپنے شہروں تک پہنچنے کی اجازت مل گئی تھی، مگر وہ دونوں ہی ہم سے بچھڑ جانے پر ملول تھے۔ پیغام کے مطابق مجاہد اوّل بنگال سے سندھ پہنچ رہا تھا۔ اسے ہم سے کراچی میں ملنا تھا۔

جب ہم ملتان سے فرار ہوئے تو ہمارے ساتھ ستیش بھی تھا۔ ملتان میں اب اس کا رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

ہاں میں ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ ملتان میں فائرنگ سے ہلاک ہونے والے جن لوگوں کو شناخت کیا گیا تھا، ان میں ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد بھی تھا۔ انگریزوں نے اسے عدالت میں پیش کرنے کے جھنجھٹ سے بچنے کے لیے گولی ماردی ہوگی۔ جو سرکاری بیان جاری ہوا اس میں کہا گیا کہ ہنگاموں کے دوران میں جو چار فوجی اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئے انہیں بلوائیوں نے ماردیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوائی آمادہ بغاوت تھے۔ انتظامیہ کے لیے اسی سبب ضروری کارروائی ناگزیر ہوگئی تاکہ شہریوں کے جان ومال کا تحفظ کیا جاسکے۔

ملتان میں جو کچھ ہوا اس پر پورے ہندوستان میں ہاہاکار مچی۔ ان دنوں کیوں کہ پریس پر ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ ایسے افراد کا جو انگریز کی ہدایت پر آمنا صدقنا کہا کرتے تھے لہٰذا اس واقعے کو صحیح سیاق وسباق کے ساتھ اخبارات میں جگہ نہیں ملی۔ واقعات کو غلط رنگ دیا گیا۔ کہا گیا کہ ملتان میں کئی مندروں کو نذرِ آتش کردیا گیا، کئی ہندوؤں کو مار دیا گیا اور کئی کو زبردستی مسلمان بنالیا گیا، مگر کسی نے یہ نہ پوچھا کہ جن دنوں میں یہ واقعات ہوئے انگریز انتظامیہ کہاں سوئی ہوئی تھی؟ انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یہ جانتے ہوئے بھی کہ حالات نازک ہیں، فوج اور پولیس سمیت کیوں ملتان سے چلا گیا تھا؟ حقیقت صرف یہ تھی کہ ان دنوں میں صرف ایک پرانا مندر جلایا گیا تھا اور یہ مندر وہی تھا جس میں خود انگریز نے آگ لگوائی تھی۔ ملتان میں کسی بھی ہندو کو مسلمان نہیں بنایا گیا تھا اور اگر ایسا تھا بھی تو انگریز فوج کی وحشیانہ کارروائی کے بعد انہیں پھر اپنا دھرم اختیار کرنے سے کون روک سکتا تھا؟ مگر یہ وہ سوالات تھے جو مسلمانوں کی زبان پر تھے، ان باتوں کو اخبارات میں جگہ نہیں ملتی تھی۔ تمام ہندو پریس اور انگریزوں کے پروردہ اخبارات بس ایک ہی راگ الاپ رہے تھے کہ ملتان کے مسلمانوں نے ہندوؤں پر بڑا ظلم کیا ہے، تحریک خلافت کے زیرِ اثر ہندوؤں اور انگریزوں کے خلاف مسلمانوں نے اعلان جہاد کردیا ہے۔

ستیش کو میں نے بھائی عطااللہ خاں کے نام ایک خط دے کر علی گڑھ بھیج دیا تھا کہ ستیش کی ہر ممکن مدد کریں۔ اس کے سوا میں ستیش کے لیے اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

○☆○

کراچی پہنچ کر ہم نے اپنے ایک تنظیمی ساتھی کے بڑے سے گھر میں قیام کیا۔ اس گھر کی اونچی چھتیں کھپریلوں کی تھیں۔ مردانہ حصہ قطعی الگ تھا۔ اس گھرانے کی خواتین پردہ کرتی تھیں۔ یہ گھر سولجر بازار میں تھا۔ مجاہد اوّل کی طرف سے ہمیں یہیں قیام کا حکم ملا تھا۔ گھر ہی کی حدود میں دو بڑے بڑے لان تھے جن کے کنارے کنارے اونچے درخت لگے ہوئے تھے۔ سب سے عمدہ بات یہ تھی کہ اس بڑے گھر میں آمدورفت کے لیے بھی دو بڑے پھاٹک تھے، یعنی فرار کی راہ موجود تھی۔ گھر کے کمرے اتنے بڑے بڑے تھے کہ بہ یک وقت ایک کمرے میں دس پندرہ آدمی تو بستر بچھا کر آرام سے سوسکتے تھے۔ کچھ کمرے نسبتاً چھوٹے بھی تھے۔ گھر کے مردانہ اور زنانہ حصے کے درمیان جو دروازے تھے اگر انہیں بند کردیا جاتا تو مردانہ حصہ بالکل الگ ہوجاتا تھا۔ یہاں آکر مجھے سکون سا محسوس ہوا۔ ملتان کی نسبت یہاں کا موسم بھی سمندر سے قربت کے سبب معتدل تھا۔

گھر میں زیادہ افراد بھی نہیں تھے۔ ایک بڑے میاں لان میں چارپائی بچھائے درخت کے نیچے حقہ گڑگڑا رہے تھے اور اونگھا کرتے تھے۔ ان کے قریب ایک کرسی پڑی رہتی تھی کہ کوئی آجائے تو اس کرسی پر بیٹھ جائے، مگر جب سے میں یہاں آیا تھا کسی کو اس کرسی پر بیٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ جس چارپائی پر بڑے میاں لیٹتے بیٹھتے رہتے تھے اس پر کچھ بچھا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی میں نے بڑے میاں کو کلمہ شہادت کی انگلی سے ہوا میں کچھ لکھتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر جھریوں کا جال تھا۔ رنگ گورا اور قد لمبا تھا۔ کلین شیو تھے، سر پر انگریزی بال تھے۔ اس زمانے میں انگریزی بال کٹوانا مسلمان گھرانوں میں عموماً معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اپنی وضع قطع سے بڑے میاں خاصے ماڈرن لگتے تھے، اس کے علاوہ پڑھے لکھے بھی لگتے تھے۔ اپنی گردن وہ بالکل کسی گدھ کی طرح شانوں سے باہر نکالنے اور پھر دوبارہ شانوں کے درمیان غائب کرنے میں عجب مہارت رکھتے تھے۔ کبھی کبھی تو ان کی طرف دیکھ کر مجھے یوں لگتا جیسے ان کا سر شانوں پر دھرا ہو۔ بہرحال بڑے میاں عجیب سی پُراسرار شخصیت تھے۔ میری نظر کبھی ان کی طرف اُٹھ جاتی اور نظریں مل جاتیں تو ان کی باچھیں کھچ کر دونوں کانوں تک پہنچنے لگتیں۔ ہمہ وقت ان

کے گرد میں نے کتابیں دیکھیں، موٹی موٹی کتابیں۔ اکثر وہ مطالعے میں غرق رہتے تھے اور یہی ان سے میری دلچسپی کا سبب تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ کرسی جو خالی پڑی رہتی ہے، میں اس پر جاکے بیٹھ جایا کروں اور اس بہانے دیکھ تو لوں قریب جاکر کہ بڑے میاں آخر کیا پڑھتے رہتے ہیں، مگر بخت خاں نے میرا ارادہ بھانپ لیا۔ اس نے مجھے کام سے کام رکھنے کی تاکید کی۔ اسی کے ساتھ بخت خاں نے یہ بھی بتایا کہ وہ بڑے میاں ہمارے میزبان تنظیمی ساتھی کے والد بزرگوار ہیں۔ ہم پر بھی ان کا ادب لازم ہے وغیرہ۔

ہمارے میزبان تنظیمی ساتھی نے اپنا نام صلاح الدین ایوبی بتایا تھا۔ ہم اسے صرف ایوبی کہتے تھے اور یہ اس کا تنظیمی نام ہی لگتا تھا۔ اصل نام میں نے پوچھا نہ بخت خاں نے۔ رہے جوگیندر اور سیتا تو وہ دونوں ہی بہت دل گرفتہ وافسردہ تھے اور اس کا سبب ملتان کی مہم میں ناکامی تھی۔ ناکامی کا اثر مجھ پر اور بخت خاں پر بھی تھا مگر ہم نے اسے دانستہ اپنے ذہنوں سے جھٹک دیا تھا۔ بخت خاں کا کہنا یہ تھا کہ اگر آدمی ماضی ہی کو روتا رہے تو مستقبل کے لیے کچھ نہیں کرسکتا اور میں بخت خاں کے اس خیال سے متفق تھا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ ہمیں جو کام سونپا گیا تھا ہم اس میں ناکام رہے تھے۔

پنجاب کے بعد اب ہم وادی مہران میں تھے۔ ہمارے لیے ہدایات نہیں تھیں، سوائے اس پیغام کے کہ ہم لوگ بس گھر تک محدود رہیں۔ یہ پیغام ہمیں ایوبی کی معرفت ملا تھا۔ میں نے اس عرصے میں ایک کام کیا۔ ملتان میں پیش آنے والے واقعات کو میں نے قلم بند کرلیا اور ایک ایک تفصیل اس رپورٹ میں لکھی۔ تین روز کے بعد مجاہد اوّل رات کے وقت اپنی مخصوص ہیئت میں ہمارے سامنے موجود تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ جوگیندر اور سیتا کے سامنے آیا تھا۔

اس ملاقات میں میرے لیے پہلی خوش خبری یہ تھی کہ مجاہد اوّل نے سیتا اور جوگیندر کو تنظیم کی رکنیت دے دی تھی۔ سیتا سے وفاداری کا عہد قرآن پر ہاتھ رکھوا کر لیا گیا کیوں کہ وہ مسلمان ہوچکی تھی۔ جوگیندر نے انسان کی قسم کھائی تھی۔ اب میں سمجھ گیا تھا کہ مجاہد اوّل نے ان دونوں کو کراچی کیوں بلوایا تھا۔ پھر مجاہد اوّل نے ایک اور انکشاف کیا "جوگیندر! تمہارے چاچی موہن لال نے بھی انسان ہی کی قسم کھائی تھی۔ تمہیں یہ جان کر یقیناً خوشی ہوگی کہ تمہارے چاچی بھی تنظیم میں شمولیت اختیار کرچکے ہیں، منہ لگتے ہی سے آرہا ہوں۔" پھر مجاہد اوّل نے ملتان مہم کی رپورٹ طلب کی۔

بخت خاں کیوں کہ ملتان مہم کا نگراں تھا اس لیے مختصراً اسی نے ملتان میں پیش آنے والے واقعات بیان کیے۔ بخت خاں کے خاموش ہوتے ہی میں نے اپنی تحریری رپورٹ مجاہد اوّل کو پیش کردی۔ اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھ سے کتنی بڑی حماقت سرزد ہورہی ہے۔

"شاہین" مجاہد اوّل نے مجھے مخاطب کیا "تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے زندگی کی جو راہ اپنائی ہے' وہ ایسی ہے جس میں ہر اگلا لمحہ موت کی نوید لے کر آسکتا ہے۔ اس زندگی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ نہ وقت کا بھروسا کرو' نہ کسی کی ذات پر! حتیٰ کہ اپنی ذات پر بھی نہیں۔ ٹھیک ہے تم نے یہ رپورٹ نیک نیتی کے ساتھ تنظیم کے لیے لکھی ہے مگر اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ تمہیں اپنے اوپر ضرورت سے زیادہ ہی اعتماد ہے۔ تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ اس مکان میں تم بالکل محفوظ ہو۔ پولیس یا سرکاری کارندے یہاں تک نہیں پہنچ سکتے' مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کا مظاہرہ تم ملتان میں ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کی گرفتاری' اس کے گھر پر چھاپے اور سیٹھ کے وہاں سے فرار ہونے کی شکل میں دیکھ سکتے ہو۔ کبھی اس بات پر یقین نہ کرو کہ تم محفوظ ہو۔ سُن لو کہ ہندوستان میں تمہارے لیے کوئی جائے اماں نہیں۔ کسی بھی لمحے پولیس یا سی آئی ڈی تم تک پہنچ سکتی ہے۔ لاہور میں تم نے یہ تجربہ بھی کرلیا ہے' بتاؤ ایسا ہے یا نہیں؟"

"جی ہاں" میں نے کہا "ایسا ہی ہے۔"

"تو بتاؤ اگر پولیس یہاں پہنچ جائے تو کیا یہ رپورٹ تمہارے خلاف استعمال نہیں کرسکتی؟ کیا تم ایسی صورت میں خود اپنے خلاف پولیس کو تمام ثبوت مہیا کرنے کا وسیلہ نہیں بن جاؤ گے؟" مجاہد اوّل چند لمحے خاموش ہوگیا۔ اس نے باری باری ہم سب کو گھورا۔ کمرے میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا سناٹا جس میں ہم اپنے دلوں کی دھڑکنیں صاف سُن سکتے تھے "بولو شاہین' جواب دو!"

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ میرے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا' سوائے اس کے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرلوں "آپ درست کہہ رہے ہیں۔"

"اسے کہتے ہیں حالات کی طرف سے چشم پوشی' خوش فہمی اور غفلت!" مجاہد اوّل کی آواز سے غصے کا اظہار ہورہا تھا۔ "اس ذرا سی غفلت سے تم سب کسی مصیبت میں گرفتار ہوسکتے تھے' تنظیم کے تاروپود بکھر سکتے تھے" مجاہد اوّل کی شعلہ بار آنکھیں نقاب کے اندر سے انگارے برسا رہی تھیں "بتاؤ' کیا میں نے جھوٹ کہا ہے؟"

"جی نہیں" میری آواز بہت دھیمی تھی۔ مجاہد اوّل نے جو کچھ کہا تھا' ٹھیک کہا تھا۔ مجھے واقعی یقین نہیں تھا کہ ہم وہاں محفوظ تھے۔ بڑے میاں کا کردار اس احساس کا سبب تھا۔

"بہرحال" مجاہد اوّل نے رپورٹ کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا "تم نے اس رپورٹ میں اپنے تمام ساتھیوں اور مددگاروں کے نام استعمال کیے ہیں۔ اس طرح تم نے سب لوگوں کے ساتھ دشمنی کی ہے اور سب سے بڑھ کر اپنی تنظیم کے ساتھ جس کے لیے تم نے اپنی جان تک داؤ پر لگادی ہے۔ یہ سب کچھ تم نے نادانستگی میں کیا ہے اس کے باوجود تم ناقابلِ معافی ہو کہ عملاً تم ہی اس مہم میں اپنے دستے کے سربراہ تھے" پھر وہ بخت خاں کی طرف مڑا "کیا یہ بات درست نہیں ہے بخت خاں؟ مہم کا نگراں ہونے کے باوجود کیا شاہین ہی نے تمہارے دستے کی کمان نہیں کی؟"

"صلاحیت تو اپنے آپ کو منوا ہی لیتی ہے اے مجاہد اوّل" بخت خاں نے اپنی روایتی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا "میرے نزدیک شاہین کا قصور ایسا نہیں کہ اسے معاف نہ کیا جاسکے۔ گستاخی کی معافی چاہتا ہوں' کسی مہم کی رپورٹ لکھنا کبھی کبھار ضروری بھی ہوجاتا ہے اے مجاہد اوّل! اور آپ مجھ سے بہتر یہ بات جانتے ہیں۔"

"میں کیا جانتا ہوں اور کیا نہیں' اس سے قطع نظر تمہاری بات ایک حد تک درست ہے بخت خاں! ہماری جیسی تنظیموں کے اراکین کو کبھی کبھار اس قسم کی رپورٹیں لکھنی پڑتی ہیں مگر انتہائی مجبوری کے عالم میں اور اس وقت جب کہ انہیں یہ رپورٹیں کہیں دور اور فوراً ہی کسی کو بھیجنی ہوتی ہیں۔ رپورٹ لکھنے کے بعد وہ اسے اپنے پاس نہیں رکھتے' فوراً اسے روانہ کردیتے ہیں کیوں کہ ایسی تنظیمیں ایسے رابطے اختیار کرتی ہیں جو انتہائی محفوظ ہوتے ہیں۔ پھر ایسی رپورٹوں میں افراد اور مقامات کے نام بھی فرضی لکھے جاتے ہیں۔ تنظیم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کون سا سرفروش کس جگہ کام کررہا ہے اور اسے کیا فرائض سونپے گئے ہیں۔ اس کے ساتھیوں میں کون کون شامل ہیں۔"

پہلا حصہ اختتام کو پہنچا
اس سلسلے کے بقیہ واقعات دوسرے حصہ میں ملاحظہ کریں جو اس کے ساتھ ہی شائع کیا گیا ہے۔